

کوریا کہانی

حکیم محمد سعید

کوریا کہانی

شمالی کوریا کا روزنامچۂ سفر

حکیم محمد سعید

ہمدرد فاؤنڈیشن پریس

مصنف : حکیم محمد سعید

ناشر : ہمدرد فاؤنڈیشن پریس
ہمدرد سنٹر ، کراچی ۱۸

کمپوزنگ : محمد قمرالحق

طابع : ماس پرنٹرز ، کراچی

تاریخ اشاعت : ۱۹۸۳ء

پہلا ایڈیشن : دو ہزار

قیمت : چالیس رُپے

ترتیب

صفحہ | عنوان

صفحہ	عنوان
۲۰۹	کم ال سنگ یونی ورسٹی
۲۱۲	یونیسکو میں اظہار خیال
۲۱۷	نظامِ تعلیم اور میرا نقطہٗ نظر
۲۲۹	طبِ مشرقی اور طب مغربی کا سنگم
۲۳۳	پیپلز کلچر پیلیس
۲۳۴	چلڈرن پیلیس
۲۳۸	خصوصی پروگرام
۲۳۹	نیشنل لائبریری، پیونگ یانگ
۲۴۲	سفارت خانہٗ چین میں
۲۴۳	ناشتہ اور کھانا
۲۴۳	زیر زمین ریلویز
۲۴۷	جہانِ نو
۲۵۰	انقلاب کے لیے جدوجہد کا عجائب گھر
۲۵۴	وزیر صحت شمالی کوریا ـــ تبادلِ خیال
۲۵۹	تحائف کا لین دین
۲۵۹	عشائیہ
۲۶۲	سفارت پاکستان میں
۲۶۴	دو کوریا ـــ ایک تجزیہ
۲۶۸	رکم کی پیش رفت
۲۷۳	اولمپک کھیل
۲۷۵	جانشینی فرزند دل بند
۲۷۸	دل بدست اور . . . .
۲۸۰	کارکنوں کی صحت
۲۸۲	ہو پھٹتے ہی وہ بندرگاہ میں موجود تھے
۲۸۵	جیسے مجھے باپ نے سینے سے چمٹا لیا ہو
۲۸۸	باپ کی سی شفقت
۲۹۰	ہمیشہ روشن پہلو دیکھے
۲۹۲	تاثرات
۲۹۴	نظریہٗ تعلیم
۲۹۸	خواتین میدان عمل میں
۳۰۲	طب مشرقی
۳۰۳	نظامِ صحت
۳۰۸	اخلاقیات
۳۱۱	وزیر صحت سے دوسری ملاقات

حرفِ اوّل

مسعود احمد برکاتی

اپریل ۱۹۸۲ء میں جناب محترم حکیم محمد سعید صاحب بحیثیت مشیر صدر پاکستان برائے طب شمالی کوریا کے دس روزہ سرکاری دورے پر گئے۔ اس کے بعد وہاں سے چین ہوتے ہوئے کراچی واپس آگئے۔ حسب عادت یادداشتیں لکھ لائے تھے، جو روز نامچے کی شکل میں تھیں۔ حکیم صاحب کو یہ کمال حاصل ہے کہ واقعات و تاثرات روز کے روز قلم کی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ اور بعد میں نظرثانی کر لیتے ہیں۔ کچھ ناموں اور سنین کی تکمیل یا توثیق کرنی ہو تو وہ بھی بعد میں کرتے ہیں۔ کراچی آ کر حکیم صاحب اپنی ذمہ داریوں اور مصروفیتوں میں گم ہو گئے، لیکن روز نامچے کا مسودہ ٹائپ ہوتا رہا اور نظرثانی کا کام بھی جاری رہا۔

۲۹۔ اگست ۱۹۸۲ء کو حکیم صاحب کو لندن ہوتے ہوئے پیرس جانا تھا۔ اس سفر میں، میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ روانگی سے پہلے حکیم صاحب نے مسودے کے کچھ صفحات فائنل کر کے دے دیے کہ ان کی ٹائپنگ شروع کروا دیجیے۔ یہ ٹائپنگ نہیں گویا کمپوزنگ ہوگی اور انھی کا عکس لے کر فوٹو آفسٹ سے کتاب طبع کرائی جائے گی۔ باقی مسودے پر میں دورانِ سفر نظرثانی اور اضافہ کر کے مکمل کر دوں گا۔ چناں چہ ۱۱۔ ستمبر ۱۹۸۲ء کو جب حکیم صاحب پیرس سے امریکا کے لیے روانہ ہو رہے تھے اور میں عازم وطن ہو رہا تھا "کوریا کہانی" کا مکمل مسودہ حکیم صاحب نے میرے سپرد کر دیا اور میں اس کو کراچی لے آیا۔

سفر میں انسان کے ذہن پر اضطراری کیفیات طاری ہو ہی جاتی ہیں، جگہ بدلتی ہے، اوقات بدلتے ہیں بلکہ ایک براعظم سے دوسرے براعظم میں تو صبح و شام (ٹائم زون) بھی مختلف ہو جاتے ہیں۔ غذا میں فرق پڑتا ہے۔ موسم کا اختلاف اپنا اثر دکھاتا ہے، لیکن حکیم صاحب تو سفر میں بھی حضر کی طرح رہتے ہیں۔ وہی اطمینان وہی معمولات، وہی صبح و شام، وہی پابندی اوقات:

نہ چھوٹے ان سے لندن میں بھی آدابِ سحر خیزی

لندن ہو یا پیرس، چین ہو یا کوریا، حکیم صاحب کے انضباط و التزام میں فرق نہیں آتا۔ دراصل یہ کرشمہ ہے اور ثمرہ ہے انضباط ذہنی کا۔ ذہن منضبط ہو تو زندگی کے ہر کام میں نظم و ضبط ہوگا۔ اتنے متنوع کام، اتنے سارے کام، کام ہی کام، پھر ہر کام سلیقے سے۔ کراچی میں تو میں دیکھتا ہی تھا، لیکن یورپ کے سفر میں ساتھ رہ کر تو ہر لمحے مشاہدہ کیا کہ حکیم صاحب کو کام کے علاوہ کچھ اور کام ہی نہیں۔ رات کو کتنی ہی دیر میں سوئیں علی الصباح اپنی میز پر بیٹھے ہوں گے۔ ذرا سوچیے کہ سفر میں ایک دوسرے ملک کا سفر نامہ لکھنا کتنا مشکل اور نازک مرحلہ ہے۔ ایک طرف پیرس کے زمین و آسمان، در و دیوار، کوچہ و بازار، حالات و مسائل، افراد و اقدار دوسری طرف شمالی کوریا کی تگ وتاز، جہد حیات، تاریخ سازی اور سعی تعمیر۔ کہاں یہ ہوا، کہاں وہ فضا، لیکن پیرس کے ہوٹل کے ایک کمرے میں پوری یکسوئی سے ایک شخص کوریا کی فضا کو ذہن میں تازہ کر رہا ہے اور اپنے مطالعات و تاثرات کو پوری شدت سے الفاظ کا جامہ پہنا رہا ہے۔

"کوریا کہانی" شمالی کوریا کے دس دن کی ڈائری ہی نہیں ہے بلکہ اس ملک کی، اس کے عوام کے جذبے اور جدوجہد کی، اس کے رہنما کے عزم و اخلاص کی اور اس قوم کو درپیش مسائل و مشکلات کی کہانی ہے۔ پس منظر اور پیش منظر بھی اس میں ملے گا اور قومی و بین الاقوامی تناظر میں ایک قوم کی جہد للبقا کو سمجھنے کی کوشش بھی۔ حکیم صاحب کا اسلوب اس کتاب میں بھی بے ساختہ اور بے لاگ ہے۔ قاری کسی لمحے بھی اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا، جن باتوں سے وہ حکیم صاحب سے اپنے کو متفق نہیں پاتا ان میں بھی ان کی دردمندی کا ضرور قائل ہوتا ہے۔

اگر اس عرصے میں کئی کانفرنسیں اور بعض کتب مثلاً "اخلاقیات نبوی" اور "خودی" کی اشاعت کو اوّلیت نہ دینی پڑتی تو کوریا کہانی کئی مہینے پہلے آپ کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہوتی، تاہم حکیم صاحب کے دوسرے سفرناموں کی طرح اس کتاب کی شگفتگی، تازگی اور بصیرت بھی مستقل افادیت اور اہمیت کی حامل ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دعوت نامہ وزیر صحت شمالی کوریا

وزارتِ خارجہ حکومتِ پاکستان کی جانب سے ایک یادداشت ملی کہ شمالی کوریا کے جناب محترم سفیر کبیر ملاقات کے لیے وقت چاہتے ہیں۔ سفارتی آداب یہ ہیں کہ کسی ملک کا سفیر اپنی سرکاری حیثیت میں اگر کسی وزیر سے ملاقات کا خواہاں ہو تو وہ وزارتِ خارجہ پر اپنی خواہش کا اظہار کرتا ہے اور وزارت خارجہ وزیر کو ایک نوٹ بھجواتی ہے۔ وزیر وقت کا تعین کر کے وزارتِ خارجہ کو مطلع کرتا ہے اور اس طرح باہم ملاقات کا سامان ہوتا ہے۔

عالی مرتبت صدر گرامی قدر نے، کہ انسان شناس ہیں اور قدر دانِ علم و عالم، اِس حقیر فقیر سراپا تقصیر کو مرکزی وزیر (فیڈرل منسٹر) کا مقام دیا جس کے لیے میں ان کا زیر بار احسان ہوں اور ممنون بھی۔ اس سے زیادہ میں اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ وہ وزارت کے بارے میں میرے ذاتی تاثرات و احساسات کا بدرجۂ کمال احترام کرتے ہیں اور میری بے نیازی کے قدردان ہیں۔

پروفیسر فلپ حتّی دنیائے علم و تاریخ کی مشہور عالم شخصیت ہیں۔ مجھے ان سے تقرب کا شرف حاصل رہا ہے۔ میں بارہا پرنسٹن یونیورسٹی (امریکا) ان کے ہاں گیا ہوں۔ امریکا کی اس عظیم یونیورسٹی میں محترمی فلپ حتّی استاد کی حیثیت سے رہے ہیں۔ اپنی اہلیہ کے ایک حادثے میں انتقال کے بعد وہ خود ایسے علیل ہوئے کہ نشست و برخاست سے معذور۔ ان کی علالت کے دوران بھی میں دو بار امریکا ان کی عیادت کے لیے پرنسٹن گیا۔ ان کے داماد پروفیسر بیلی وائنڈر نیو یارک یونیورسٹی میں استاد ہیں۔ ان سے میری پرانی یاد اللہ ہے۔ جب میرا مرتبہ وزیرِ مرکزی (فیڈرل منسٹر) کے برابر ہوا تو اس موقع پر جو گزٹ پاکستان جاری ہوا وہ بڑا دلچسپ ہے:

No.133/5/81-Min. 1. -- The President has been pleased to raise the status and rank of Hakim Mohammed Said, Adviser to the President on Tibb, from Minister of State to that of a Federal Minister, with immediate effect.

سچ بات تو یہ ہے کہ میں نے اس گزٹ کے الفاظ پر خود غور نہیں کیا تھا - جب پروفیسر بیلی وائنڈر نے اس گزٹ کو پڑھا تو ان کی جانب سے مجھے جو خط ملا وہ بڑا ہی پُر لطف ہے - میں نے اس خط سے جو لطف و کیف اٹھایا بس میں ہی جانتا ہوں !

Thank you .... for your letter of June 7, 1981. I am delighted to see that the President has raised your "status and rank" to that of a Federal Minister. Your rank he has no doubt raised. I am not sure whether he can raise your status.

میں نے اس خط کو یہاں نہ صرف بیلی وائنڈر کے احسان کے اعتراف کے طور پر نقل کیا ہے بلکہ اس لیے بھی کہ میرے تمام دوست اور "کوریا کہانی" کے قارئین اس کے حظ و لطف سے محروم نہ رہیں ! اللہ تعالٰی کے فضل و کرم سے میرا حلقۂ دوستی دنیائے علم و حکمت ہے اور میرا دائرۂ الفت و مودت حلقۂ علما و فضلا ہے جن کی عظیم صحبتوں میں میں زانوئے ادب تہ کرتا ہوں - یہی صاحبانِ فکر و نظر ہیں کہ میری تحریرات کا مطالعہ کر کے میرے ذہنی و قلبی سکون کا سامان کرتے ہیں - میں نے اس دائرے میں رہنے کو ہمیشہ ترجیح دی ہے اور حتی الامکان اپنے منصبِ وزارت کو اس دائرۂ علم و حکمت سے پوشیدہ رکھا ہے -

اس موقع پر ایک اپنا ہی دلچسپ واقعہ یاد آ گیا - جامعۂ تکنیکیٔ استنبولؔ نے بموقع کنگرس عالمی علوم و فنون سائنس اسلامی (۱۹۸۱) مجھے مدعو کر کے از راہِ علم و عالم نوازی میری خدمات کا اعتراف کیا اور "طب ترکی" کے موضوع پر میرا خصوصی لیکچر کرا کے مجھے شرف و عز بخشا ، اور پھر ایک خصوصی کانووکیشن (جلسہ عطائے اسناد) میں مجھے سندِ امتیاز عطا فرما کر مجھے سجدۂ شکر ادا کرنے کی سعادت بخشی - اس اعزاز و اکرام سے مشرف ہو کر میں انقرہ گیا -

وہاں ٹرکش ہسٹاریکل سوسائٹی کا جشنِ تاسیس منایا جا رہا تھا۔ غازی مصطفےٰ کمال پاشا، اتاترک کے جشنِ صد سالہ کی یہ تقریب جزو تھی، اور اسے اہمیت اس لیے حاصل تھی کہ ٹرکش ہسٹاریکل سوسائٹی کی بِنا خود اتاترک نے ڈالی تھی، اور اس انداز سے یہ بنیاد رکھی تھی کہ اس سوسائٹی کو قومی زندگی میں مقام بلند حاصل ہو اور کوئی شخص اور کوئی حکومت اس کی اہمیت و ضرورت کو نظر انداز نہ کر سکے۔

اقوام و ملل کی زندگی میں تاریخ کو بدرجۂ کمال اہمیت حاصل ہے اور سلیم الفکر شخصیتیں اور صحیح العقل حکومتیں اور راست باز حکمراں تاریخ اور تحریر کو حیاتِ ملّی میں صحیح تر اور بلند تر مقام دیتے ہیں اور پوری دیانت و امانت کے ساتھ مورخین کا احترام کرتے ہیں اور ان کا اکرام قائم کرتے ہیں۔ فنِ تاریخ نویسی کو اہلِ اسلام نے اپنے ہر دور میں عبادت کا درجہ دیا ہے، اور اس میدان میں دنیا بھر کو رہنمائی دی ہے۔ بلاشبہ یہ ایک المیہ ہے کہ تاریخ کے میدان میں مسلمانوں کی کاوشیں پردۂ خفا میں چلی گئی ہیں اور پھر جب عالمِ اسلام نے عالمِ افلاسِ فکر میں خود کو اپنے ماضی سے غیر منسلک کیا تو خود اُن کی تاریخ مسخ ہوگئی اور میدانِ حکمت و علم میں ان کے ہر کارنامے پر زمانۂ رفتہ غفلت و جہل کی دبیز خاکی چادریں ڈالتا رہا۔ حتّٰی کہ ان کی تمام وہ علمی و فنّی کاوشیں کہ جن سے کبھی مشرق و مغرب دونوں بہ یک آن متحرک تھے، اور علم و حکمت کی وہ شمعیں کہ جن سے اقطارِ عالم روشن تھے اور منوّر، یہ سب خاک میں پنہاں ہوگئیں۔

زمانے کی دستبرد سے، آتش جہلا سے اور عیّارانِ ماضی کی تباہ کاریوں سے دورِ اسلام کی جو نورانیاں محفوظ رہ گئی ہیں وہ دنیا کے مختلف و متعدد کتب خانوں میں تیس لاکھ مخطوطات کی صورت میں کہیں محفوظ ہیں، کہیں جمع ہیں اور کہیں مدفون ہیں۔ اور آج کا مُرفہ الحال مسلمان اس کے لیے کسی طرح تیار نہیں نظر آتا کہ قدرت کی عطا کردہ فراوانیوں کا رُخ تاریخ کے تمام ٹوٹے ہوئے رشتوں کو جوڑنے پر موڑ دے اور اللہ تعالٰی کی فیاضیوں کا شکر اس انداز سے ادا کرے کہ مسلمان عذابِ جہل سے نجات

حاصل کر لیں ۔ایسے دور میں کہ علمائے مغرب ماضی کی آوازوں کے متلاشی ہیں کہ ان کو رکارڈ کر لیں اور تاریخ کے مٹے ہوئے ہر نقش کو روشن کر دیں علمائے اسلام اس کے لیے بھی تیار نہیں ہیں کہ اپنے ذخیرۂ علوم و فنون کا ایک جائزہ ہی لے لیں !

اتاترک ان شخصیات میں شمار ہوتے ہیں کہ جو اس صورتِ حال کو محسوس کرتے تھے ۔ان کا سوز دروں سر زمین ترکی پر مختلف شکلوں میں نمایاں ہوا ہے ۔ٹرکش ہسٹاریکل سوسائٹی بھی اس کا ایک مظہر ہے، اور بڑا حسین مظہر !

میں جب صبح پونے ۹ بجے اس سوسائٹی کے مرکز گیا اور اس کے محترم صدر اور نائب صدر سے ملنے ان کے دفتر گیا تو میرے دوست پروفیسر آئدین سائیلی صاحب نے میرا تعارف ان سے کرایا :
ہزایکسی لنسی حکیم محمد سعید .... صدر ٹرکش ہسٹاریکل سوسائٹی ایک صاحب علم و کمال شخصیت ۔ ہزایکسی لنسی کو خاطر میں نہ لانا ان کا مقام ۔ میں نے ان کی بے رخی کا ذرا بُرا نہ منایا ، بلکہ میرے دل میں ان کی عظمت قائم ہوگئی ۔اہل علم کا مقام ہزایکسی لنسی سے بلا شبہ بلند ہے ۔ یہ صبح کی بات ہے ۔دن کو میں نے ان کی خدمت میں اپنی اکثر تصانیف بھجوادیں جو میں اپنے ساتھ لایا تھا ۔ یہ ٹرکش ہسٹاریکل سوسائٹی کے لیے میرا ہدیۂ علمی تھا ۔ شام کو علم و فضل کے دریا کا رخ میری جانب ہوگیا ۔وہی صدر کہ صبح ہزایکسی لنسی حکیم سعید کی آمد سے ذرا متاثر نہ ہوئے تھے مصنف حکیم سعید سے پر جوش ملے اور یہ ان کا جذبۂ تحریم عالم تھا کہ وہ مجھے سربراہ ترکی جناب جنرل کنعان ایورن سے ملانے کے لیے اپنے ساتھ لے گئے !

میں نے ٹرکش ہسٹاریکل سوسائٹی کو تفصیل کے ساتھ دیکھا ہے ۔ کون سی سہولت ہے کہ جو اس سوسائٹی کو میسر نہیں ہے ! حکومتِ ترکی خلوص کی انتہاؤں کے ساتھ اس کے کاموں پر متوجہ ہے ۔اس سوسائٹی نے تاریخ کے تمام ٹوٹے ہوئے رشتوں کو جوڑنے کی سعئ مسلسل کی ہے اور اس کی مطبوعات کو قرار واقعی علمی مقام حاصل ہے ۔اس کے برعکس میں پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے حال زار پر غور کرتا ہوں کہ تاریخ کے میدان میں اس کی کسی پیش رفت کو

تعاون کی فضا میسر نہیں ہے -یہ یتیم و یسیر سوسائٹی اپنے وقیع کارناموں کے باوجود توجہ سے محروم ہے -

یہ بڑی الم‌ناک اور بڑی درد ناک حقیقت ہے کہ استقلالِ پاکستان پر ۳۵ سال کی طویل مدت گزر گئی ہے مگر آج تک تاریخِ پاکستان معرضِ تحریر میں نہیں آسکی ہے ، اور اس راہ میں ہر ممکن کوشش کو پاکستان میں بقراطیت (بیوروکریسی) نے ناکام بنا دیا ہے - سلوک ایسا ہے کہ جیسے "تاریخ پاکستان" لکھنا کوئی سنگین جرم ہے اور بد ترین گناہ - میں پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کا صدر ہوں اور میں اندرونی اور بیرونی حال سب جانتا ہوں کہ اس اہم منصوبے کو کن لوگوں نے کس انداز سے پامال کیا ہے - میں یہ خوب جانتا ہوں کہ اگر تاریخ پاکستان لکھنے کا کام آج نہ کیا گیا اور پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے اس منصوبے میں رخنہ ڈالا گیا تو پھر وہ لوگ باقی نہ رہیں گے کہ جو آج ہیں اور تاریخ پاکستان لکھنے کے اہل ہیں - میں اس بنا پر سخت بےچین ہوں اور اس منصوبے کو جامۂ عمل پہنا دینے کا خواہاں ہوں -

بات کہاں سے شروع ہوئی تھی اور کہاں جا پہنچی ! شمالی کوریا کے سفیر سے میری ملاقات نہ ہو سکی کہ وہاں میرے لیے ایسا کرنا ممکن نہ ہو سکا ، تو کراچی میں شمالی کوریا کے قونصل جنرل صاحب نے مجھ سے رابطہ قائم کیا - وزارت خارجہ کے کراچی دفتر کی معرفت ان سے ملاقات کا وقت طے ہو گیا اور وہ از راہ کرم میرے دفتر میں ملاقات کے لیے تشریف لے آئے -یہ ایک سفیر کی وزیر پر "کال" تھی !

جناب کانگ چانگ رایل سے مل کو خوشی ہوئی - خوش‌خلق ، سادہ مزاج اور نہایت ملنسار- کوریا کی زبان چینی زبان سے مختلف ہے ، مماثلت موجود ہے ، الفاظ مشترک محسوس نہیں ہوتے -
جناب قونصل جنرل صاحب نے زور دے کو کہا کہ کوریا کی زبان چینی سے قطعی مختلف ہے - میں نے محسوس کیا کہ جناب رایل صاحب شمالی کوریا اور چین کے باہمی تعلقات پر زور دینا نہیں چاہتے - انہیں جب یہ معلوم ہوا کہ میں چین تک گیا ہوں مگر کوریا جانے کا مجھے موقع نہیں ملا ہے تو انہوں نے مجھے دعوت دی کہ مجھے ان کا ملک ضرور دیکھنا چاہیے - ان کی اس دعوت میں بڑا خلوص

تھا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔

اس رسمی ملاقات کے بعد جناب کانگ چانگ سے بارہا ملاقاتیں رہیں، اور بالآخر ایک ملاقات میں طے پا گیا کہ اپریل ۱۹۸۲ء کے مہینے میں میں کوریا جانے کا وقت نکال سکوں گا۔ اپریل کی ۱۵ر کو شمالی کوریا کے صدر جناب کم ال سنگ کا ۷۰ واں یوم پیدائش بھی ہے جسے اس بار بڑی اہمیت کے ساتھ منانے کا فیصلہ ہوا ہے اور دنیا کے متعدد سربراہان مملکت کو دعوتِ شرکت دی گئی ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ پاکستان کے صدر مملکت کو بھی مدعو کیا گیا ہے۔ اندازہ یہ دیا گیا کہ اگر میں دس دن نکال لوں تو یہ عرصہ کوریا کے طبی و تعلیمی مطالعہ کے لیے کافی ہے۔ جناب قونصل جنرل نے مشورہ دیا کہ مناسب ہے کہ میں متوقع پاکستانی وفد کے ساتھ شریک نہ ہوں، کیونکہ اس کی مصروفیات دوسری ہوں گی اور طبی و تعلیمی نہ ہوں گی۔ میں نے یہ نکتہ گرہ میں باندھ لیا۔

یہ باتیں سال گزشتہ کی ہیں۔ بارے مجھے شمالی کوریا کے وزیر صحت ہز ایکسی لنسی ڈاکٹر پاک۔ میونگ بن کی جانب سے حکومتِ شمالی کوریا کا دعوت نامہ سرکاری طور پر مل گیا۔ میں اپنی گفت گو کا حوالہ سکوٹری وزارتِ خارجۂ پاکستان کو دے چکا تھا۔ وزارتِ خارجہ کی معرفت جب یہ دعوت نامہ مجھے ملا تو اسی کے ساتھ یہ نوٹ بھی آیا کہ وزارت خارجہ کو یہ قبول کو لینے میں کوئی اشکال نہیں ہے۔

پاکستان کے عالی مرتبت صدرِگرامی قدر کے مشیر اور وزیر کی حیثیت سے بیرون ملک سفر کے لیے صدر مملکت کی رسمی اجازت ضروری ہوتی ہے، اور اس اجازت میں کبھی کوئی امر مانع نہیں ہوتا۔ میں نے کوریا کی طرف سے دعوت قبول کرنے اور سفر کی اجازت کے لیے عالی مرتبت صدر مملکت کی خدمت میں "سمری" بھجوادی۔

صدر مملکت پاکستان کے غیر ملکی دوروں میں وہی لوگ شریک ہوتے ہیں کہ جن کی ضرورت خود صدر مملکت محسوس فرماتے ہیں۔ بایں ہمہ بعض لوگ اپنی خواہش کے اظہار پر نوازے بھی جاتے ہیں اور ایسا کرنا صحیح ہوتا ہے۔ گزشتہ تقریباً پانچ سال میں صدر مملکت درجنوں بار باہر تشریف لے گئے اور اگر میں خواہش

کرتا تو پھر شاید ان کے ساتھ جا سکتا تھا - مگر میں ایک بار بھی بار نہ بنا اور خود انہوں نے میری ضرورت کسی دورے میں محسوس نہیں فرمائی - ذاتی حیثیت سے ایک شکایت دل میں رہی ہے کہ جب وہ مسلمانان عالم کے نمائندے کی حیثیت سے بمناسبت آغازِ ۱۵ ویں صدی ہجرہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب کے لیے تشریف لے گئے تھے تو ان کو میری ضرورت محسوس کر لینی چاہیے تھی، اس لیے کہ اختتام ۱۴ ویں صدی اور آغاز ۱۵ ویں صدی ہجری تحریک کا آغاز میں نے فروری ۱۹۷۲ ء میں کیا تھا، جس نے بالآخر عالمی حیثیت اختیار کر لی - یہ بات اب سب ہی تسلیم کرتے ہیں اور صدر مملکت کو خود میں نے شرح و بسط کے ساتھ بتا دی تھی - مگر اس وفد میں شریک وہ لوگ ہوئے کہ جن کا اس تحریک سے دُور کا بھی واسطہ نہ تھا!

ایک بار چینی نائب وزیر اعظم پاکستان تشریف لائے - کراچی میں گورنر ہاؤس میں عالی مرتبت صدر مملکت نے مجھے خاص طور پر بلا کر ان سے میری ملاقات کرائی - میری نائب وزیر اعظم چین سے نیم انگریزی اور نیم چینی گفت گو کے بعد مجھے ان کی جانب سے دورۂ چین کی دعوت دی گئی - اس موقع پر عالی مرتبت صدر مملکت نے ارشاد فرمایا:

حکیم صاحب کو میں اپنے ساتھ چین لاؤں گا -

مگر جب صدر مملکت چین تشریف لے گئے تو میں ان کے ساتھ نہ تھا - اس موقع پر میں نے ایک سمری تیار کی کہ میں آپ کے ساتھ چین جانا چاہتا ہوں - اس خواہش کی وجہ یہ تھی کہ میری کتاب " میڈیسن ان چائنا " مکمل ہو چکی تھی مگر اس کے بعض پہلو تشنہ تھے اور اگر میں خود چین جاتا ہوں تو تشنہ پہلو درست ہو سکتے ہیں - یہ جذبۂ تکمیلِ کتاب محرکِ " سمری " ہوا - مگر میں نے خود پر قابو پا لیا اور صدر مملکت سے اس ذاتی خواہش کا اظہار نہ کیا - الحمد للہ حکومتِ عسکری میں میری شرکت میری ذاتی طلب و خواہش سے ماورا رہی ہے اور میں نے دائرۂ طب سے کوئی قدم باہر نہیں رکھا ہے -

میڈیسن ان چائنا

۱۹۶۳ء میں میں نے چین کا ۳۱ روزہ دورہ کیا تھا۔ دورۂ چین کی دعوت حکومت چین نے من جانب اکیڈمی اوف ٹریڈیشنل میڈیسن دی تھی اور پنج رکنی ایک وفد نے میری قیادت میں چین کا دورہ کیا تھا۔اس وفد میں خیال رکھا گیا تھا کہ حکیم ، ڈاکٹر اور سائنس داں ہوں۔پاکستان کی جانب سے یہ سب سے پہلا طبّی وفد تھا کہ جو چین گیا تھا۔یہی وہ وفد ہے کہ جس کی وجہ سے پاکستان اور چین میں طبی روابط قائم ہوئے۔پھر انجمن ترقیٔ طب نے جواب میں چین سے ایک پنج رکنی طبّی وفد کو پاکستان آنے کی دعوت دی اور انجمن ترقی طب اور ہمدرد اس کے میزبان ہوئے۔ طبّی تعلقات کے استحکام کی یہ ایک اہم کوشش تھی۔حکیم سعید اور ہمدرد کی اس خدمت کا اعتراف چین کو ہے مگر پاکستان کی وزارت صحت کو اس پر خجالت ہے اور وزارتِ خارجہ کو فرار!

" میڈیسن ان چائنا " کی بنیاد میری وہ رپورٹ ہے کہ جو میں نے ۳۱ روزہ دورۂ چین کے بعد کوئی ایک سو فل اسکیپ سائز صفحات پر مرتب کر کے اس وقت کے صدر جناب فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی خدمت میں پیش کی۔میری یہ جامع و مانع رپورٹ آج بھی موجود ہے اور چین و پاکستان کے مابین طبی رشتے اسی رپورٹ کی بنیادوں پر استوار ہوئے ہیں اور ۱۹۶۳ء میں وزارتِ صحت پاکستان اور پاکستان میں میڈیکل پروفیشن نے میری جن تجاویز اور پیش کردہ لائحہ عمل کا استہزاء کیا تھا آج سب اسی پر خود عمل کر رہے ہیں!

ایک دل چسپ واقعہ!

میں ایک بڑا دل چسپ واقعہ فراموش نہیں کر سکتا اور دل چاہتا ہے کہ میں اسے یہاں رکارڈ کر ہی دوں۔چین سے حکیم، ڈاکٹر اور سائنس دانوں پر مشتمل ایک طبی وفد میری دعوت پر پاکستان آیا تو راولپنڈی میں ایک " بڑے کرنل " نے اس وفد سے ملاقات سے انکار کر دیا کہ میں اتائیوں سے ملاقات نہیں کر سکتا۔ طبِ

چینی اور طبِ یونانی ان کے نزدیک اتائیت تھی ! آج بھی بڑے کرنل صاحب میجر جنرل ہیں اور طب چینی کے " اکیوپنکچر " پر خود عمل کرتے ہیں۔ ۱۹۷۳ء کی اپنی رپورٹ میں میں نے مشورہ دیا تھا کہ پاکستان میں اکیوپنکچر طریقِ علاج اختیار کر لینا چاہیے کہ اس طریقِ علاج کو مستقبلِ قریب میں بالآخر اہمیت حاصل ہوگی۔ مجھے خود علم نہیں ہے مگر پاکستان کے قائم مقام صدر جناب فضل القادر چودھری صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ میری رپورٹ میں میرے اس مشورہ پر وزارتِ صحت کے بڑوں نے بڑے بڑے سرخ نشانات لگا کر اس کا مذاق اڑایا ہے !

۱۹۷۰ء میں جب میں نے امریکا کا علمی اور مطالعاتی دورہ کیا تو اُس وقت میری کتاب "مڈیسن اِن چائنا" امریکا پہنچ چکی تھی اور امریکا اور چین میں باہم تعلقات پر غور و فکر کا آغاز بھی ہو چکا تھا۔ مجھے اس حقیقت کا علم ہے کہ امریکا سے مطالعۂ طبِ چینی کے لیے جو بھی وفد گیا اس کے پاس " مڈیسن اِن چائنا " ضرور تھی !

میں نے ۱۹۷۰ء میں دورۂ امریکا میں اہمیت کے اکثر و بیشتر طبی مراکز اور صحت کے ادارے دیکھے ہیں اور وہاں ان کے ڈائریکٹروں سے تبادلِ خیال کیا ہے۔ پاکستان کا کوئی ایک معالج مجھ سے زیادہ مطالعۂ طبی امریکائی کا دعوا نہیں کر سکتا۔ رنج مجھے یہ ہے کہ میں " مڈیسن ان امریکا " اپنی کتاب مکمل نہ کر سکا اور اس دورۂ طبی کے کم از کم ڈیڑھ ہزار صفحات میرے پاس تیار رکھے ہیں اور اسی قدر میٹریل میرے پاس محفوظ ہے۔ کاش مجھے یہ وقت مل جاتا !

بات کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ۱۹۷۰ء میں امریکا کے ماہرینِ طب و سائنس سوال کرتے تھے کہ " اکیوپنکچر ٹوٹکا ہے یا حقیقت ہے ؟ یا محض نفسیاتی مسئلہ ہے ؟ " میں ان دنوں یہ کہتا تھا کہ " میری رائے میں یہ طریق علاج ایک حقیقت ہے اور اس پر غور کرنا چاہیے۔ کل اس کو عالمی مقبولیت حاصل ہوگی "۔

مراحل

سفر کی نوعیت اور مسافر کی حیثیت مراحل کا تعین کرتی ہے۔

آغاز سفر سے دوران سفر اور تا اختتام سفر مسافر کو مراحل سے بہرحال گزرنا پڑتا ہے، اور مراحل طے کر کے حالات کو ایک کامیاب و بامراد سفر کے لیے استوار کرتے رہنا ہوتا ہے۔ جب سفرِ شمالی کوریا کا فیصلہ ہو گیا تو پھر اس کے لیے تیاری بھی کوئی ہوئی۔ ایک طرف کوشش یہ کہ یہ سفر دائرۂ طب و سائنس اور حدودِ تعلیم میں رہے، دوسری طرف عالی جناب کم ال سنگ صاحب کا جشنِ یومِ ولادت ہے جس میں شرکت ناگزیر ہے۔ ہر چند کہ میں نے اپنی حیثیت ایک طبیب کی رکھی ہے اور سرکاری ذمہ داریاں وزیر صنعت جناب الٰہی بخش سومرو کو سونپی گئی ہیں باایں ہمہ میں جشن ولادت کے پروگراموں سے صَرفِ نظر نہیں کر سکتا۔ پاکستان کا وزیر ہوں اس لیے سفارتی آداب و اکرام بھی ملحوظ رکھنے ہوں گے۔ روانگی سے قبل انتظامات وغیرہ بڑے سخت مراحل تھے جن سے بہرحال گزر گیا۔ وزارت خارجہ سے روابط، شمالی کوریا سے رابطہ، غرض مراحل کا سلسلہ تھا کہ اس سے گزرتا گیا اور بالآخر طے پایا کہ کراچی سے ۱۲/اپریل کو روانگی ہے۔ جہاز بیجنگ (عوامی جمہوریۂ چین) اترے گا۔ وہاں ایک رات قیام کر کے دوسرے دن پیونگ یانگ (دارالحکومت شمالی کوریا) روانہ ہونا ہے۔ پھر ۲۲/اپریل تک وہاں رہ کر ۲۳/ کو صبح بیجنگ پہنچنا ہے اور بیجنگ سے ۲۸/اپریل کو پاکستان روانہ ہونا ہے۔ دس[۱۰] دن شمالی کوریا میں اور پانچ دن دارالحکومت چین بیجنگ میں۔ شمالی کوریا نے میری دختر سعدیہ (مسز راشد) کو بھی دعوت دی ہے۔ سعدیہ اس سفر میں میری سکریٹری کی حیثیت سے شریک ہوں گی۔

تحائف

کوریا اور چین کے میرے اس سفر کو سرکاری حیثیت حاصل ہے باایں ہمہ ہمیشہ کی طرح تحائف میں اپنی طرف سے لے جاتا ہوں اور اس قسم کے تمام سفر بھی میں اپنے اخراجات سے کرتا رہا ہوں اور حکومت پر کوئی بار نہیں بنتا رہا ہوں۔ میں نے وقت نکال کر کوریا اور چین کے لیے اتنے تحائف خرید لیے ہیں کہ میں ان کے خلوص و انس کا مناسب و متوازن طور پر شکریہ ادا کر سکوں گا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ کوریا اور چین میں "ٹپ" کا کوئی رواج نہیں ہے،

اسے بُرا سمجھا جاتا ہے اور وہاں "ٹپ" کی ممانعت ہے اس لیے میں نے ان تمام کارکنان کے لیے بھی مناسب تحائف لے لیے ہیں کہ جن سے روزانہ واسطہ پڑ سکتا ہے۔ اور سب سے اہم تحائف مطبوعاتِ ہمدرد ہیں کہ جو میں نے اپنے دوستوں کے لیے ساتھ لی ہیں۔

فیصلۂ سفر

گزشتہ دنوں انتہائی کشمکش میں رہنے کے بعد بالآخر میں نے طبی دورۂ کوریا و چین کا فیصلہ کر ہی لیا ہے، اور سفر کے لیے تمام ہدایات جاری کر دی ہیں، اور خود کو اس کے لیے بہر طور تیار کر لیا ہے۔

دورۂ کوریا و چین

شمالی کوریا جانے کے لیے چین سے گزرنا ہوتا ہے اور واپسی کا راستہ بھی یہی ہے۔ غور و خوض اور مشورہ کے بعد طے پایا کہ بے حد مناسب ہے کہ میں شمالی کوریا کا دورہ ختم کر کے ۲ - ۵ دن عوامی جمہوریۂ چین میں گزاروں اور وہاں اہلِ علم سے تبادلِ خیال کروں کہ جو میرے منتظر ہیں۔ چین میں پاکستان کے سفیر جناب محترم محمد یونس صاحب ہیں۔ انھوں نے انتہائی خلوص و انس کے ساتھ میرے دورۂ چین کے تمام انتظامات بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ کر دیے۔ محترمی محمد یونس صاحب کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے کہ جنھوں نے وقار پاکستان بلند کرنے کے لیے اپنی ہر صلاحیت کو بروئے کار لانے کا شرف حاصل کیا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں کہ جن کی سفارتی اور اختیاری عمریں کم ہوا کرتی ہیں اور وہ سازشوں کا شکار بنا دیے جاتے ہیں۔

رختِ سفر

۱۲ - اپریل ۱۹۸۲ء - پیر

شب گزشتہ سامان سفر کرنا بھی خاصا مرحلہ تھا! معلوم ہوا کہ کتابوں کا اور دوسرے تحائف کا وزن ایک سو کیلو گرام ہو گیا ہے!

اب بین الاقوامی سفروں میں اندازہ یہ ہو گیا ہے کہ دو عدد فی کس سے زیادہ نہیں ہونے چاہییں ، ان کا وزن اگر مقررہ حد سے زیادہ ہو تو عموماً فراخ دل ہوائی کمپنیاں اس کا خیال نہیں کرتی ہیں - ہمارے دو ٹکٹ ہیں اور سامان کی حد ۳۲ کیلو گرام ہے ،اور سامان ہمارا ایک سو چوبیس کیلو گرام ہوگیا ہے ! بارے احتیاط کر کے چار عددوں میں اس سارے سامان کو سمو لیا ہے - صبح جب ساڑھے پانچ بجے میں ہوائی میدان پر آیا تو خیریت کی اطلاع ملی ! رومانین ایئر لائنز نے خصوصی رعایت دیدی ہے -

میں غیر ملکی سفروں پر جانے کے لیے وی آئی پی لاؤنج استعمال کو لیتا ہوں مگر کبھی ایسا نہیں بھی کرتا - مثلاً گزشتہ ماہ کویت گیا تو وی آئی پی روم میں نے استعمال نہیں کیا تھا - ملکی سفروں میں میں عوامی راستوں سے جاتا آتا ہوں اور ان تمام مراحل سے گزرتا ہوں کہ جن سے سب مسافر گزرتے ہیں - ایسا کو کے میں کوئی کمال نہیں کرتا بعض دوسرے وزرا اخبارات میں اس کی سرخیاں قائم کرا دیتے ہیں - خبروں کو پڑھ کو مجھے بڑی ہنسی آتی ہے -

نائب صدر صومالیہ

ہوائی میدان پر آ کو جب میں وی آئی پی روم میں آ گیا تو پتا چلا کہ آج وی -وی -آئی-پی روم بھی کھلا ہے اور صومالیہ کے نائب صدر کا پاکستان احترام کو رہا ہے -دل خوش ہوا کہ ہم بہ حیثیت مسلمان احترام و اکرام کو اہمیت دیرہے ہیں - میں اور سعد یہ ہوائی جہاز میں سوار ہو گئے اور ہمارے بعد صومالیہ کے نائب صدر کو سندھ کے وزیر خزانہ جناب اشرف تابانی صاحب لے کر آئے - بڑی شاندار موٹر کار - آگے موٹر سائیکل سوار پیچھے حفاظتی گارڈ - اس انداز سے وہ ہوٹل سے وی آئی پی روم لائے گئے اور پھر اسی انداز سے ہوائی جہاز تک لائے گئے -

ایک دلچسپ بات یہ معلوم ہوئی کہ جب وہ ایک عرب ملک کے ہوائی میدان سے پاکستان کے لیے روانہ ہو رہے تھے تو ان کے پاس جو سامان ہاتھوں میں تھا اسے لے لیا گیا کہ یہ جہاز کے

اندر کے لیے بڑا ہے اور ان کو خالی ہاتھ پاکستان روانہ کر دیا گیا۔ اب صبح اسی ملک کا جہاز کراچی کے ہوائی میدان پر اترا اور اچھا ہوا کہ وہ چھٹا ہوا سامان اس میں آ گیا اور کارکنان پی آئی اے نے حاصل کر کے نائب صدر صومالیہ کے حوالے کر دیا۔

رومانیہ کی ایئرلائنز کا عملۂ جہاز واقعی بہت خوش مزاج ہے۔ تمام مسافروں کے ساتھ ان کا سلوک خوب تر رہا ہے۔ سعدیہ اور میرے ساتھ امتیازی سلوک رہا اور ہمارا دونوں کا ناشتہ خصوصی برتنوں میں آیا۔ اور پھر جب لنچ کا وقت آیا تو میں نے دیکھا کہ انہوں نے نائب صدر صومالیہ کے حوالے ایک لنچ بکس کر دیا ہے۔ تمام مسافروں کو اسی طرح دیا گیا تھا مگر ہم دونوں کے لیے خصوصی ٹرے لگ کر آئی۔ میں نے معذرت کر لی کہ ہمیں بھوک نہیں ہے۔ ہم نے ایسا فیصلہ اس لیے کیا کہ صومالیہ کے نائب صدر ہمارے قریب تھے اور یہ کسی طرح اچھا نہ لگتا تھا کہ وہ "پیالی میں کھائیں اور ہم تھالی میں۔" ہم نے بھوکا رہنا پسند کر لیا۔ میرا تو خیر کچھ نہیں مگر سعدیہ واقعی بھوکی رہ گئیں۔ مگر تقاضائے اخلاق یہی تھا کہ ہم نائب صدر مملکت صومالیہ کا احترام اس انداز سے بھی کریں۔

بیجنگ کے ہوائی میدان پر

تقریباً سات گھنٹے مسلسل پرواز کے بعد دو بجے رومانیہ ایئرلائنز کا ہوائی جہاز بخیریت تمام چین کے دارالحکومت بیجنگ کے ہوائی میدان پر اتر گیا۔ سات گھنٹے گویا پلک جھپکتے گزر گئے! میں نے آج کا زیادہ تر وقت غور و فکر میں گزارا ہے اور اس غور و فکر کے نتیجے میں میں نے ایک فیصلہ یہ بھی کر لیا ہے کہ میں "کوریا کہانی" نام سے ایک کتاب لکھ ہی لوں گا۔ اس سال ۱۹۸۲ء میرا حال بڑا عجیب ہے۔ میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ تحریر سے میری طبیعت کو فرار ہے۔ اس سال ایک دن بھی میں نے اپنا روزنامچہ نہیں لکھا ہے۔ ارادہ کیا تھا کہ بس اب میں اہم واقعات قلم بند کر کے رکھتا جاؤں گا۔ مگر ایسا بھی میں نہیں کر سکا۔ اس سال شروع سے اب تک دوسری قسم کے تحریری کام اس کثرت سے کیے

ہیں کہ روزنامچہ لکھنے کی فرصت بالکل ہی نہیں ملی۔ اب سوچتا ہوں کہ کم از کم کوریا کے سفر پر تاثرات قلم بند کرتا رہوں شاید دل آمادۂ تحریر ہو جائے!

بیجنگ کے ہوائی میدان پر اترا تو مجھے اس کا بہ خوبی اندازہ تھا کہ رات بھر بیجنگ میں قیام "ٹرانزٹ" کی تعریف میں آتا ہے اور حکومت چین کو میزبانی کا مکلف نہیں ہونا چاہئے، مگر بیجنگ کے ہوائی میدان پر وزارتِ صحت چین کے نمائندگان موجود تھے اور سفارتِ پاکستان کا تمام عملہ بھی موجود تھا۔ حکومت چین نے میری یہ رات بھر کی میزبانی بھی قبول کر کے مجھے مشرف کیا ہے۔ ہم جلد ہی ہوائی میدان سے "پیکنگ ہوٹل" گئے۔ وزارت صحت چین کی خصوصی کار آئی تھی اور میں اسی میں گیا۔ پاکستان کے سفارت خانے کے عملے کے دو اہم ارکان بھی ہمراہ رہے۔

۱۳۔ اپریل تا ۲۸۔ اپریل ۱۹۸۲ء بیجنگ کا پروگرام

جب ہم بیجنگ کے ہوائی میدان پر کوئی سات گھنٹے پرواز کے بعد اترے تو وقت میں تین گھنٹوں کا فرق آ چکا تھا، یعنی تین گھنٹے وقت آگے ہو گیا تھا۔ طے پایا کہ ہم پون گھنٹے آرام کر لیں اور ساڑھے چھے بجے "ڈنر" کے لیے تیار رہیں۔ ہم نے ایسا ہی کیا۔ نماز عصر ادا کر کے میں ڈنر کے لیے تیار ہو گیا۔ اس اثنا میں میں نے اس پروگرام پر ایک نظر ڈالی کہ جو سفارت پاکستان نے وزارتِ صحت چین کے مشورہ سے تیار کر لیا تھا۔ ڈنر درحقیقت اس پروگرام کو حتمی شکل دینے کے لیے تھا۔ میں نے احتیاط سے اس پر غور کر لیا ہے اور اس کی منظوری دے دی ہے۔ چند تبدیلیاں تجویز کر دی ہیں۔

ہوائی میدان سے ہوٹل تک ایک نظر میں

۱۹۲۳ء کو واقعی کافی دن گزر گئے ہیں، بایں ہمہ میں نے اس وقت جو دیکھا تھا سب مجھے یاد ہے، حتیٰ کہ سعدیہ کو

اپنے ہوٹل اور اپنے ڈرائیور تک کا نام خوب یاد تھا۔ ہوائی میدان سے شہر بیجنگ تک بہ ظاہر کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ وہی سڑک ، وہی مکانات ہیں۔ البتہ اب کئی منزلہ اپارٹمنٹ کھڑے ہو گئے ہیں۔ شہر میں کئی "آوور ہیڈ برج" تیار ہو گئے ہیں ، اور بڑھتی ہوئی ٹرافک پر قابو پانے کے انتظامات ہو رہے ہیں۔

۱۳۔ اپریل ۱۹۸۲ ء ۔ منگل

کل سات گھنٹے مسلسل ہوائی سفر کے اثرات جسم پر مرتب ہوئے ہیں۔ رات ۹ بجے لیٹ گیا تھا۔ مگر نیند " ڈسٹرب " رہی۔ کمرہ ضرورت سے زیادہ گرم تھا۔ بار بار اٹھ کر میں نے ائرکنڈیشنگ سسٹم کو اوپر نیچے کیا۔ مگر کوئی فرق نہیں پڑا۔ بارے صبح جب اٹھا تو طبیعت صاف نہ تھی اور جسم ٹوٹ رہا تھا۔ میرا جسم اب ہوائی سفر کے اثراتِ مابعد کو محسوس کرتا ہے اور تقاضا کرتا ہے کہ مجھے اب احتیاط کا دامن پکڑنا چاہیے۔

صبح میں اپنی میز پر بیٹھ گیا اور ذہن گرد و پیش کا جائزہ لینے لگا۔ ایک بار صدیق سالک نے جب ہوٹل پیکنگ کے کمرے سے باہر جھانکا تو ان کی لاہور سے ملاقات ہو گئی ، مگر میں نے جب ہوٹل کی کھڑکی سے جائزۂ ماحول لیا تو مجھے وہاں جفاکشی نظر آئی جو چینیوں کا مزاج ہے۔ چین کو دعوائے امارت کبھی نہیں رہا ، مگر اس کا یہ طرۂ امتیاز ہے کہ اس نے اپنی غربت میں اپنی خودی کا کوئی سودا کبھی نہیں کیا۔ افلاس نے اس سے اس کی خود اعتمادی نہیں چھینی اور چین کا ہر ہر فرد وطن کی تعمیر میں لگ گیا۔ قیادت کی یہ عظمت اور فکر و نظر کی یہ رِفعت اگر لاہور کو نصیب ہو جاتی تو آج پاکستان قرضوں اور امدادوں پر نہ چلتا۔ چین کا ہر فرد موٹا جھوٹا پہنتا ہے ، قناعت کا دامن پکڑتا ہے مگر اس نے اپنے وطن کو چار چاند لگا دیے۔ مجھے سالک کے برعکس ہوٹل سے باہر جھانک کر یہ رنگ نظر آیا۔

چین میں اب غیر ملکیوں کی آمد و رفت بڑھ گئی ہے۔ حکومتِ چین کے طرزِ عمل میں فرق آ رہا ہے۔ اب غیر ملکیوں کے لیے چین

کے دروازے کھل گئے ہیں۔ ویسے تو ہر ملک کا ہی آدمی یہاں نظر آتا ہے لیکن امریکی زیادہ دیکھے جا رہے ہیں۔ ہوٹل پیکنگ غیر ملکیوں ہی کے لیے ہے اور بتایا گیا ہے کہ اب مئی کا مہینہ شروع ہوتے ہی یہاں سیاحوں کی ریل پیل ہو جائے گی اور ہوٹل پیکنگ کے نو سو کمروں میں سے کوئی ایک بھی خالی نہیں رہے گا۔ اب ایک اور ہوٹل غیر ملکیوں کے لیے تیار ہو گیا ہے جہاں امریکی کیبرے وغیرہ کا بھی انتظام ہے۔ وہ بھی اب بھر جاتا ہے۔ بالآخر بعض اہم اور خصوصی ضرورتوں میں سرکاری مہمان خانے کے بعض حصے کرائے پر دیدیے جاتے ہیں۔ میرا تاثر یہ ہے کہ چین میں قیادتِ ماضی پر ایک الزام یہ بھی ہے کہ اس نے اپنی پالیسی میں غلو سے کام لیا اور چینیوں کو چین میں محصور کر دیا اور ان کو باہر کی ہوا لگنے نہیں دی اور نہ باہر سے کوئی ہوا آنے دی۔ اخبارات کی قیاس آرائی کے مطابق ماؤزے تنگ پر اب نئے نئے الزامات لگائے جا رہے ہیں اور مرحوم کی شخصیت کو چین میں غیر محترم کیے جانے کے آثار ملتے ہیں۔ میں ذہنی طور پر اس قسم کے اقدامات کو صحیح نہیں سمجھتا۔ میں اس صورتِ حال کو پاکستان کے آئینے میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ پاکستان کی ۳۵ سالہ عمر میں متعدد شخصیات سربراہِ پاکستان بنی ہیں، مگر ہم جانتے ہیں کہ جب ایک محرومِ اقتدار ہوا تو ہر نئے مقتدر نے جانے والے کو شدّومد کے ساتھ بدنام کیا۔ یہ سلسلہ اب تک اس طرح جاری ہے کہ ٹوٹتا نہیں ہے۔ اس صورتِ حال نے پاکستان میں شخصیات کو فنا کر کے رکھ دیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم اپنی کتابوں میں اور اپنی نصابی کتب میں ۳۵ سال کے عرصے میں کسی شخصیت کا ذکر نہیں کر سکتے۔ ۳۵ سال قحط الرجال کا دور ہے اور ہم نے کم از کم اپنی دو نسلوں کو کوئی قابلِ احترام شخصیت نہیں دی ہے۔

اس شدید صورتِ حال کو ہم ناکامیٔ سیاست کا عنوان دے سکتے ہیں۔ اگر پاکستان میں حقیقی جمہوریت اور دیانت دار سیاست ہوتی تو جمہوری عمل میں کوئی رخنہ نہیں پڑ سکتا تھا اور ہر جمہوری عمل چھلنی کا کام دیتا اور چھن چھن کو اچھے لوگ سامنے آتے جاتے اور رفتارِ تعمیر و ترقی کبھی سُست نہ ہوتی۔ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ پاکستان میں سیاست دانوں کی صریحی ناکامی اور

دیانت و امانت سے فرار نے عساکر پاکستان کو اقتدار سنبھالنے کی کئی بار دعوت دی ہے اور اب کہ یہ تحریر لکھی جا رہی ہے پاکستان میں عسکری حکومت ہے جس کا خیال ہے کہ اقتدار میں افواج کی شرکت و شمولیت عینِ اسلام ہے ۔ جہاں تک میرا مطالعہ ہے پاکستان اب اپنی خودی سے محروم ہو چکا ہے اور اخلاق کے زوال کی شدید گرفت میں ہے ۔اس پر مستزاد یہ کہ چاروں طرف یلغارِ طاغوت ہے ۔ ان شدید حالات میں بھی سیاست دانوں کی نادانیاں پاکستان میں جمہوریت کے قیام میں مانع رہیں گی ، اور آنے والے کئی سالوں تک اگر استقلالِ پاکستان معرضِ خطر میں نہ آگیا تو جمہوریت کی بحالی کے امکانات نہیں ہیں ۔

ماؤزی تنگ کے بارے میں چین میں موجودہ صورت حال میرے دل کو نہیں لگ رہی ہے۔ ماؤزی تنگ اور چو این لائی پورے تسلسل کے ساتھ کامیاب جنگِ آزادی لڑکے اور فتح کامل پا کر کم از کم تیس سال بلا شرکت غیرے چین پر حکمراں رہے اور اس قلیل عرصے میں چین دنیا کی تیسری بڑی طاقت بن کر ابھرا ہے ۔وہ چین کہ جس پر امریکی اقتدار اور برطانوی راج تھا غلامی کا طوق اتار کر صرف ۳۰ سال کے عرصے میں دنیا کی ایک بڑی طاقت بن گیا ۔اس کا کریڈٹ اگر ماؤزی تنگ اور چواین لائی کو نہیں دیا جائے گا تو کون اس کا کریڈٹ لے گا ! بارے یہ چین کا اندرونی معاملہ ہے اور مجھے رائے زنی کا کوئی حق شاید نہیں ہے۔ یہ جملے اضطراراً قلم سے اس لیے نکل گئے کہ چین سے مجھے قلبی تعلق ہے ۔ مگر میرا دل چاہتا ہے کہ میں ماؤزی تنگ اور چواین لائی کے مزارات پر جا کر خراج تحسین پیش کروں مگر میرے پروگرام میں ایسی کوئی چیز شریک نہیں ہو سکی !

فرینڈشِپ اسٹور

فرینڈ شپ اسٹور غیر ملکیوں کے لیے خریداریوں کی جگہ ہے ۔اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ غیر ملکی دوسرے اسٹورز میں نہیں جا سکتے۔ واقعی فرینڈ شپ اسٹور ایک بہت بڑا اسٹور ہے اور اس میں نہ صرف چین کی مصنوعات بکثرت ملتی ہیں بلکہ یہاں اب امریکی اشیا بھی

دستیاب ہیں ۔ مثلاً ریولون کے کاسمیٹکس وغیرہ ۔ چوں کہ آج کوئی ایسا پروگرام نہیں بن سکتا تھا کہ جو تعمیری ہو اور بیجنگ میں ہم ٹرانزٹ میں ہیں ، اس لیے طے یہ کیا کہ آج خریداری کر لینی چاہیے ۔ میں تو اس سے بے نیاز ہوں مگر میں سعدیہ کا دل تو نہیں مار سکتا ۔ پھر وہ اپنے پیسے لے کر آئی ہیں ، ان کو خریداری سے روکنا صحیح نہیں ! چنانچہ ہم سفارت خانۂ پاکستان کے حبیب صاحب کے ساتھ فرینڈ شپ اسٹورز پہنچ گئے ۔ ہوٹل پیکنگ میں بنک ہے جہاں سعدیہ نے دو سو امریکی ڈالر بھنائے ۔ ایک سو ڈالر کے ایک سو اکیاسی یوآن ملے ۔ ایک یوآن کم و بیش ۲ پاکستانی روپوں کے برابر آ کر بیٹھا ۔ خریداری جب شروع ہوئی تو یہ ۳۶۲ یوآن کم پڑ گئے اور ایک سو ڈالر مزید بھنانے پڑ گئے ۔ بارے خریداری اس انداز سے سعدیہ نے کر لی ہے کہ گھر کے بہت سے بچوں بڑوں کے لیے کچھ نہ کچھ ہو ہی گیا ہے ۔

میرا بھی دل چاہا کہ کچھ خرید لوں مگر ذرا ہمت نہ ہوئی ۔ ایک لکڑی کا بڑا "واز" پسند آیا ہے ۔ کوئی دو ہزار روپیے کا ہے ، مگر کل پر چھوڑ دیا ہے ۔ ہاں چند دوستوں کے لیے چینی گاؤن پسند آئے ہیں ، مگر خریدے نہیں ہیں ۔ کوریا سے واپسی پر غور کروں گا ۔

بیجنگ سے پیونگ یانگ روانگی

کورین ایئر لائنز کے جس جہاز کو دن کے $2\frac{1}{2}$ بجے بیجنگ سے پیونگ یانگ پرواز کرنی تھی اب وہ ۵ بجکر ۲۰ منٹ پر محو پرواز ہوگا ۔ اس لیے سعدیہ اور میں اپنے کمرے میں آرام کرتے رہے ۔ انتظام یہ تھا کہ میرا کمرہ الگ ہوگا اور سعدیہ کا کمرہ الگ ۔ مگر جب میں نے دیکھا کہ میرے لیے سوئٹ کا انتظام ہے تو میں نے سعدیہ کو اپنے ساتھ رکھنے کا فیصلہ کیا اور دوسرا کمرہ چھوڑ دیا اور چینی میزبانوں کے اصرار کے باوجود میں نے دوسرے کمرے کا بار ڈالنا مناسب خیال نہیں کیا ۔ $3\frac{1}{2}$ بجے وزارتِ صحت چین کے نمائندگان آ گئے اور ان کے ساتھ ہم ہوائی میدان روانہ ہو گئے ۔ جو کار ہمیں ملی ہے وہ شاہی ہے ۔ بڑی زوردار ! جہاز ۵ بجکر ۲۰ منٹ پر واقعی روانہ ہو گیا ، سفارت پاکستان چین نے سفارت

پاکستان کوریا کو صورت حال بتا دی ہے تاکہ وہاں کوئی نہ کوئی مل ضرور جائے اور کوئی مسئلہ پیدا نہ ہو جائے !

کورین ائیر لائنز میں میرا یہ پہلا سفر ہے - اچھا جہاز ہے مگر جہاز سے اچھا اس کا عملہ ہے - ایک تو یہ ہے کہ اس جہاز میں کئی ممالک کے وفود ہیں جن کی حیثیت سرکاری مہمان کی ہے - افریقی بھی ہیں اور عرب بھی - جاپانی بھی اور ہندی بھی - ان کے استقبال و احترام کی خصوصی ہدایات ہوں گی - مگر اس سے زیادہ یہ ہے کہ عملہ اپنے رہنمائے اعظم مارشل کم ال سنگ کی محبت و قیادت سے سرشار ہے - ہندستان کی نائب وزیر صنعت ہندی وفد کی قائد ہیں - ان سے تعارف ہو گیا ہے - ملنسار خاتون ہیں - دل چاہا کہ برابر بیٹھے عربوں سے شرف ہم کلامی حاصل کروں مگر میں ان کا ہم پلہ نہیں ہوں - پھر وہ جانتے ہیں کہ میں اپنے ملک کی وجہ سے ان کا نمک خوار ہوں اس لیے ان کی گردن میں اکڑاؤ میرے لیے نوم نہ ہو سکا مگر میرا دل ان کے لیے عزت و تکریم کی گرمی سے نوم رہا -

پیونگ یانگ ہوائی میدان پر

ارے واہ ! یہاں تو باراتیں اتر رہی ہیں ! ہوائی میدان جگ مگ جگ مگ کو رہا ہے - روشنیوں سے یہاں چپہ چپہ بقعۂ نور بنا ہے - ٹیلے وژن کی روشنیاں اس پر مستزاد ! اور زرق برق لباسوں میں ملبوس پیارے پیارے بچوں سے ہوائی میدان جگمگا رہا ہے - اور یہاں کی فضائیں مسکرا رہی ہیں ! یہ منظر میں نے ہوائی جہاز کی کھڑکی سے دیکھا - اتنے میں میزبانوں نے اندر آکر سب سے تعارف حاصل کیا - اندازہ تو تھا مگر اب یقین آگیا کہ اس جہاز میں کئی ممالک کے وفود ہیں جو کامریڈ کم ال سنگ کے یوم پیدائش کی تقریب میں شرکت کے لیے آئے ہیں - پاکستان کا سرکاری وفد تو کل آ چکا ہے ، میں تو وزیر صحت کوریا کا مہمان ہوں ، بایں ہمہ میرا شمار بھی وفد میں ہوا اور استقبال زور دار ہوا - جہاز سے باہر آ کو میں نے کھڑے ہوئے لوگوں کو ہاتھ ہلا ہلا کر سلام کیا - تالیوں کے شور اور نعروں کے جوش میں میں سعدیہ کے ساتھ

سیڑھیوں سے اترا ، ٹیلے وژن نے فلم سازی نیچے اترنے تک جاری رکھی۔ میزبان قطار میں کھڑے تھے۔ سب سے ہاتھ ملایا اور پھر آخر میں پیاری بچیوں نے آگے بڑھ کر گلدستے سعدیہ کو اور مجھے دیے۔ اس کے بعد فوٹو گرافروں نے آنکھوں کو خیرہ کر کر دیا۔ یہ جو سب کچھ ہوا وہ کافی نہ تھا۔ ٹیلے وژن اور فوٹو گرافروں نے مجھے اور سعدیہ کو الگ اشارہ کر کے تصویریں بنائیں اور فلمز بنائے۔

وزارتِ صحت کوریا کی جانب سے نمائندگان موجود تھے ، پاکستان کے ناظم الامور جناب نور اللہ صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ مجھے وزارت صحت والوں نے سنبھال لیا۔ ایک مترجم اور ایک رہنما خاتون ہمارے ساتھ ہو گئے۔ وزیر صحت کوریا ہوائی میدان دوبارہ نہیں پہنچ سکے۔ ان کو ٹیلے فون کیا گیا کہ جہاز آ گیا ہے اور میں وزارت صحت کوریا کی حفاظت میں آ گیا ہوں!

میری موٹر آگے آگے اور سفارت پاکستان کی گاڑی پیچھے پیچھے۔ جناب نور اللہ صاحب نے بتا دیا تھا کہ میرا قیام اس نئی آبادی میں ہوگا کہ جو کامریڈ کم ال سنگ کے والد صاحب کے مولد کی جگہ تعمیر ہوئی ہے اور جسے سرکاری مہمان خانوں کی بستی کا نام دیا گیا ہے۔ عظیم رہنما کم ال سنگ کے یوم پیدائش کے موقع پر تمام غیرملکی مہمانوں سے یہ بستی آباد ہو رہی ہے۔

ہم چلتے گئے ، چلتے گئے۔ ہوائی میدان سے کوئی ۲۷ کیلومیٹر کے بعد اور پیونگ یانگ شہر سے باہر کوئی ۱۷-۱۸ کیلومیٹر یہ بستی ہے اور یکجا نہیں ہے۔ دور دور ولاز تعمیر ہوئے ہیں۔ یہ علاقہ خاصی بلندی پر ہے۔ موسم خوب سرد ہے۔ ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں جن میں برف پوش پہاڑوں کی برف بھی، لگتا ہے کہ، ملی ہوئی ہے۔

بالآخر وہ ولا مل گیا کہ جو میرے لیے مختص ہوا ہے۔ دور دور ایسے متعدد ولاز ہیں اور یکجا نہیں ہیں۔ مثلاً بتایا گیا کہ جناب الٰہی بخش سومرو کا ولا میرے ولا سے کم از کم ۱۲ کیلومیٹر دور ہے!

ولا میں داخل ہوئے تو وہ خوب گرم تھا۔ ہیٹنگ کا بھرپور انتظام تھا۔ وزارتِ صحت کوریا کے میزبانوں نے ذرا دیر کے لیے ہمیں

آزاد چھوڑ دیا اور قائم مقام سفیرِ پاکستان جناب نور اللہ صاحب ہمارے ساتھ بیٹھ گئے۔ان سے ۱۵ منٹ تبادلِ خیال کیا۔ معلوم ہوا بلوچستان کے ہیں۔نور اللہ صاحب سے ملاقات کر کے دل خوش ہو گیا۔ پیارے نوجوان ہیں۔مجھے یاد آیا کہ آج سے کوئی ڈیڑھ سال قبل جب میں کوئٹہ گیا تھا تو وہاں اخبار نویسوں اور بعض بزرگوں کی جانب سے یہ شکایت مجھے ملی تھی کہ دنیا بھر میں پاکستانی سفارت خانے ہیں اور سینکڑوں ہزاروں سفارت کار ہیں ، مگر کوئی ایک بھی سفارت کار نہیں کہ جو بلوچستان کا ہو! مجھے بالکل یقین نہیں آیا ، مگر حقیقت یہی تھی۔ میرے دل و دماغ پر یہ بات بڑی گراں گزری تھی اور میں نے عالی مرتبت صدر مملکت صاحب کو اس طرف توجہ دلائی تھی۔ خود انھوں نے اس صورتِ حال کو بڑی حیرت کے ساتھ سنا تھا۔بارے اب بلوچستان کے دوست سفارتی حلقوں میں لیے جا رہے ہیں ۔نور اللہ شاید سب سے پہلا انتخاب ہیں !

وِلا کا ایک جائزہ

فراغت ملی تو میں نے اور سعدیہ نے اس وِلا کا جائزہ لیا۔

اس میں تین کمرے ہیں اور ہر کمرے میں ایک پلنگ ہے۔ایک چوتھا کمرہ بھی ہے کہ جو ہماری حد سے باہر ہے اور بہ ظاہر ان کارکنان کے لیے ہے جو اس وِلا کے مہمانوں کی دیکھ بھال کے لیے متعین ہیں ۔غسل خانہ مشترک ہے ، مگر اس انداز سے ہے کہ دو مہمان استعمال کر سکتے ہیں۔ ایک گول کمرہ ہے ۔ ایک کمرے کا جائزہ اگر لیا جائے تو اس میں حسب ذیل سہولتیں فراہم کی گئی ہیں :

- ایک پلنگ اور اس پر شاندار آرام دہ بستر ۔
- سائڈ ٹیبل ، اس پر آش ٹرے اور ماچس
- گول میز ، اس پر چائے کا پورا سامان موجود ہے اور مٹھائیوں سے بھرا ہوا ایک ڈبہ ۔ تھرماس میں خوب گرم پانی ۔
- ایک رائٹنگ ٹیبل ۔ اس پر کاغذ اور پنسلوں کے بکس ۔ ایک ٹیبل لیمپ ، آش ٹرے ، سگریٹ "پیونگ یانگ " کا ایک پیکٹ ،

دیا سلائی کا بکس

کوٹ ہینگر ، ایک نہیں دو !

عظیم رہنما کم ال سنگ کی ایک تصویر

تینوں کمروں میں یکساں سامان ہے۔ایک کمرہ میں نے سنبھال لیا ، دوسرا سعدیہ نے لے لیا ، تیسرے کو خالی چھوڑ دیا ہے ! ہر کمرے کا فرش بجلی سے گرم کیا گیا ہے۔

غسل خانے کا جائزہ

- ایک حصہ ایسا ہے کہ اس میں ہاتھ منھ دھویا جا سکتا ہے۔
- ایک حصہ صرف کموڈ کے لیے ہے۔
- ایک تیسرا حصہ غسل وغیرہ کے لیے مکمل ہے۔
- تین مہمانوں کے لیے غسل خانے میں ہر قسم کا سامان میسر ہے۔

ٹوتھ برش ، ٹوتھ پیسٹ ، تیل ،کنگھا ، فیس کریم ، یوڈی کولون وغیرہ

- چپلیں بالکل نئی۔تولیے کئی کئی۔
- سرد و گرم پانی خوب رواں ہے ۔

گول کمرے یعنی ڈرائنگ روم میں صوفہ سیٹ ہے۔ٹیلے وژن رنگین ساختۂ جاپان۔ریفری جریٹر ساختۂ کوریا۔ریفری جریٹر میں ہمہ قسم کے مشروبات ! بیئر سے لے کر کولاز اور جوس تک۔پھل پھلاری بھی ہے۔ٹیلےفون۔مارشل کم ال سنگ کی تصویر ۔ابھی میں نے اس ولا کا جائزہ ختم ہی کیا تھا کہ ترجمان اور گائڈ آ گئے۔ ریستوران ہمیں لے گئے جو نزدیک ہی ہے۔ اس علاقے میں جتنے ولاز ہیں ان کے لیے ایک ریستوران ہے اور اس ریستوران میں کھانے کی کون سے سہولت ہے کہ میسر نہیں ہے۔حیرت انگیز طور پر انتظامات ہیں۔

کارکنان

مجھے یہ اندازہ کر لینے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی کہ

تمام مہمانوں کے لیے میزبانی کے فرائض طلبہ/ طالبات انجام دے رہے ہیں ۔ ہماری گائڈ تو وزارت صحت کی ایک خاتون محترمہ کوران سل ہیں ۔ مگر ترجمان کم ال سنگ یونیورسٹی کا ایک نوجوان طالب علم ہے ۔ اس رولا کی دیکھ بھال کے لیے دو طالبات ہیں جن کو اتفاق سے دیکھ لیا گیا ہے ورنہ ان کو شاید مہمان کو اپنے وجود سے آگاہ نہ کرنے کی ہدایت ہے ! ریستوران میں کھانا تیار کرنے سے لے کر کھانا کھلانے تک کی ذمہ داری بہ ظاہر طلبہ و طالبات پر ہے ۔

میرا یہ دوسرا موقع ہے کہ میں نے اس قسم کے انتظامات میں طلبہ و طالبات کو دیکھا ہے ، کوئی ۷-۸ سال ہوئے جامعۂ اُردن کے زیر انتظام "بلادالشام" کے موضوع پر ایک سات روزہ کانفرنس ہوئی تھی ، میں اس میں شریک ہوا تھا ، وہاں میں نے پہلی بار دیکھا تھا کہ تمام کی تمام میزبانی طلبہ و طالبات کے ذمہ تھی اور حیرت انگیز طور پر حسنِ انتظام تھا ، آج یہاں دوبارہ یہ انتظام دیکھا ہے ۔

ماضی میں تاک جھانک

جب میں کراچی سے نکلا تھا اور پیونگ یانگ کا رُخ کیا تھا تو میرے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھا کہ میں کوریا کے بارے میں اپنے محسوسات قلم بند کروں گا ۔ ہوائی جہاز میں خیال آیا ، اور پھر میں نے اس کام کے لیے اپنے ذہن کو تیار کر لیا ۔ اور اچھا ہوا کہ ایسا کر لیا کہ کوریا کی عظمت اس کی متقاضی ہوئی ہے کہ میں پاکستان میں دوستوں تک تاثراتِ سفرِ کوریا پہنچا دوں کہ یہ میری ذمہ داری ہے ۔ ایسی ذمہ داری کہ جس کا مطالبہ دوستوں نے نہیں کیا ہے ، مگر اہل وطن سے میری محبت و مؤدت نے اسے فرض کی شکل دیدی ہے ! اس میدان میں اترنے سے پہلے شاید یہ ضروری ہے کہ میں کوریا کی تاریخ پر ایک نظر ڈال لوں کہ اس کے بغیر میں خود آگے چل نہیں سکتا اور پھر یہ کہ کوریا کا ماضی جانے بغیر اس کے حال کا سمجھنا آسان نہ ہوگا ، اور نہ تاریخ کے بغیر ماضی و حال کا موازنہ ممکن ہے ، اس لیے میرے سفر ناموں میں تاریخ کو

اختصار کے ساتھ اہمیت حاصل رہتی ہے۔

دنیا کے بہت کم ملک حسن و جمال ، دلکشی اور مناظر قدرت نیز قدرت کی جمیل و حسین فیاضیوں سے اتنے مالامال ہوں گے کہ جو کوریا اور اہل کوریا کا ازل ہی سے مقدر ہیں۔ لیکن جہاں یہ ملک اللہ تعالیٰ کی ارزانیوں اور لطافتوں کا ایک حسین امتزاج اور آئینہ دار ہے ، وہاں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ارضِ ایشیا کا یہ چمکتا ہوا ہیرا اب بھی اقصائے عالم میں اتنا معروف و مشہور نہیں جس کا یہ بجا طور پر مستحق ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ کوریا ، جسے جزیرہ نمائے کوریا بھی کہتے ہیں ، ہزارہا برس سے اپنے تین طاقتور ہمسایوں کی ہوسِ اقتدار اور ان کے توسیع پسندانہ عزائم کا مرکز و محور رہا ہے۔ یہ تین ہمسائے روس ، چین اور جاپان ہیں جو صدیوں سے کوریا کو اپنا باجگزار اور زیر نگیں دیکھنا چاہتے تھے۔ کوریا کی قدیم و جدید تاریخ کے اس پہلو میں یکسانیت کل بھی تھی اور آج بھی ہے۔ کوریا براعظم ایشیا کے انتہائی مشرقی حصے کا بھی نام ہے۔ اس کی یہ انفرادیت مشرقی سائبیریا کے بعض علاقوں کو گوارا نہیں جو اس باب میں اس کے حریف ہیں - بہ ایں ہمہ اگر یہ دعوا کیا جائے کہ یہ خطۂ ایشیا اپنی رعنائی اور اپنے اس امتیاز میں یکتا ہے کہ صبح سویرے سورج کی شعاعوں سے یہ سب سے پہلے بہرہ مند اور بہرہ یاب ہوتا ہے تو اس خصوصیت کو سائبیریا کے برفیلے میدان اور غیر آباد برفیلے صحرا چیلنج نہیں کر سکتے۔ لیکن اس کی یہی یکتائیت تاریخ عالم کے ایک طویل دور میں اس سر زمین کی لازوال دولتوں سے اقصائے عالم کی کم علمی اور سود مہری کا بھی سبب رہی جس سے اہل کوریا نے کم مگر اس کے تینوں طاقتور پڑوسیوں نے زیادہ فائدہ اٹھایا ، حتیٰ کہ دوسری عالمگیر جنگ کے دوران جب اسٹالن نے جاپان کے خلاف کوریا کے اعلان جنگ کی قیمت وصول کرنے کے لیے کوریا کے حصے بخرے کرنے چاہیے تو یہ کوشش دراصل روس کی صدیوں پرانی اس خواہش ہی کا نتیجہ تھی کہ بحرالکاہل تک پہنچنے کے لیے سال کے تمام حصوں میں برف سے آزاد ان قدرتی بندرگاہوں پر قبضہ ناگزیر ہے جو کوریا کے ساحل پر سیکڑوں کے

حساب سے پھیلی ہوئی ہیں اور جن سے صرف اسی صورت میں استفادہ کیا جا سکتا ہے کہ کوریا کی سرزمین اس کے یا اس کے حاشیہ برداروں کے قبضۂ قدرت میں آ جائے۔ اور امریکیوں نے اس حسین و جمیل خطۂ ارضی سے ناواقفیت ہی کی بنا پر ملک کی تقسیم کی اس دوسری تجویز کو بغیر کسی رد و قدح کے تسلیم کر لیا جس کا بعد میں اسے بھی اہل کوریا کی طرح زبردست خمیازہ بھگتنا پڑا۔

دنیا کی بڑی طاقتوں میں صرف چین ہی نے کوریا کی اس تقسیم کی مخالفت کی اور عالمی سطح پر چینی قائدین نے اس بات پر اہمیت کے ساتھ زور دیا کہ کوریا کو ایک آزاد ملک کی حیثیت سے زندہ رہنے کا حق دیا جائے اور روس، جاپان اور چین مل کر اس بفر اسٹیٹ کے قیام و استحکام کی ضمانت دیں۔ کوریا کے بارے میں چین کا یہ نقطۂ نظر کسی سطحی اندازِ فکر کی غمازی نہیں کرتا بلکہ چین نے اس وقت بھی جب وہ صدیوں تک دنیا کی سب سے بڑی طاقت بنا رہا، کوریا کی آزادی کی حمایت کی اور اس نے تاریخ عالم کے طویل دور میں اہل کوریا کی آزادئ فکر و عمل کو برقرار بھی رکھا، جس کی قیمت اہل کوریا نے چین کی نیم بالادستی تسلیم کرنے کی صورت میں ادا کی۔ کوریا سے اس نوع کا خراج حاصل کرنے کے باوجود چینی حکمرانوں نے اپنے عوام الناس میں سے کسی ایک کو بھی کوریا میں آباد ہونے یا اراضی حاصل کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اس کے بعد جب خود چین کی مرکزی قیادت زوال سے ہم آغوش ہوئی تو وہ خود اپنے ملک کی آزادی اور بقا کی حفاظت کی ذمہ داری تک نہیں ادا کر سکی چہ جائیکہ وہ نقاہت و ضعف کے اس عالم میں کوریا کی آزادی اور بقا کی حفاظت کی ذمہ داریوں سے بھی عہدہ برآ ہوتی اور اسے جدید جاپان کی توسیع پسندی اور بے چین روس کی ہوس اقتدار سے بچانے میں کامیابی حاصل کرتی۔

تاریخی پس منظر

محلِ وقوع کی اہمیت کے اعتبار سے اور دنیا کی تین عظیم طاقتوں کے درمیان واقع ہونے کی بنا پر کوریا کو اپنی آزادی کی برقراری اور بحالی کے لیے بیش از بیش قربانیاں تو ضرور دینی پڑیں اور انہیں

تاریخ کے ہر موڑ پر انسانی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے اپنی حریت فکر و عمل کو ہر قسم کے بیرونی قدغن سے آزاد بھی رکھنا پڑا، بہ ایں ہمہ اہل کوریا بنیادی طور پر امن پسند اور امن جُو رہے ہیں اور ان کی یہی امن پسندی انہیں دنیا کے دور دراز مقامات سے کھینچ کر کوریا لائی بھی تھی۔ مگر اس سرزمین امن و سکون میں بھی جس کے تین طرف سمندر اور ایک طرف ناقابل عبور پہاڑی سلسلے تھے انہیں وہ آرام و اطمینان میسر نہیں آیا جس کی تلاش میں وہ یہاں آئے تھے۔

کوریا کے اصل باشندے چار ہزار سال قبل وسط ایشیا میں آباد تھے اور مختلف قبائل میں منقسم تھے۔ لیکن ان سب کی حیثیت خانہ بدوشوں کی سی تھی جو تلاشِ معاش و خوراک میں اِدھر اُدھر مارے مارے پھرتے رہتے تھے۔

ان میں سے جن خانہ بدوشوں نے سرزمینِ چین کا رُخ اختیار کیا اور اس ملک میں جا کر آباد ہوئے وہ ہن قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ چین پر تسلط قائم کرنے کے وقت ان کے سردار کا نام چین تھا اس لیے اس نئے ملک کا نام بھی چین پڑ گیا۔ وسط ایشیا کے خانہ بدوش قبائل میں سے جن قبیلوں نے شمال کا رخ اختیار کیا وہ تنگو کہلاتے تھے۔ ان میں سے بھی پیاؤ قبیلہ کے افراد ایک ایسے علاقے میں آباد ہوئے جو اب منچوریا کہلاتا ہے۔ یہ قبیلہ بنیادی طور پر کھیتی باڑی میں مشغول تھا اور اگر اسے سکون کے ساتھ زندگی گزارنے کا موقع حاصل رہتا تو اسے منچوریا سے راہِ فرار اختیار کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی مگر چونکہ منچوریا کے مغرب میں ہن قبائل آباد تھے جو خاصے شوریدہ سر بھی تھے اور خوں خوار بھی، اور یہ وہ ہن قبائل ہیں جو منگول نسل کے آباواجداد کہے اور سمجھے جاتے ہیں، اس لیے ان جھگڑالو قبائل نے پیاؤ قبیلے کے پُرامن عناصر کی زندگی اجیرن کر دی۔ پھر اس قبیلے کے مشرق میں بھی یٹ بیٹ قبائل کی آبادیاں تھیں جو نیوچن یا منچورین قبیلوں کے آباواجداد تھے اور یہ بھی شوریدہ سری اور خون خواری میں اپنی مثال نہیں رکھتے تھے، اس لیے پیاؤ قبیلے کے افراد کو، جو ان دو شوریدہ سر قبیلوں کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ مہذب تھے نقلِ مکانی پر مجبور ہونا پڑا اور یہ لوگ رفتہ رفتہ ہٹتے ہٹتے جزیرہ نمائے کوریا میں پناہ

اختیار کرنے پر مجبور بنائے جاتے رہے - یہ علاقہ ، جیسا کہ اوپر مذکور ہو چکا ہے ، تین طرف سمندر اور ایک جانب اونچے پہاڑوں سے گھرا ہوا تھا اس لیے انہیں یہ سر زمینِ عافیت بے حد راس آئی اور پیاؤ قبیلے کے افراد نے یہاں امن و سکون کے ماحول میں ایک ایسی جاندار تہذیب کی بنیادیں استوار کیں جو فنونِ لطیفہ اور فنونِ حربیہ میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔

مقدّس روایات

بنیادی طور پر پیاؤ قبیلے کے افراد ، وسط ایشیا ہی سے تعلق رکھتے ہیں اور اُس نسلِ انسانی سے متعلق ہیں کہ جو منگولیا ،چین اور وسط ایشیا کے اکثر علاقوں پر اب بھی حکمراں ہیں۔لیکن چونکہ یہ قبائل نسبتاً زیادہ مہذب اور نسبتاً زیادہ ترقی یافتہ معاشرے کے بانی تھے اس لیے بعض کہاوتوں اور داستانوں کے مطابق ، جنھیں کوریا میں مقدس مذہبی روایات کا درجہ حاصل ہے ، اس قبیلے کو آسمانی مخلوق کا درجہ حاصل ہے ، اور پیاؤ کے بارے میں تو یہ بات تک مشہور ہے کہ وہ مالکِ ارض و سماں یعنی خداوند قدوس کی اولاد میں تھا اور اسے آسمانوں سے زمین پر نازل کیا گیا اور وہ مشترکہ طور پر ریچھ اور شیر کے نسلی تعلق کے نتیجے میں پیدا ہوا۔ اور اسے محض اس لیے پیدا کیا گیا کہ وہ نسلِ انسانی کو تباہی و بربادی کے چنگل سے نکالے۔پیاؤ نے اپنے آسمانی باپ کی مدد سے زمین پر رحم اور انصاف کے تقاضوں کے مطابق حکومت کی اور اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان رابطہ کا کام سر انجام دیا۔اس کے انتقال کے بعد تین گن نے اس کی جگہ لی جو اہل کوریا کا مورثِ اعلا تھا۔اس کا ایک اور نام چاڑسن بھی تھا جس کے لغوی معنٰی سکون سحر کی سرزمین کے بھی ہوتے ہیں۔ میں نے اپنی دلچسپی کی بنا پر جب مزید تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ تین گن کا نام تین گل سے نکلا ہے ، جس کے معنی عرف عام میں طبیب کے ہیں۔

قرائن یہ بتاتے ہیں کہ تین گن کے زمانہ میں مملکت کوریا کو ایک مذہبی مملکت کی حیثیت حاصل تھی۔یہ ایک حقیقت ہے کہ کوریا کی مملکت کا نقطۂ آغاز دو ہزار تین سو تنتیس سال قبل مسیح سے

اور اس تاریخ کو ماہرین طبیعیات اور مورخین نے ، اس امر کے باوجود کہ اس بارے میں موجودہ حقائق بے حد تشنہ ہیں، تسلیم کر لیا ہے۔ اور اس ضمن میں اگر کسی قسم کی کوئی شہادت موجود ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ قدیم چینی ریکوڈ میں جو حضرتِ مسیح کی پیدائش سے دو تین ہزار سال پرانا ہے ، چاؤسن کا ذکر آیا ہے۔

حریّت فکر

حالات بتاتے ہیں کہ کوریا کے ان ابتدائی باشندوں کو ان کے تمام پُر امن طرز فکر و حیات کے باوجود امن میسر نہیں آسکا۔ شمالی چین کے ۷ طاقتور گروہ ایسے تھے جو کوریا کو اپنا دست نگر اور اسے اپنے زیر نگیں بنانا چاہتے تھے۔ ان میں سے ین گروپ نے چاؤسن پر حملہ کیا لیکن اس حملہ کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ چاؤسن کوریا پر ہی نہیں خود شمالی چین کے بھی ایک وسیع علاقے پر اثر رکھتا تھا۔ ان گروہوں کے مابین مبارزت کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ بالآخر ین گروپ نے دوسرے تمام گروہوں کو ہرا کر ، ۲۲۱ سال قبل مسیح میں پورے چین کو متحد کر لیا۔ مگر چن دورِ حکومت میں لڑائی کا جو سلسلہ جاری تھا وہ ین خاندان کے دورِ حکومت میں بھی جاری رہا جو چن خاندان کے بعد ، چین میں برسر اقتدار آیا تھا اور گو ان لڑائیوں کا دائرہ کوریا تک محیط رہا مگر اس عظیم ملک کے بہادر عوام نے چینی بالادستی کو قبول نہیں کیا اور آخرکار چینیوں کو کوریا سے راہِ فرار اختیار کرنی پڑی۔

پرانی سلطنتیں

کوریا بھی اپنے عوام کی بے مثال شجاعت کے باوجود اپنی تاریخ کے مختلف ادوار میں تین مختلف سلطنتوں میں منقسم رہا۔ یہ کوگیارو ، پیے کیچے اور سلا کی مملکتیں تھیں جو چینیوں کو کوریا سے نکالنے کے بارے میں تو متفق الرائے اور متحد الخیال تھیں لیکن جو چینیوں کے کوریا سے اخراج کے بعد پھر آپس میں دست و گریباں نظر آتی ہیں۔ اب کیفیت یہ تھی کہ سلا اور کوگیارو کی مملکتوں نے مل کر پیے کیچے کی مملکت پر دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ اور چونکہ یہ تیسری

مملکت کوریا کے جنوبی علاقے میں واقع تھی اس لیے اس نے حفاظتِ خود اختیاری میں اپنے پڑوسی جاپان سے اتحاد کر لیا اور اس طرح جزیرہ نمائے کوریا چینی اور جاپانی حلقہ ہائے اثر میں تقسیم ہوگیا۔ سلا کی حکومت نے پہلے تو پیے کیچے کی مملکت کو فتح کیا اور اس کے چند سال بعد اس نے کوگیارو کو بھی زیر نگیں کر لیا۔ اس نے یہ بالادستی چین کی فوجی امداد سے حاصل کی۔ یہاں اس وقت تیانگ خاندان حکمراں تھا۔ عمیق مطالعۂ تاریخ رہنمائی کرتا ہے کہ سلا کی مملکت کی، دوسری دونوں کوریائی مملکتوں پر بالادستی کے بعد ہی کوریا کے عظیم تمدن اور ثقافت نے جنم لینا شروع کیا جو دراصل کوریائی عوام کے اتحاد کا منطقی نتیجہ تھا۔ کوریا کا یہ دورِ کامرانی و خوشحالی مسلسل دو سو تیس سال تک برقرار رہا اور چین کے تیانگ خاندان کے سرگرم تعاون و اشتراک سے، جسے چین کا بھی سنہری دور کہا جا سکتا ہے، کوریا میں فنونِ لطیفہ نے بے مثال ترقی کی۔ مگر جیسا کہ دنیا میں تمام حکمراں خاندانوں کا حشر ہوا ہے سلا خاندان کا دور اقتدار بھی آخر کار زوال سے ہم آہنگ ہونا شروع ہوا، کیونکہ ملک کے حکمراں طبقے نے عوام کی خوشحالی اور فارغ البالی سے غفلت برتی، اور خود ان کی ثقافت اور ان کا ادب و فن جس کی چمک دمک نگاہوں کو خیرہ کیے دیتی تھی، نسبتاً کم خوش قسمت لوگوں کے دل کی دھڑکن بنتا چلا گیا۔ ان تمام باتوں کا جو نتیجہ نکلنا تھا بعینہٖ وہی آگے چل کو نکلا اور سلا حکمرانوں کے خلاف بغاوتوں کا سلسلہ شروع ہوا جن کا نقطۂ آغاز شمالی کوریا کا وہ علاقہ بنا جہاں سلا حکومت کا اثر مرکز سے بُعد اور دوری کے باعث سب سے کم سمجھا جاتا تھا۔ بعد میں وہ تمام عناصر بھی ان بغاوتوں میں شامل اور شریک ہو گئے جو سلا حکمرانوں سے غیرمطمئن تھے اور ان کی قیادت ملک کی ایک عظیم شخصیت وانگ گوئن نے سنبھالی۔ جب ان بغاوتوں نے کامیابی حاصل کی تو کوریو خاندان کے دورِ حکمرانی کا آغاز ہوا جو کوریا کی دوسری متحدہ اور مشترکہ سلطنت کے قیام کا باعث بنا۔ اس خاندان کا مرکزِ اقتدار شمالی کوریا تھا۔ نئے حکمرانوں نے سلا پر حملہ کرنے سے گریز کیا اور اس بات کا انتظار کرنے لگے کہ یہ زوال پذیر خاندان کب اپنے اقتدار کے نقطۂ

اختتام کو پہنچتا ہے۔آخر کار ۹۳۵ء میں سلا باد شاہ نے از خود نئے حکمراں خاندان کو اقتدار حوالے کو دیا ۔اور اس طرح کوریو خاندان کے باقاعدہ دور حکومت کا آغاز ہوا۔اور اس خاندان کی مناسبت سے خود ملک کا نام بھی کوریا پڑ گیا۔کوریو خاندان نے حسب توقع نت نئی اصلاحات سے اپنے دور حکمرانی کا آغاز کیا اور سب سے پہلے سول سروس کا ڈھانچہ نہ صرف زندہ کیا گیا بلکہ اسے از سر نو مرتب بھی کیا گیا اور اس سلسلے میں نئی اصلاحات بھی لائی گئیں۔ زمین کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا اور ہر کسان کو زندگی بھر کے لیے ، ایک قطعۂ اراضی دے دیا گیا۔سماجی تحفظات کا نظام رائج کیا گیا اور عام زندگی کی سہولتیں بہم پہنچائی گئیں۔کتابوں کی طباعت و اشاعت کے لیے سب سے پہلے ٹائپ کا رواج شروع ہوا۔ اور یہ کام ۱۲۳۰ء کے لگ بھگ شروع ہوا جبکہ جرمنی میں ٹائپ کے رواج کو ابھی ۲۲۰ برس باقی تھے۔جرمنی میں گوئتین برگ لیڈ کاسٹ

پرنٹنگ ٹائپ (Gutenberg's lead cast printing type)

۱۲۵۰ء میں شروع ہوا تھا۔ اس اعتبار سے پرنٹنگ کے شعبے میں کوریا کو جرمنی پر ہر حیثیت سے سبقت حاصل ہے۔اور کوریا ہی کو اس بات کا فخر بھی حاصل ہے کہ یہاں " سی خاندان "کے دورِ حکومت میں ، جو کوریو دور حکومت کے بعد معرضِ وجود آیا ، تانبے کے ٹائپ کا رواج ہوا ، عرف عام میں " سی پرنٹنگ ٹائپ" کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے اور کوریا کے اسی تانبے کے ٹائپ کا بعد میں چین کے اندر بھی رواج ہوا۔

بدھ مت

لیکن کوریو دورِ حکومت کا صرف یہی ایک کارنامہ ہی قابل ذکر نہیں ہے ، اس دور حکومت میں بدھ مت کے تمام مواد اور ضروری معلومات کو بھی جمع کیا گیا۔انھیں ان گریونگ (Engravings) کے ذریعہ سے محفوظ کیا گیا بلکہ " تری بتاکا "کے نام سے شائع کر کے بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا گیا۔اس کارنامے کا پس منظر یہ ہے کہ جب تیرھویں صدی عیسوی میں منگولوں کی یلغار شروع ہوئی تو بدھ مت کے ماننے والوں کو اپنے مذہبی لٹریچر کو

محفوظ کرنے کا خیال دامن گیر ہوا ، اس لیے کہ ان کے خیال میں اگر ایسا نہیں کیا گیا تو عین ممکن ہے کہ دنیا سے بدھ مت کے مذہبی لٹریچر کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے۔ اس مقصد کے تحت بدمت مذہب کے اسکالر کوریا میں جمع ہوئے اور انھوں نے ۱۲ سال کی مسلسل عرق ریزی کے بعد اپنے سب سے قیمتی مذہبی مواد کو جمع کیا جو تین لاکھ ۲۰ ہزار صفحات پر محیط ہے۔اس عظیم علمی ذخیرے کا نام تیجانگ کیانگ (Taijang Kyang) ہے جو کوریا کے صوبے کیانگ سانگ کے ماونٹ کےیا پر واقع ایک ہال ان سا نامی ٹیمپل میں تمام و کمال محفوظ ہے۔کوریو خاندان نے گو کوریا پر ایک طویل مدت تک حکومت کی اور اس کے دور حکومت میں کوریا امن کی لذتوں سے بھی بہرہ ور ہوا اور اصلاحات سے بھی متمتع ہوا لیکن یہ خاندان بھی امتدادِ زمانہ کا شکار ہوا ، اور اس کی زوال پذیری کے باعث کوریا ایک بار پھر مصائب و آلام کا شکار ہوا۔کوریوخاندان کے دور حکومت کے آخری ایام میں جہاں ایک طرف عوام میں بےچینی اور اضطراب کی لہریں اٹھ رہی تھیں ، وہاں دوسری جانب منگولوں اور جاپانی قزاقوں کے حملوں نے بھی اہل ملک کا ناطقہ بند کو رکھا تھا۔خود جاپان بھی اس زمانے میں ایک انقلاب سے دو چار ہوا اور وہاں ساموریا (Samuria) اقتدار ہی کا خاتمہ نہیں ہوا بلکہ اس طبقہ کو روزگار اور معاش سے بھی محروم کر دیا گیا۔اس کے ساتھ ساتھ اس زمانے میں جاپان معاشی کساد بازاری کا بھی شکار ہوا جس سے جاپانی عوام کی خوشحالی بھی بری طرح متاثر ہوئی ،اور اس کے نتیجے میں بہت سے جاپانی گروہ لوٹ مار اور اس قسم کی دوسری خرافات میں پڑ گئے اور ان جاپانی قزاقوں اور لٹیروں نے کوریا پر بھی حملے شروع کر دیئے اور کوریا کی کوئی بندرگاہ اور کوئی جہاز ایسا نہیں جو ان اچانک جاپانی حملوں اور لوٹ مار کا شکار نہ بنا ہو۔ دوسری جانب خود کوریا میں بدھ مت کے راہبوں کی طاقت میں بھی اس حد تک اضافہ ہو چکا تھا کہ وہ اپنے عوام کی معاشی زندگی کو تباہ کرنے پر تل گئے اور ان کا زور اتنا بڑھا کہ خود بادشاہِ وقت کو اقتدار کی مسند سنبھالنے سے قبل ایک بدھ راہب کا رول ادا کرنے کے لیے مجبور ہونا پڑتا تھا۔

بدھ اقتدار کی گرفت صرف اس حد تک مضبوط نہیں تھی بلکہ ہر خاندان کے کم سے کم ایک فرد کے لیے بدھ راھب بننے کی شرط بھی عائد کی جا چکی تھی۔ اور ان کی طاقت کوریو دورِ حکومت کے آخری ایام میں اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ آخری کوریو حکمراں کو چین پر حملہ کرنے کے لیے بھی مجبور کیا جانے لگا جہاں اس وقت منگ خاندان کی حکومت تھی، اور یہ خاندان اپنے عروج کی انتہائی حدوں کو چھو رہا تھا۔ بادشاہ کے حکم سے جنول سی کو چین پر حملہ کرنے کا حکم دیا گیا جس نے اسے احمقانہ سمجھتے ہوئے ماننے سے انکار کر دیا اور کوریائی عوام کے تعاون اور حمایت سے اس نے خود اپنے بادشاہ کا تختہ الٹ دیا اور اس طرح کوریا کے تیسرے شاہی خاندان کے آغازِ حکومت کا سنگِ بنیاد رکھ دیا گیا۔

شاہی خاندان

سی خاندان نے بھی، جو کوریا کا آخری شاہی خاندان تھا، اپنے اقتدار کا آغاز اصلاحات سے کیا۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ کوریا کا نیا رسم الخط ہے اور نئے حروف ہیں۔ یہ کام اس خاندان کے ایک عظیم بادشاہ سجانگ (Sejong) کے زمانے میں سر انجام پایا۔ اس نئے خاندان نے اپنے اقتدار کی بنیاد چینی فلسفی کنفیوشس کے اصولوں پر رکھی اور اس نے عوام کے معیارِ زندگی کو بلند و بہتر بنانے پر اپنی تمام تر توجہ مرکوز کر دی جس کے بہت جلد مثبت اثرات ظاہر ہونے شروع ہو گئے۔ شاہ سجانگ نے اپنے عوام سے براہ راست رابطہ کو بھی اپنا طرز حکومت بنایا اور اس کے دورِ حکومت میں مملکت کے ہر شہری کو بادشاہ سے براہ راست مخاطبت کا بھی حق حاصل تھا جس کی وجہ سے اسے امور مملکت کی سرانجام دہی میں عوام کی جانب سے بہت سی مفید مطالب تجاویز موصول ہوئیں اور اس کی نافذ کردہ اصلاحات میں ان تجاویز کی کافی حد تک جھلک ملتی ہے۔ سجانگ رائج الوقت زبان کی مشکلات سے بھی آگاہ تھا اور اسے اس بات کا بھی یقینِ کامل تھا کہ یہ زبان کوریائی عوام کی امنگوں اور ترقی کی کوششوں سے کوئی مطابقت نہیں رکھتی۔

چنانچہ اس نے سب سے پہلے اس زبان کے رسم الخط کو آسان اور عام فہم بنانے کی ضرورت پر توجہ کی اور اپنی زبان کو چینی اثرات سے آزاد کرنے کے لیے ملک کے بہترین دماغوں سے مدد لی جس کے نتیجہ میں کوریائی زبان کے نئے حروف تیار کیے گئے جو صرف ۲۴ حرفوں پر مشتمل ہیں اور ان کی وجہ سے کوریائی زبان کا شمار دنیا کی آسان ترین زبانوں میں کیا جانے لگا ہے۔ ہر چند کہ نیا رسم الخط صرف ۲۴ حرفوں پر مشتمل ہے مگر شاہ سجانگ اور ان کے اہلِ علم معاونین نے، دوسری زبانوں کے رسم تحریر سے استفادہ کرتے ہوئے، حرفوں کو اس انداز میں تخلیق کیا ہے کہ ان کی مدد سے ہر بولنے والے لفظ کو صحیح تلفظ اور مخرج کے ساتھ ادا کیا جا سکتا ہے۔ سی خاندان کے دور حکومت میں کوریا نے گو بڑی ترقی کی مگر جیسا کہ کوریا کی چار ہزار سالہ تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے، کوریا کے عوام کو ان کی خواہشِ امن کے باوجود، پُر امن طور پر زندگی گزارنے کا مشکل ہی سے موقع مل سکا اور اس کے تینوں بڑے پڑوسیوں میں سے کوئی نہ کوئی ضرور اس کے امن و سکون کو تباہ و برباد کرنے کا کسی نہ کسی عالم میں ضرور سبب بنتا رہا، اور سی خاندان کا دورِ حکومت بھی، اس بیرونی مداخلت سے کلیۃً آزاد نہیں رہ سکا۔ ایک طرف تو کیفیت یہ تھی کہ سی خاندان کے اقتدار میں آنے کے بعد کوریا میں فارغ البالی کا دور دورہ تھا، فنونِ لطیفہ ترقی پذیر تھے، ثقافت و ادب کی دنیا میں چار چاند لگ رہے تھے تو دوسری جانب جاپان بھی ایک عظیم فوجی طاقت کا روپ دھار رہا تھا اور ایک عظیم جاپانی قائد ہدے یوشی ٹریوٹومی (Hideyoshi Toyotomi) کی اس ضمن میں کوششوں کے نہایت زور دار نتائج برآمد ہو رہے تھے۔ ہدے یوشی ٹویوٹومی ایک کسان گھرانے میں پیدا ہوا، نیم تعلیم یافتہ تھا، مگر اس کے مزاج میں تکبّر تھا اور ہوسِ اقتدار کو بھی دخل حاصل تھا۔ بہ ایں ہمہ وہ دوسرے جاپانی جنگی سُورماؤں کو متحد کرنے اور پھر مختلف باغی عناصر کو اپنی قیادت کے پرچم تلے اکھٹا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے جب یہ دیکھا کہ کوریائی عوام نے اپنی فوجی قوت کو مجتمع کر کے جاپانی بحری قزاقوں کو اپنی بندرگاہوں اور ساحلی علاقوں سے مار بھگایا ہے اور ان بحری قزاقوں نے کوریا میں

مات کھانے کے بعد چینی بندرگاہوں کا رخ کیا ہے اور وہاں لوٹ مار میں کامیابی حاصل کی ہے تو اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ اگر کوریا کے ساحل پر فوجی اڈے بنائے جائیں تو پھر ان اڈوں سے چینی بندرگاہوں پر حملے کرنے میں اور زیادہ آسانی ہو جائے گی۔ چنانچہ وہ ایک روز شہنشاہِ جاپان کی خدمت میں پیش ہوا اور ان سے یہ عرض کیا کہ اگر وہ اپنی کوششوں سے چین کے کسی بڑے علاقے پر قبضہ کر لے تو وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ شہنشاہ معظم اسے اس خطہ کا وائسرائے بنا دیں۔ ظاہر ہے کہ شہنشاہِ جاپان اپنے اس مخلص خادم کی یہ درخواست کیسے رد کر سکتے تھے۔ ان کی اجازت اور اشیر باد سے ۱۵۹۲ء میں اس نے لکڑی کے جہازوں کا ایک جنگی بیڑہ تیار کر کے کوریا پر حملہ کیا اور اس کا دو لاکھ کا لشکر، جنوبی کوریا کے ساحل پر اتر کو شمال کی جانب پیش قدمی کرنے لگا۔ اہل کوریا اس غیر متوقع حملے کے لیے تیار نہیں تھے، پھر بھی انہوں نے بے جگری کے ساتھ حملہ آوروں کا مقابلہ کیا۔ دوسری جانب کوریا کے ایک امیرالبحر سی۔ سن شین نے لوہے کا پتر چڑھے ہوئے بحری جہاز تیار کیے جن میں جگہ جگہ جلتے ہوئے تیروں کو چلانے کے لیے خاص طور پر جگہیں بنائی گئی تھیں اور ان جہازوں کی شکل کچھوے کی مانند تھی۔ بلکہ انہیں ٹرٹل بوٹس Turtle boats کا بھی نام دیا گیا تھا اور یہ دنیا کی بحری تاریخ میں اپنی نوعیت کے پہلے جہاز تھے۔ امیرالبحر سی سن شین نے ان جہازوں کی مدد سے اپنائے کوریا میں جاپان کے لکڑی کے تقریباً تمام جہازوں کو غرق کر دیا اور جاپانی فوج کو نرغے میں لے لیا۔ اس اثنا میں اس عظیم امیرالبحر کا انتقال ہو گیا مگر اہل کوریا نے اس کی موت کا چرچا اس وقت تک عام نہیں ہونے دیا جب تک شکست جاپانیوں کا مقدر نہیں بن گئی۔ بہر حال سات سال کی طویل جنگ کے بعد کوریا میں جاپانیوں کا مکمل طور پر قلع قمع کر دیا گیا اور ان کی فوجی برتری کو اس درجہ زک پہنچائی گئی کہ گو جاپانیوں کے دل میں چین پر قبضے کا خیال بدستور برقرار رہا لیکن وہ کوریا پر صدیوں تک حملے کرنے کی پوزیشن میں پھر نہ آسکے۔

سی خاندان کی حکومت طویل بھی تھی اور شاندار بھی ۔ اس خاندان کے عروج کا آغاز چودھویں صدی عیسوی میں ہوا اور اس کا نقطۂ اختتام ۱۹۱۰ء میں ہوا کہ جب جاپان نے ایک بار پھر کوریا کو ایک باج گزار ملک بنا لیا۔ اس طویل دور حکومت کے باعث سی دور حکومت کو کوریا کا ترقی یافتہ دور بھی کہا جا سکتا ہے اور اس خاندان کے چوتھے بادشاہ سی جانگ کا تو کوریا کی طویل تاریخ میں کوئی ثانی پیدا ہی نہیں ہوسکا ۔ اسے کوریا کا لیونارڈو داونسی بھی کہا جاتا ہے ۔ اس نے اپنے پیچھے ملک میں اپنی اتنی یادگاریں چھوڑیں کہ جن کا شمار نہیں کیا جا سکتا ۔کوریا کے عوام ہمیشہ سے بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کے حامل رہے ہیں اور ان کی یہ خوبی ہنوز برقرار ہے مگر شاہ سی جانگ نے اپنے تیس سالہ دور حکومت میں وہ عظیم کارنامے سر انجام دیئے کہ وہ ہمیشہ کے لیے اپنے عوام میں امر ہو گئے ۔اس کی قیادت میں کوریا کی ثقافت نے غیر معمولی سربلندی اور سرفرازی پائی ، یہاں تک کہ سائنس کے شعبے میں بھی اہل کوریا نے بے مثال ترقی کی، خاص طور پر حساب اور نجوم کے شعبوں میں۔ اس کے زمانے میں پانی سے چلنے والی ایک ایسی گھڑی ایجاد ہوئی جس میں وقت بتانے کے ساتھ ساتھ موسموں کی تبدیلی اور چاند اور سورج کے طلوع و غروب کے اوقات کا بھی پتا لگایا جا سکتا تھا ۔ پھر اس کے زمانے میں بارش کی اطلاع اور پیشن گوئی کرنے والا ایک ایسا آلہ بھی دریافت ہوا تھا جس کی بنا پر فصلوں کی بوائی اور کٹائی کا پروگرام بنایا جاتا تھا ۔اس کے دور کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس کے زمانے میں علم طب سے متعلق جو معلومات مہیا ہوئیں ان کی بنیاد پر مڈیکل سائنس کی ایک انسائی کلو پیڈیا تیار کی گئی تھی جس کا نام وی بانگ یوجب (Vibang Yujup) ہے ، یہ انسائی کلو پیڈیا تین سو پینسٹھ جلدوں پر مشتمل ہے اور اس کی تکمیل ۱۲۲۵ء میں ہوئی تھی۔ یہ اتنی عظیم تصنیف ہے کہ خود چینی ماہرین نے اس کی مدد سے چینی طب سے متعلق اپنی انسائی کلو پیڈیا کو مکمل کیا ، اس لیے کہ چینی مڈیکل انسائی کلوپیڈیا کا خاصا مواد چینی جاپانی جنگ کے دوران ضائع ہو گیا تھا ۔

شاہ سی جانگ

شاہ سی جانگ نے کوریائی موسیقی کو بھی ایک نیا آہنگ اور گداز بخشا اور اس نے اپنے دور کے ایک ماہر موسیقار پاک یان (Pak Yan) کی خدمات سے اس ضمن میں کماحقہ استفادہ کیا۔ آج بھی جو خوش قسمت افراد کوریا کا دورہ کرنے اور وہاں کے حالات کا بہ نفسِ نفیس مشاہدہ کرنے کی توفیق حاصل کرتے ہیں وہ اس بات کی گواہی دیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اہل کوریا فنونِ لطیفہ میں بالعموم اور فنِ موسیقی میں بالخصوص کماحقہ ادراک رکھتے ہیں۔ غالباً اس کا محرک یہ ہے کہ کنفیوشس نے موسیقی میں نظم و ضبط کی جس ضرورت پر زور دیا ہے اور اس کے ڈانڈے انسانی ضابطۂ اخلاق سے جا ملائے ہیں اس سے شاہ سی جانگ نے پورے طور پر استفادہ کیا ہے۔ اس نے موسیقی سے متعلق نہ صرف متعدد تصانیف کی اشاعت کا اہتمام کیا بلکہ خود درباری موسیقی کو بھی نہایت دل نواز دھنوں اور الہامی نغموں سے مالا مال کیا۔ بہ ایں ہمہ شاہ سی جانگ نے کنفیوشس اور اس کے زمانے اور اس کی تعلیمات سے استفادہ کرنے کے باوجود بدھ مت کے فروغ اور اس کے احیا پر بھی کوئی پابندی نہیں لگائی اور اس کے دور حکومت میں بودھ علما نے سابقہ کوریو عہدِ سلطنت میں شائع ہونے والی مذہبی کتابوں میں نہ صرف مفید رد و بدل اور اضافات کیے بلکہ اپنی مذہبی کتابوں کا عام فہم زبانوں میں ترجمہ بھی کیا۔ اس طرح وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شاہی خاندان کی عظمت اور کارناموں میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس دورِ حکومت میں اہل کوریا پہلی بار مغربی افکار و نظریات سے بھی آشنا ہوئے اور اسی زمانے میں ان کی خداداد تخلیقی اور فکری صلاحیتوں نے جلا پائی۔ کیتھولک نظریۂ عیسائیت سب سے پہلے ۱۷ ویں صدی عیسوی میں کوریا پہنچا اور بعض فرانسیسی پادری اس زمانے میں سر زمین کوریا میں موت سے آشنا بھی کیے گئے۔ اسی زمانے میں بعض بیرونی ممالک کے مُلّاح اپنے جہازوں کی غرقابی کے بعد کوریا کے ساحل تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ مگر چونکہ کوریا کی چار ہزار سالہ تاریخ بیرونی اور خارجی

حملہ آوروں کی چیرہ دستیوں سے عبارت رہی ہے اسی لیے اہلِ کوریا نے جان بچا کر ساحلِ کوریا پر اترنے والے ان ملاحوں کا خوش دلی کے ساتھ خیر مقدم نہیں کیا اور اسے اپنی روایتی علحدگی کے اصولوں اور پالیس سے ہم آہنگ نہیں پایا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اقوامِ عالم سے الگ تھلگ رہنے کا یہ دیرینہ جذبہ اہل کوریا کو راس نہیں آیا اور مغربی توسیع پسندی نے پرانی ایشیائی اقوام کی زندگی میں آخر کار ایک تموج اور خلا پیدا کر دیا۔ اس یلغار سے اہل کوریا بھی زیادہ عرصے تک محفوظ نہ رہ سکے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب پرتگال اور اسپین نے جاپان پر تجارتی ڈورے ڈال رکھے تھے اور بحر زرد میں غرقاب ہونے والے پرتگالی اور اسپانوی جہازوں کے ملاح کوریا کے جنوبی سواحل میں واقع جزائر تک پہنچنے میں کامیاب ہو رہے تھے۔ اس دور میں کوریا، صرف جاپان اور مغربی توسیع پسندی ہی کی یلغار کا سامنا نہیں کر رہا تھا بلکہ اسے شمال میں روسی توسیع پسندی کے خطرات کا بھی سامنا تھا۔ ۱۷ویں صدی کے وسط میں روس کی ایک فوجی رجمنٹ دریائے امور کے ساتھ ساتھ پیش قدمی کرتی ہوئی کوریا کے قریب منچوریا میں چینی فوجوں سے برسرِپیکار ہوئی اور کوریا کے سرکاری ریکرڈ کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ ۱۲۳۵ء میں ایک عجیب و غریب نسل کے ۳۶ افراد، جن کی آنکھیں نیلی اور بال زرد تھے اور جن کی ناکیں لمبی اور نوکیلی تھیں، اپنے تباہ شدہ جہاز سے ساحل کوریا تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ یہ ملاح دراصل ہالینڈ کے ڈچ باشندے تھے جنہیں ساحل سمندر سے دارالحکومت سیول لے جایا گیا۔ یہاں پہنچنے کے بعد وہ فوج میں بھرتی ہو گئے اور انھوں نے کوریا میں شادیاں کیں اور یہیں مستقل طور پر آباد ہو گئے۔ بعد میں ان میں سے ۸ افراد وطن واپس چلے گئے۔ ان میں سے ایک شخص ہینڈرک ہیملی نے کوریا میں اپنی زندگی کے واقعات کو کتابی شکل میں بیان کیا اور اس طرح یہ کتاب کوریا کے بارے میں پہلی مغربی کتاب کہی جا سکتی ہے۔

امریکی کردار اور جاپانی تسلّط

۱۸۶۰ء میں چین نے برطانیہ اور فرانس سے اپنے حقوق اور

اپنے ملک کو بچانے کے لیے جنگ کی جس کے نتیجے میں روس نے ان کے درمیان مصالحت کنندہ کا رول ادا کیا اور اس طرح جب یہ جنگ اختتام پذیر ہوئی تو روس نے مطالبہ کر کے بعض چینی ساحلی علاقے معاوضے میں حاصل کیے اور یوں کوریا کا انتہائی شمالی مشرقی علاقہ روس کی سرحد سے جا ملا جس کے بعد میں بہت سے تلخ نتائج برآمد ہوئے۔ اس زمانے میں یعنی ۱۸۶۶ء میں ایک امریکی جہاز جنرل شرمن نامی تائی دونگ دریا میں داخل ہوا اور اس طرح کوریا اور ریاست ہائے متحدہ امریکا کے درمیان سفارتی روابط قائم ہوئے۔ لیکن یہ تعلقات ہمیشہ ہی مدوجزر کا شکار ہے۔ ۱۸۸۳ء میں کوریا اور امریکا کے درمیان دوستی اور دوستانہ تجارتی روابط کا ایک سمجھوتہ ہوا جس میں اس بات کا بھی عہد کیا گیا تھا کہ اگر کوریا میں، بیرونی جارحیت کا ارتکاب کیا گیا تو امریکا کوریا کی مدد کو آئے گا۔ مگر امریکا نے اس معاہدے کو یکسر نظر انداز کر دیا اور جب اسے اس بات کا احساس ہوا کہ کوریا پر جاپان ہی کی نہیں روس کی بھی للچائی ہوئی نظریں پڑ رہی ہیں تو اس نے اس خیال سے کہ کوریا پر روسی قبضے کے مقابلے میں جاپان کا قبضہ امریکا کے بہتر مفاد میں رہے گا، ۱۹۰۵ء میں جاپان کے ساتھ ایک خفیہ معاہدہ کے ذریعہ سے کوریا کی قسمت جاپان کے حوالے کر دی۔ یہ معاہدہ ٹوکیو میں ہوا اور اس پر امریکا کی جانب سے وزیر جنگ ولیم ہاورڈ ٹاف نے ۲۹ جولائی ۱۹۰۵ء کو دستخط کیے اور اہل کوریا کی قسمت جاپان کے حوالے کر کے اس سے محض یہ مراعات حاصل کی کہ وہ فلپائن پر امریکی تسلط کے خلاف کوئی معاندانہ اقدام نہیں کرے گا۔ اس معاہدے کے فوراً بعد جاپان نے کوریا پر قبضہ کر لیا اور اس طرح چار ہزار سالہ یہ پرانی سر زمین، روس جاپان جنگ کے اختتام کے فوراً بعد ہی جاپانی توسیع پسندی کا شکار ہو گئی۔

کوریا کی شمالی و جنوبی تقسیم

کوریا کا جاپان میں باضابطہ طور پر ادغام اور انضمام ۲۲ اگست ۱۹۱۰ء کو ہوا اور اس جاپانی اقتدار سے کوریا کو اس وقت نجات ملی کہ جب امریکا نے جاپان کو دوسری عالمگیر جنگ میں ایٹمی

شکست دے کر جاپان کو کوریا سے ۱۹۴۵ء میں بے دخل کیا - امریکا کی مسلح افواج اس وقت کوریا میں داخل ہوئیں کہ جب روس اور اس کے مغربی اتحادیوں نے مملکت کوریا کو دو حصوں میں منقسم کر کے شمالی کوریا کے عوام کی قسمت روس کے حوالے کر دی اور ۳۸ عرض البلد کو شمالی اور جنوبی کوریا کے درمیان سرحد قرار دے کر کوریا کی تقسیم کو ایک حقیقت کا روپ دے دیا - جنوبی کوریا امریکی فوجوں کے آنے کے بعد بھی کئی ہفتے جاپانی گورنر جنرل اور جاپانی پولیس ہی کے زیر نگیں رہا جس نے اہل کوریا کو امریکی فوجوں کے استقبال تک کی اجازت نہیں دی اور جو کوریائی باشندے امریکیوں کے استقبال کے لیے پوسان کی بندرگاہ پہنچے، انھیں گولیوں سے بھون ڈالا گیا -

یہ جاپانی مظالم اہل کوریا کے جذبۂ حریت و آزادی کے آگے سدِ راہ نہ بن سکے اور انھوں نے ہر قربانی دے کر اپنے ملک کی وحدت اور یکجہتی کی بحالی کے لیے شدید جدوجہد کی لیکن کوریا کے روسی اور امریکی حکمراں، جنھوں نے اسے شمالی کوریا اور جنوبی کوریا میں تقسیم کر رکھا تھا، تقسیم کے باب میں متفق الرّائے تھے - چنانچہ ان دونوں نوزائیدہ ملکوں کے درمیان اب تک کسی قسم کی مفاہمت نہ ہو سکی اور دونوں نے مئی ۱۹۴۶ء میں اپنی ناکامی کا اعتراف کر لیا اور آخری کوریائی شاہی خاندان کی وہ حکومت جو ۱۳۹۲ء میں شروع ہو کر کسی نہ کسی شکل میں ۲۲ / اگست ۱۹۱۰ء تک قائم رہی تھی، اور جس نے کوریا کا اتحاد بحال اور برقرار رکھا تھا، ۳۵ سالہ جاپانی تسلط کے بعد جب دوبارہ آزاد ہوئی تو اب یہ دو واضح ملکوں میں بٹی ہوئی تھی، شمالی کوریا اور جنوبی کوریا - ان میں سے امریکی جنوبی کوریا میں اقوام متحدہ کی نگرانی میں ۱۰ / مئی ۱۹۴۸ء کو عام انتخاب کا انعقاد عمل میں آیا اور اس طرح معرضِ وجود میں آنے والی پارلیمنٹ نے ۱۷ / جولائی ۱۹۴۸ء کو ملک کا نیا آئین منظور کیا اور ۳۰ / جولائی کو ڈاکٹر سگمن ری کو ملک کا نیا صدر چُنا - اس کے بعد ۱۵ / اگست ۱۹۴۸ء کو اس حصۂ ملک پر سے امریکا کا قبضہ اٹھا لیا گیا اور ۱۵ / اگست ۱۹۴۸ء کو جمہوریہ کوریا قائم ہوئی -

تقسیم کے اثرات

دوسری جانب کوریا کے اس خصے پر جو امریکا کی کوریا میں آمد سے ایک ماہ قبل یعنی ۸ اگست ۱۹۴۵ء کو روس کے قبضۂ اقتدار میں چلا گیا جزوی طور پر ایک کمیونسٹ عارضی حکومت قائم کر دی گئی۔ اس کے بعد ملک میں کمیونسٹوں کے مختلف دھڑے، جن میں کورین کمیونسٹ پارٹی اور نیو نیشنل پارٹی شامل تھے، آپس میں مدغم ہوئے اور ۱۹۴۶ء میں اس ادغام کے نتیجے میں کورین ورکرز پارٹی قائم ہوئی۔ پھر یہ پارٹی بھی جولائی ۱۹۴۶ء میں دوسرے پرو کمیونسٹ حلقوں اور غیر پارٹی عناصر کے ادغام کے بعد یونائیٹڈ ڈیموکریٹک پیٹ ریاٹک فرنٹ میں شامل ہوگئی اور ۲۵ اگست ۱۹۴۸ء کو سپریم نیشنل اسمبلی کے انتخابات کے بعد ۹ ستمبر ۱۹۴۸ء کو ڈیماکریٹک ری پبلک اوف کوریا کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔ لیکن اس اسمبلی میں شمالی کوریا کے علاوہ جنوبی کوریا کے افراد کو بھی شامل کر کے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی کہ یہ ادارہ کوریا کے تمام عوام کا نمائندہ ادارہ ہے اور غالباً اسی انداز فکر کی بنا پر جنوبی کوریا کو بذریعہ طاقت حاصل کرنے کی بھی کوشش کی گئی اور شمالی کوریا کی فوجیں ۲۵ جون ۱۹۵۰ء کو جنوبی کوریا میں داخل ہو گئیں۔ اس روز اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل نے امریکا کی درخواست پر تمام ممبر ممالک سے اپیل کی کہ وہ ری پبلک اوف کوریا کی امداد کے لیے سینہ سپر ہو جائیں اور امریکی جنرل میک آرتھر کو کوریا میں اقوام متحدہ کی فوجوں کا کمانڈر انچیف بھی مقرر کر دیا۔ سیکورٹی کونسل کے اس اجلاس کا اگر روس کی جانب سے بائیکاٹ نہیں ہوتا تو یہ دونوں امریکی قرار دادیں ویٹو کی جا سکتی تھیں۔ لیکن امریکا نے روس کی عدم موجودگی سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے اقوام متحدہ کے نام کو خوب خوب استعمال کیا اور امریکی فوجیں اقوام متحدہ کا پرچم لہراتے ہوئے ۲۶ نومبر ۱۹۵۰ء تک پورا شمالی کوریا فتح کر کے منچوریا کی سرحد پر کھڑی تھیں اور جنرل میک آرتھر چین میں گھس جانے کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ لیکن جب امریکی افواج منچوریا کی سرحد پر پہنچیں تو پھر چینی فوجی دستے ٹڈی

دل کی طرح ان پر جھپٹے اور امریکی فوجوں کو دھکیلتے پوسان تک جا پہنچے۔ مگر یہاں ایک بار پھر جنرل میک آرتھر نے انتہائی فوجی قابلیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے جزیرہ نمائے کوریا کے اس مقام پر جہاں ملک کا زمینی فاصلہ سب سے کم ہے سمندر سے دونوں جانب فوجی اتار کر چینی فوجوں کی راہ فرار مسدود کر دی۔ تاریخ عالم میں اسے "انچون لینڈنگ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس صورت حال کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے فاتح چینی فوجوں نے اپنا تنظیمی نظام توڑ کر غیر منظم طور پر راہ فرار اختیار کی اور امریکی فوجیں ایک بار پھر بڑھتے بڑھتے اپریل ۱۹۵۱ء میں ۳۸ عرض البلد تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئیں اور اقوام متحدہ کی نگرانی میں ۲۳ جون ۱۹۵۱ء وسن سن جن کے قصبہ میں جو مصالحتی مذاکرات شروع ہوئے وہ ۲۷ جولائی ۱۹۵۳ کو کامیابی سے ہمکنار ہوئے اور یہ جنگ اپنے نقطۂ اختتام کو پہنچی۔ کہنے کو تو کوریا کی لڑائی میں ایک فریق شمالی کوریا اور چین تھا اور دوسرا فریق اقوام متحدہ تھی مگر امریکا نے سیکورٹی کونسل میں روس کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جو کھیل کھیلا تھا اس میں پراپیگنڈہ کی حد تک ضرور اقوام متحدہ ہی کا نام لیا جاتا رہا مگر اس لیبل اور پرچم کے تلے لڑائی امریکیوں ہی نے لڑی اور ایک محتاط اندازے کے مطابق اس چار سالہ جنگ میں اقوام متحدہ کی فوجوں میں امریکا کی فوجی نفری ۵۰ اعشاریہ ۳۲ فیصد تھی۔ مگر یہ فوجی نفری صرف زمینی فوج تک ہی محدود تھی۔ کوریا کی فضائی اور بحری معرکہ آرائیوں میں امریکا کا حصہ علی الترتیب ۹۳ اعشاریہ ۳۸ اور ۸۵ اعشاریہ ۸۹ تھا جبکہ بڑی، بحری اور فضائی جنگ میں جنوبی کوریا کا حصہ علی الترتیب ۴۰ اعشاریہ ۱۰ اور ۱۷ اعشاریہ ۳۵ فیصد اور ۵ اعشاریہ ۶۵ فیصد تھا اور باقی ماندہ حصہ اس جنگ میں اقوام متحدہ کے ان ۱۵ ارکان کا تھا جو اس کی اپیل پر کم اور امریکا کی تحریک پر زیادہ اس جنگ میں حصہ لینے کے لیے مجبور ہوئے تھے۔

ان دونوں کوریاؤں کا رقبہ ۸۵ ہزار ۲ سو ۷۷ مربع میل اور آبادی ۴ کروڑ ۷۵ لاکھ ۹۰ ہزار ہے۔ لیکن اگر شمالی اور جنوبی کوریا کو الگ الگ لیا جائے تو شمالی کوریا کا رقبہ ۴۷ ہزار ۲ سو ۲۵ مربع میل اور ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی ایک کروڑ

۲۳ لاکھ ۳۰ ہزار نفوس پر مشتمل ہے جبکہ جنوبی کوریا کا رقبہ ۳۸ ہزار ۲ سو ۵۲ مربع میل اور آبادی یکم اکتوبر ۱۹۷۰ء کے اعداد وشمار کے مطابق تین کروڑ ۱۲ لاکھ ۲۰ ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔

شمالی کوریا کا دارالحکومت پیونگ یانگ ہے جس کی آبادی ۱۵ لاکھ سے اوپر ہے اور جنوبی کوریا کا دارالحکومت سیول ہے جس کی آبادی ۵۵ لاکھ سے زیادہ ہے۔ بظاہر تو ان اعداد و شمار سے یہی پتہ چلتا ہے کہ شمالی کوریا کا رقبہ جنوبی کوریا سے زاید اور اس کی آبادی جنوبی کوریا کی آبادی سے کم ہے مگر اس تفریق کی بنیادی وجہ صرف موسمی تغیرات ہی کہے جا سکتے ہیں کہ شمالی کوریا نے اپنے صدر کم ال سنگ کی قیادت میں جو ترقی کی ہے وہ بے مثال ہے اور وہاں جو سیاسی استحکام پایا جاتا ہے اس کا کوئی انداز بھی جنوبی کوریا میں نہیں ملتا۔ شمالی کوریا کو امریکی تسلط کے دوران زبردست نقصان پہنچا تھا اور اس کا دارالحکومت پیونگ یانگ شدید و کثیر امریکی بمباری سے بالکل تباہ ہو گیا تھا مگر کامریڈ کم ال سنگ کی قیادت میں یہ شہر نہ صرف دوبارہ تعمیر ہوا بلکہ اس کی تعمیرِ جدید نے اس کے حسن میں اور بھی زیادہ اضافہ کر دیا ہے۔

شمالی کوریا

یہ پورا ملک گیارہ انتظامی یونٹوں میں منقسم ہے۔ جس میں سے دو یونٹ پیونگ یانگ اور کے سانگ کے شہروں پر مشتمل ہیں اور باقی ۹ یونٹوں کا تعلق ۹ صوبوں سے ہے۔ شمالی کوریا کے پاس دو بہترین بندرگاہیں بھی ہیں۔ ایک کا نام "چنگ جن" ہے جس کی آبادی دو لاکھ افراد پر مشتمل ہے اور دوسرے کا نام "ہیونگ نام" ہے جس میں $1\frac{1}{2}$ لاکھ افراد آباد ہیں۔

۱۲ - اپریل ۱۹۸۲ء ، بدھ ، پیونگ یانگ ، شمالی کوریا

نُور کا تڑکا کب ہوا، پتہ نہ چلا - یہاں کے لیل و نہار کیا ہیں، کوئی علم نہیں ہے - طلوع و غروب کا صحیح اندازہ نہیں ہے - نماز فجر شاید صحیح رخ پر اور صحیح وقت پر ادا کر لی ہے - میرے جاپانی قبلہ نما میں کوریا کا کوئی ذکر نہیں ہے ، اس لیے میں نے بیجنگ کے نمبر پر قبلے کا تعین کر لیا ہے اور سوچ لیا ہے کہ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيمٌ (البقرہ ــ ۱۱۵) کے یہ کورین قائل نہیں - ان کا خدا اور قبلہ عظیم رہنما کم ال سنگ ہیں جن پر ان کو یقین ہے اور ایمان بھی - شاید ایمانِ کامل ! میں نمازِ فجر ادا کر کے یہ غور کرتا رہا کہ اللہ تعالیٰ پر میرا ایمان پختہ ہے یا ایک کوریائی کا صدر کم ال سنگ پر ؟ میری پاکستانی ملّت کا اللہ تعالیٰ پر یقین کامل ہے یا کوریا کے لوگوں کا کم ال سنگ پر؟ اور خُود کم ال سنگ صاحب کا قبلہ کیا ہے ؟ چین یا روس ، یا آسمان ؟ منزل اِن کی بہر حال متعیّن ہے یعنی دونوں کوریاؤں کا اتحاد !

تقریبات سہ روزہ

آج صبح ان ۳ سہ روزہ تقریبات کا آغاز ہو گیا کہ جو "گریٹ لیڈر کم ال سنگ" کے جشن یوم ولادت (۱۵ / اپریل ۱۹۱۲) کے ذیل میں ہو رہی ہیں اور جن میں شرکت کے لیے متعدد ممالک کے سربراہان اور سرکردہ سیاسی و علمی شخصیات مدعو ہیں - میرا شمار جشن کے مدعوئین میں نہیں ہے کہ میں طب و صحت کے میدان میں شمالی کوریا کی پیش رفتوں کا مطالعہ کرنے آیا ہوں اور وزیر صحت شمالی کوریا کے ذریعہ سے حکومت کا مہمان ہوں ، مگر عین ان ہی دنوں آیا ہوں اس لیے میرے حسب منشا ان تقریباتِ سہ روزہ میں بھی شریک کر لیا گیا ہوں - کل شب ہوائی میدان پر استقبال میرا اسی انداز سے ہوا مگر کوریا ٹیلے وژن نے جب وہ مہمانانِ گرامی کی آمد کے مناظر دکھا رہا تھا اس نے سعدیہ اور میرے استقبال کو حذف کر دیا - میں ان کی فہم وفراست اور ان کی دانائی اور انسان

شناسی کا قائل ہو گیا۔ ان کی فہرست میں میرا شمار بہ حیثیت مدعوئینِ جشن نہ تھا، اس لیے انھوں نے ایڈٹ کرتے وقت اپنے فرائض بہترین طور پر ادا کیے۔ اس ذمہ داری کا میں ان کو پورا کریڈٹ دیتا ہوں۔ اس احتیاط سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ شمالی کوریا کی حکومت اور اس کے افراد اپنے فرائض کس درجہ خوبی کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔

اب تک ہمیں کوئی پروگرام نہیں ملا ہے۔ میرا تجربہ مجھے یہ بتاتا ہے کہ کوشش یہ کی جائے گی کہ ہمیں ہمارے قیام کے آخر دن تک ہر روز شش و پنج میں رکھا جائے، اور وقت کے وقت پروگرام سے آگاہ کیا جائے۔ شبِ گزشتہ کوشش کے باوجود معلوم نہ ہو سکا کہ آج کا پروگرام کیا ہے اور کس انداز سے ہمیں تیاری کرنی چاہیے۔ حتی کہ یہ بھی نہ بتایا گیا کہ گریٹ ہال ہم کس تقریب میں شرکت کے لیے لے جائے جا رہے ہیں! اس "سسپنس" کا ایک لطف بھی ہے!

جشن جنم دن کا آغاز درحقیقت گریٹ لیڈر کم ال سنگ صاحب کے خطاب سے ہو رہا ہے۔ آج وہ "پولیسی سپیچ" دیں گے، بلاشبہ اس تقریر کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ خطاب نہ صرف کوریا کے عوام سے ہوگا بلکہ یہ خطاب عالمی طاقتوں سے بھی ہوگا، بالخصوص ان ممالک سے جن کے سربراہ اور وزرا اور قائدین اس وقت یہاں موجود ہیں۔

میں نے خود کو اب تیار کر لیا ہے اور میں ذہنی طور پر مستعد ہو گیا ہوں کہ اس تقریر کو احتیاط کے ساتھ سنوں۔ صدر کم ال سنگ صاحب آج سنٹرل کمیٹی اوف دی ورکرز پارٹی اوف کوریا اور سپریم پیپلز اسمبلی اوف دی ڈیموکریٹک پیپلز ری پبلک اوف کوریا کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کریں گے۔

صبح ٹیلے وژن پر چند جھلکیاں دیکھیں، اور پھر کسی نہ کسی طرح پیونگ یانگ ٹائمز کی ایک کاپی مل گئی۔ اس سے اندازہ ہوا کہ کئی ممالک کے صدور (ہیڈ اوف اسٹیٹ) بھی پہنچ چکے ہیں جن کا استقبال خود صدر کم ال سنگ نے کیا ہے۔ کئی وفود کے سربراہ

وزرا ہیں اور ان کا خیر مقدم وزرا نے کیا ہے اور عام وفود کے خوش آمدید کہنے کے لیے اسی وزن کے ارکان حاضر تھے۔ اب تک میں نے جو دیکھا ہے اس سے میں نے یہ تاثر لیا ہے کہ یہ سہ روزہ تقریبات محض جشن جنم دن نہیں ہے بلکہ اس کے شدید و عمیق سیاسی مضمرات ہیں جن کا تعلق صدر کم ال سنگ کی قیادت اور شمالی کوریا کی حکومت کے استحکام سے ہے اور نہ صرف یہ بلکہ ان داخلی مقاصد کے لیے خارجی رائے عامہ کو حق میں کرنے کے لیے منظم جدوجہد ان تقریبات کا عنوان ہے۔

"اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کالونی" سے، کہ جہاں میں ایک ولا میں مقیم ہوں، "گریٹ پیپلز ہال" تک کا راستہ کوئی سترہ کلو میٹر ہے۔ سینکڑوں مرسیڈیز اس راہ پر رواں دواں ہیں۔ اور پھر ہم نے دیکھا کہ اس طویل راستے پر دونوں طرف کوریائی عوام سوئے ہال گامزن ہیں۔ درجنوں مقامات ایسے آئے کہ وہاں عورتیں اور مرد، بالخصوص بچے بچیاں یکساں لباسوں میں ملبوس استقبالِ مہمانان کرنے میں خلوص ومسرت کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ بچیاں، جو یقیناً اور لازماً طالبات علم ہیں ان سب کے لباس یکساں ہیں۔ ان کے سروں پر گُچھے لگے ہوئے ہیں۔ ہاتھوں میں گلابی پلاسٹک پھول ہیں۔ بچے تقریباً فوجی لباس میں ہیں اور یہ سب لازماً طالب علم ہیں۔ میں نے لازماً اس لیے لکھا ہے کہ شمالی کوریا میں کوئی بچہ اِس وقت تعلیم کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جب ہم کسی بھی بچے کو دیکھتے ہیں تو ہم بلاخوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ وہ طالب علم ہے، بچیاں ہاتھ ہلا ہلا کر اور بچے فوجی انداز سے "سلیوٹ مار کر" غیر ملکی مہمانوں کو خوش آمدید کہہ رہے ہیں۔ جو لوگ موٹر کارنشیں ہیں وہ یقیناً غیر ملکی ہیں!

۱۷ کلومیٹر کے راستے میں ہزارہا بچوں اور بڑوں نے جس طرح مہمانوں کا خیر مقدم کیا ہے اس سے تنظیم کی صلاحیتوں کی تعریف کی جا سکتی ہے جو کمیونسٹ اور سوشلسٹ حکومتوں میں امتیاز کی حامل ہوا کرتی ہے۔ اس میں تربیت اور حکم دونوں شامل ہوتے ہیں۔

مشترکہ اجلاس کے لیے مہمانانِ غیر ملکی ایک وسیع گیلری میں جمع ہو رہے تھے اور ان کی تواضع کے لیے بکثرت سامان میزوں پر چُنا ہوا تھا۔اور وہ مہمان کہ جوخود سربراہ مملکت تھے یا سربراہوں کی نمائندگی کر رہے تھے ان کا استقبال دوسرے انداز پر ہو رہا تھا، یعنی وہ خاص کمروں میں بٹھائے جا رہے تھے کہ ان کو عظیم رہنما کم ال سنگ کے معیت میں ہال کے اندر آنا تھا اور اسٹیج پر ان کے پیچھے بیٹھنا تھا۔ایک سوسری نگاہ ڈالنے سے یہ اندازہ ہو رہا ہے کہ اس تقریب میں افریقی ممالک کی شرکت کو اہمیت حاصل ہے۔نہ صرف وہ عوامی اعتبار سے اکثریت میں ہیں بلکہ ان کو برتری کا مقام بھی حاصل ہے۔میرے نزدیک یہ نکتہ سب سے زیادہ قابلِ غور و توجہ ہے۔اس کے مالہٗ وما علیہ کو احتیاط کے ساتھ سمجھنا ضروری ہے تاکہ تاریخ کے واقعات اور واقعات کی رفتار صحت و دیانت کے ساتھ محفوظ ہو جائے۔

عظیم رہنما کم ال سنگ کی آمد

عظیم ہال میں ہزارہا لوگ انتہائی نظم و ضبط کے ساتھ بیٹھ چکے تھے، افواجِ شمالی کوریا کے قائدین اپنی مقررہ جگہوں پر سَما چکے تھے، پارٹی ورکرز اور اسمبلی کے ارکان آ چکے تھے اور قرینے سے بیٹھ چکے تھے۔ان میں سے شاید ایک بھی اس استقبال و تواضع کثیر میں شریک نہ تھا کہ جو غیر ملکی مہمانوں کے لیے باہر لاؤنج اور گیلوی میں مرتب تھی اور جس سے استفادہ کرنے میں کسی نے بھی دامنِ احتیاط نہیں چھوڑا تھا۔میں اور دوسرے تمام غیر ملکی مہمان جب ہال کے اندر آئے تو صرف ہمارے لیے کرسیاں خالی تھیں اور سب آ آ کر ان میں سماتے گئے۔اتنے بڑے ہال میں کہ جہاں ہزاروں لوگ سمائے ہوئے ہوں ذرّہ برابر شور نہ تھا، ہر شخص خاموش بیٹھا ہوا تھا۔کہا جا سکتا ہے کہ ہال میں سنّاٹا چھایا ہوا تھا، اس طرح بیٹھے کوئی آدھ گھنٹہ ہوگیا کہ اچانک روشنیاں تیز ہوئیں۔ہال کہ جو پہلے ہی بقعۂ نور تھا اب وہاں دن کا مزہ آنے لگا۔یہ روشنی علامت تھی کہ گریٹ لیڈر اب ہال میں آ رہا ہے۔ہر شخص اپنی کرسی سے اٹھا اور ادب و احترام سے کھڑا ہوگیا۔میں نے یہ محسوس کیا کہ اس ادب واحترام

میں زور بھی ہے اور خلوص بھی۔

جیسے ہی جناب کم ال سنگ ہال میں داخل ہوئے ایسا لگا کہ ہر شخص کو بجلی کا کرنٹ لگ گیا ہو۔ہر شخص اچھل کود کے ساتھ خوش آمدید خوش آمدید اور زندہ باد زندہ باد کے نعرے لگا رہا تھا۔وہ ہال کہ جہاں مکمل خاموشی تھی وہاں اب نعرہ ہائے تحسین کی متانت شکن گونج تھی۔کم ال سنگ آگے تشریف فرما ہو گئے اور ان کے دائیں بائیں جو پانچ اور حضرات تھے ان کا تعلق افریقی ممالک سے تھا۔آگے کی صف میں کم ال سنگ صاحب کے دائیں جانب دو کرسیاں خالی تھیں۔ان کو خالی رکھا گیا اور کسی دوسرے ملک سے ان کو پُر نہیں کیا گیا۔ میں مطمئن نہ ہو سکا کہ یہ دو کرسیاں کن کے لیے تھیں اور کیوں خالی رکھی گئیں۔میں اس صورتِ حال کو کافی اہمیت دیتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ صحیح صورتِ حال سامنے آئے ، کیونکہ اس واقعہ سے حالاتِ حاضرہ کا گہرا تعلق ہے۔اگر پارٹی کے ارکان میں سے کوئی نہیں آیا ہے تو کیوں نہیں آیا ہے ؟ اگر کسی غیر ملکی مہمان کے لیے یہ کرسیاں تھیں تو جب معلوم تھا کہ وہ موجود نہیں تو کرسیاں ہٹائی کیوں نہیں گئیں ؟ بہ ظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ پارٹی کے ارکان کے لیے تھیں مگر وہ عین وقت پر نہیں آئے ہیں ، اور اس سے پارٹی کے اندرونی اختلاف کا شبہ ہوتا ہے۔اگر اختلاف رائے نہ ہوتا تو ان حفاظتی انتظامات کی ضرورت لاحق نہ ہوتی کہ جو ہر سطح پر پوری قطعیت کے ساتھ کیے جا رہے ہیں۔خود جناب محترم کم ال سنگ صاحب کے لیے سختِ حفاظتی انتظامات موجود ہیں اور وہ ان انتظامات کے بغیر ادھر ادھر نہیں جاتے ہیں۔

صدر کم ال سنگ کا خطاب

میری گائڈ اور میرا مترجم دونوں مجھے یہ نہ بتا سکے کہ صدر کم ال سنگ سے پہلے استقبالِ صدرِ کوریا میں طویل تقریر کرنے والی شخصیت کون تھی۔ہمارے ہاتھ میں کوئی پروگرام بھی نہیں ہے کہ ہم اندازہ لگا سکیں۔ قیاس ہے کہ ورکرز پارٹی یا سپریم اسمبلی

سے متعلق کوئی بلند و اہم شخصیت ہونی چاہیئے ۔میں نے اس کو زیادہ اہمیت بھی نہیں دی کہ یہ خطاب د رمدح صدر تھا اور اس کا جواز موجود ہے ۔بارے صدر کم ال سنگ کا خطاب شروع ہوا ۔ان کے خطاب سے قبل پیپلز پیلیس کے اس ہال میں ہر موجود شخص نے انتہائی بے تابی اور جوش و خروش کے ساتھ ان پر اپنی والہانہ محبت کا اظہار کیا ۔ پورا ہال نعرہ ہائے تحسین و اعتماد سے گونج اٹھا ، اور جب تک جناب ال سنگ صاحب نے اشارہ نہ کیا ہال میں موجود ہر ہر فرد اچھل اچھل کر تالیاں بجاتا رہا ۔اور جب خطاب کا آغاز ہوا تو سناٹا چھا گیا ۔کیا مجال سانس کی آواز بھی آ جائے ۔ صدر کم ال سنگ کے آج کے خطاب کا موضوع تھا :

سوسائٹی کو جُوچے آئڈیا کے مطابق ڈھالنے میں عوامی حکومت کی ذمے داریاں

(TASKS OF THE PEOPLE'S GOVERNMENT IN MODELLING THE WHOLE SOCIETY ON THE JUCHE IDEA)

پورے اطمینان و یقین کے ساتھ اور پورے تدبّر کے ساتھ کم ال سنگ صاحب نے کم و بیش ایک گھنٹہ خطاب کیا ۔ یہ خطاب اس اجتماع سے نہ تھا بلکہ یہ خطاب پورے ملک سے تھا کہ ہر شخص ضرور اس وقت ٹیلے وژن کے سامنے بیٹھا ہوگا اور دراصل یہ خطاب پورے عالم سے تھا ، افریقہ اور ایشیا سے بالخصوص تھا کہ اس خطۂ زمین پر انقلابات برپا ہیں اور نظریات میں ایک بے یقینی اور بے اعتمادی طاری ہے اور جہاں منزل و راہ کی تلاش میں ہر شخص سرگرداں ہے ۔اس میں ذرّہ برابر شک نہیں ہے کہ جُوچے آئڈیا لوجی (جس کا عربی ترجمہ فکرۃ زوتشیہ کیا گیا ہے) کو اختیار کر کے مارشل کم ال سنگ نے کوریا کی تعمیرِ نو کا بیڑا اٹھایا ، اور انہوں نے کوریائے شمالی کو منزل و راہ دکھا کر عظمتوں سے روشناس

کرا دیا ہے۔ان کا یہ ایک ایسا کارنامہ ہے کہ جس کی ان کو پوری پوری داد دی جانی چاہیئے ۔ ان کو اس کا پورا حق پہنچتا ہے کہ وہ اس وطن کے باپ کہلائیں اور عظیم رہنما ، اور ضرور ان کو یہ بھی حق پہنچتا ہے کہ وہ تقسیم کوریا (شمالی و جنوبی) کو کالعدم کر کے ایک واحد نیا کوریا بنانے پر اصرار کریں اور جد وجہد ۔

کم ال سنگ صاحب کا آج کا خطاب براہ راست افرادِ شمالی کوریا سے ہے اور انھوں نے تعمیری جد وجہد کو سوا کرنے کا راستہ بتایا ہے اور ہر شعبۂ زندگی میں تعمیری کوششوں کے لیے بھر پور رہنمائی دی ہے ، اور اگر ان کی عمر نے اور ان کی قیادت نے وفا کی تو کوئی وجہ مانع نہیں ہے کہ شمالی کوریا ایک چھوٹی مگر ناقابل شکست مملکت بن جائے ۔ مگر میں جب اس خطاب کے بین السّطور میں جھانکتا ہوں تو مجھے وہ حقیقی تڑپ ملتی ہے کہ جو ایک محبِ وطن کے دل و دماغ میں ہونی چاہیے اور وہ ہے جنوبی اور شمالی کوریا کا ملاپ ۔ اگر کم ال سنگ اپنے خطاب میں جنوبی کوریا کو شمالی کوریا سے جدا کو دینے کی ذمہ داری امریکا پر ڈالتے ہیں تو ان کو آخر کون غلط کہہ سکتا ہے ! آزادی کی جنگ لڑنے کے بعد اور فتوحات کے بعد اگر ملک دو حصوں میں تقسیم ہو جائے تو ایک محب وطن کو جو تکلیف ہو سکتی ہے اسے بہ خوبی سمجھا جا سکتا ہے ۔ میں کوشش کروں گا کہ اپنے اس روزنامچہ میں کوریا کے بارے میں احتیاط و اختصار کے ساتھ صحیح صورتِ حال کو قلم بند کردوں، کیونکہ مجھے اندازہ ہے کہ پاکستان میں اس مسئلے کو ہنوز سمجھا ہی نہیں گیا ہے اور حیرت ہے کہ اس تناظر میں بھی نہیں سمجھا جا سکا کہ خود پاکستان دو لخت ہوا ہے اور ایک سُپریم پاور نے ایک بڑے ملک سے ساز باز کر کے ایک پاکستان کو نئے پاکستان اور بنگلہ دیش میں تقسیم کر کے رکھ دیا ۔

اگر میں یہ کہوں کہ اہلِ پاکستان دنیا کے کئی بد قسمت ممالک کے دُکھ کو محسوس کرتے کہ بڑی طاقتوں نے ان کو تقسیم کر کے ڈال دیا ہے تو تقسیم پاکستان کے دکھ وہ سوا محسوس کرتے ،مگر کس قدر بد قسمتی ہے کہ پاکستان نے تقسیمِ وطن کا دکھ ذرا محسوس

نہ کیا اور جو الگ ہوئے انھوں نے ذرا محسوس نہ کیا کہ ان کی منزل و راہ کیا ہے ۔ صفحۂ ارض پر یہ بڑی المناک سازش جاری ہے کہ بڑی طاقتیں اپنی حاکمیت کے لیے آزاد ملکوں میں تفرقہ ڈال کر ان کو تقسیم کرتی چلی جا رہی ہیں اور ان کو کمزوریوں کے حوالے کرتی چلی جا رہی ہیں ۔ کم ال سنگ اس درد سے بہ خوبی آگاہ ہیں اور وہ اس سے بھی واقف ہیں کہ آزاد ممالک کی یہ غیر فطری تقسیم کاری دنیا کو شدید خطرات سے دوچار کرنے والی ہے اور اقوام و امم کو کم زور کر کے ایک دو طاقتیں سپریم بن کر لوگوں کی قسمتوں سے کھیلنا چاہتی ہیں ۔ درحقیقت جن خطرات کا کم ال سنگ احساس واحاطہ کر رہے ہیں ان سے زیادہ اسے عالم عیسائیت کو اور عالم اسلام کو محسوس کرنا چاہیے کہ یہ دونوں آئڈیا لوجیاں اب مستقبل قریب میں سنگین خطرات سے دوچار ہُوا چاہتی ہیں ۔ جہاں تک عالم اسلام کا تعلق ہے وہ زد میں آ چکا ہے ۔ اسلامی نظریۂ حیات کو خطرات لاحق ہو چکے ہیں ۔ اللہ سے فرار کی طاقتیں زور باندھ چکی ہیں اور قلعۂ اسلام پر شد ومد کے ساتھ حملہ آور ہو چکی ہیں ۔ اگر دنیائے اسلام میں انقلابِ فکر نہ آیا اور اخلاقی زندگی کو اجتماعی نہ کیا گیا اور اسلامی نظریۂ حیات کے مطابق نظام ہائے حکومت کو نہ ڈھالا گیا تو مجھے شکست و ریخت میں کوئی شبہ نظر نہیں آ رہا ہے ۔ ممالک کہ جہاں اسلامی نظریۂ حیات کے مطابق قوانین و زندگی کو اختیار کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں ، جیسا کہ پاکستان میں، اگر انھوں نے احتیاط و فکر کے ساتھ منزلیں طے نہ کیں اور یہ تجربہ ناکام ہو گیا تو نظریۂ اسلامی کی شکست بڑے دُور رَس نتائج کی حامل ہوگی اور فیصلہ صدیوں تک کے لیے ہو جائے گا ۔ اور اگر خدانکردہ ایسے حالات پیدا ہوئے تو عیسائیت کی بنیادیں ہلنے میں دیر نہیں لگے گی اور دہریت کا بول بالا ہو جائے گا کہ جہاں ایک خدا نہ ہوگا بلکہ لاتعداد خدا ہوں گے ۔ اور ان "خداؤں" کا وہی حال اور انجام ہوتا رہے گا کہ جو چین میں بڑے بڑے لیڈروں کا ہوا ہے ۔ یہ وہ صورتِ حال ہوگی کہ دنیا میں بے چینی کا دور دورہ ہوگا اور نہیں کہا جا سکتا کہ آنے والی کتنی صدیاں ان شدید حالات سے دوچار رہیں گی ۔

خطاب کم ال سنگ کا متن

میں ضرورت محسوس کرتا ہوں کہ اس روزنامچے میں کم ال سنگ کا خطاب لفظ بلفظ دیدوں تاکہ میرے اس روزنامچے کے قارئین غور کر سکیں کہ حالاتِ زمانہ کی رفتار کیا ہے۔ اب میں اپنے ساتھ اپنے قارئین روزنامچہ کو پیپلزپیلیس کے گریٹ ہال لے چلتا ہوں اور مارشل کم ال سنگ، صدر عوامی جمہوریۂ کوریا کی تقریر سناتا ہوں اور وہاں حالات کی منظر کشی بھی کرتا ہوں:

شمالی کوریا کے عوام کے قائد اعلا

کامریڈ کم ال سنگ کے روسٹرم پر آتے ہی، سارا ہال پُر جوش تالیوں سے تادیر گونجتا رہا۔

اپنی تقریر کے بالکل شروع ہی میں انھوں نے باہر سے آئے ہوئے سوبراہان مملکت کی تشریف آوری کا بڑے پُرتپاک پیرائے میں شکریہ ادا کیا، دور دراز سے آئے ہوئے مہمانوں کا انھوں نے بار بار بڑے اچھے الفاظ میں، بڑے تشکر و امتنان کے ساتھ ذکر کیا۔ ان کی تقریر کا بیشتر حصہ اسی موضوع پر تھا کہ شمالی کوریا نے اشتراکی تحریکوں کے سلسلے میں جُوچے نظریہ اپنایا ہے، اس سے ساری دنیا میں دلچسپی کا اظہار کیا جا رہا ہے۔

اپنی ساری قوم کی طرف سے بیرونی مہمانوں کی تشریف آوری اور کوریا کے عوامی لیڈر کی سالگرہ میں اتنی بڑی تعداد کے شریک ہونے پر بڑی مسرت و تشکر کا اظہار کرتے ہوئے، کامریڈ کم ال سنگ نے کہا کہ وہ اور ساری کوریائی قوم اس بات سے بہت خوش اور مطمئن ہے کہ موجودہ شمالی کوریا کی قیادت نے ساری دنیا سے دوستی و تعاون کے لیے جو کوشش شروع کی تھی وہ بہت کامیاب ہوتی نظر آرہی ہے اور شمالی کوریا کی حد تک تو خاص طور سے یہ بڑی خوش آیند بات ہے۔ اس سے مستقبل کی اور بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ غیر وابستہ ممالک کے لیے شمالی کوریا کی اس کامیابی کی اور بھی زیادہ اہمیت ہے اور اس اہمیت میں اب اضافہ ہی

ہوتا رہے گا ۔

اپنی ستّرویں سالگرہ کی تقریب اور اپنے ملک کی سیاسی تنظیم، اعلا ترین عوامی پارلیمنٹ کی ساتویں نشست اور حکمراں پارٹی کی چھٹی کنگوس کے انتخابات کا ایک ہی زمانے میں قریب قریب انعقاد کا بھی کامریڈ کم ال سنگ نے یہی کہہ کے ذکر کیا کہ یہ سب شمالی کوریا کے عوام کی نظروں میں اس لیے اور بھی اہم باتیں ہیں کہ ان تاریخی بلکہ تاریخ ساز واقعات سے ساری دنیا نے گہری دلچسپی رکھنے کا ثبوت فراہم کر دیا ہے اور یہ ثبوت ان حضرات کی یہاں (شمالی کوریا میں) تشریف آوری ہے جو دنیا کے دور دراز علاقوں سے، کئی سمندر پار کر کے بڑی خوشی خوشی شمالی کوریا کی اس خوشی میں شرکت کرنے یہاں تشریف لائے ہیں ۔

کامریڈ کم ال سنگ نے شمالی کوریا کے عوام کی نصف صدی کی جدوجہد آزادی کی بڑی تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ حالیہ جو انتخابات ملک میں ہوئے ہیں اور ان انتخابات کے دوران ساری قوم نے جس جوش و خروش سے خود اعتمادی کا مظاہرہ کیا ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شمالی کوریا کی ساری قوم اس پچاس سالہ جدوجہد کی اہمیت اور اس کی کامیابی سے خوب واقف ہوچکی ہے اور جُوچے کے نظریے کو زندگی کے لیے مایۂ حیات بنا کرآگے قدم پر قدم بڑھائے چلنے کا تہیہ کرچکی ہے ۔یہی سیاسی بیداری آیندہ نسلوں کی خوشحالی کی پوری طرح ضمانت فراہم کرتی ہے ۔

کامریڈ کم ال سنگ نے بہت زور دے کر یہ بات کہی کہ حالیہ انتخابات میں بلا استثنا ساری قوم کے ہر ہر فرد نے اپنا حق رائے دہی استعمال کیا جس کی بدولت موجودہ جمہوری حکومت کے ہاتھ اور بھی مضبوط ہو گئے ہیں اور حکومت کو یہ اطمینان ہو گیا کہ عوام اس کی پالیسیوں اور کاروائیوں سے اچھی طرح مفاہمت رکھتے ہیں اور ان کی ہر طرح تائید میں ہیں ۔

ہر دو چار جملوں کے بعد سارا ہال تالیوں سے گونج جاتا تھا اور بار بار کامریڈ کم ال سنگ اپنے عوام کی بھی اس تائید و فہم کا شکریہ ادا کرتے جاتے تھے ۔

ایک موقع پر کامریڈ کم ال سنگ نے کہا مجھے اس کا موقع دیجئے کہ میں اپنے سارے عوام کا خاص طور پر ان باتوں کے لیے شکریہ ادا کروں کہ انھوں نے ساتویں اعلا ترین عوامی اسمبلی کے پہلے سیشن ہی میں مجھ پر، میری ذات پر اعتماد کر کے میرے اوپر اتنی بڑی ذمہ داری ڈال دی کہ میں عوام کی خدمت و قیادت کرنے کھڑا ہو جاؤں - پھر انھوں نے میری اس جمہوری حکومت، پارٹی کی اعلا ترین جماعت پر بھی پورے اعتماد و اطمینان کی مہر لگا دی جس سے میری اور بھی حوصلہ افزائی ہوئی ہے- اسی طرح کی حوصلہ افزائی کسی بھی صدر مملکت کے لیے حد درجہ صحت بخش ہو سکتی ہے اور آپ دیکھتے ہیں کہ ستّر سال کی عمر میں اسی حوصلہ افزائی کی بدولت میں کتنا صحت مند اور چاق و چوبند ہوں -

عوام کی سیاسی سوجھ بوجھ اور سیاسی طور پر صحت مندانہ اقدام کے لیے ایک جانا مانا، عوام کا پسندیدہ مطمح نظر ضروری ہے اور شمالی کوریا کے عوام کو جُوچے کی شکل میں یہ آدرش اور مطمح نظر مل گیا ہے، اسی کے تحت ان عوام نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ انقلاب اور تعمیر اور تعمیری انقلاب کا سلسلہ جاری رہنا زندگی کے لیے لازمی و لابدی ہے- انھوں نے تین قسم کے انقلابات کو زندگی کے لیے اشد ضروری قرار دیا -

ان تینوں انقلابوں کے تسلسل کی بدولت شمالی کوریا کے عوام اس کوشش میں ہیں کہ اشتمالی نظریوں کے نام لیوا لوگوں کے لیے ان کا ملک "جنت" بن جائے -

کامریڈ کم ال سنگ نے کہا کہ سیاست یا علم السیاست یا سیاسیات ایسی اصطلاحیں ہیں جن کے مختلف و متعدد معنی جگہ جگہ پہنائے جاتے رہے ہیں، لیکن ان کے نزدیک اور ان کی قوم کے نزدیک سیاست ایک سماجی اصطلاح ہے اور اس کے ذریعہ سے سارے سماج کو ایک ناقابلِ تسخیر قلعے کی شکل دینا مقصود ہوتا ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب سارا سماج ایک مضبوط لڑی میں پرویا ہوا ہو، ہر ہر فرد سماج کی روایات و آدرش سے واقف اور مسلمہ اصولوں کے تحت ان کی کامیابی کے لیے اپنے اپنے طور پر کاربند رہے -

اس تعریف کے بعد، صدر کم ال سنگ نے کہا کہ اب میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ سیاست کے بغیر سماج بے جان رہتی ہے اور سیاست ہی کی طاقت پر افراد اور ان کے نمائندے سماج میں جان ڈالتے ہیں۔ طبقات میں بٹی ہوئی سماج میں، سیاسی کدوکاوش کی حدود بھی مختصر ہوتی ہیں اور ان کا کام صرف ایک دو یا مختلف طبقات کی خدمت اور ترقی رہ جاتا ہے۔

اپنے ملک کی سیاسی ہئیت کا نقشہ کھینچتے ہوئے، کامریڈ کم ال سنگ نے کہا کہ شمالی کوریا کے عوام سب کے سب محنت کش افراد کا ایک مجموعہ ہیں۔ اس مجموعے میں کاشتکار بھی ہیں، پیشہ ور محنت کش بھی جو خصوصی پیشوں سے منسلک ہیں، مزدور بھی جو کارخانوں اور زرعی زمینوں دونوں جگہ اپنے مفوضہ کام انجام دیتے ہیں اور یہ سب مل کو سیاسی طور پر اپنے حقوق اور فرائض کی حد بندی کر چکے ہیں۔ ان کی یہی خصوصیت ان کی سب سے بڑی طاقت ہے اور طاقت اور اتفاق و یک جہتی لازم وملزوم ہیں۔ طاقت اتحاد و یک جہتی سے ہی حاصل ہوتی ہے اور اتفاق و یک جہتی کے لیے یہ ضروری ہے کہ آزادی اور کامل آزادی حاصل ہو جو طاقت کے بغیر ممکن نہیں۔

عوام آزاد ہوں، سماج بند ھنوں سے آزاد ہو تو تخلیق کی بھی آزادی ہوتی ہے اور تخلیق کا سلسلہ جاری رہنا ہی زندگی اور حیات کی ضمانت ہے۔ ایسی آزادی ہر انسان کا فطری حق ہے۔ یہی انسانی کاموں کے لیے روح رواں کا کام دیتی ہے۔ انسان سماج کا جزو ہے، اگر وہ آزادی سے کام نہ کر سکے تو سماج معطل اور زندگی گھٹن کا شکار ہونے لگتی ہے اور تخلیق کا سلسلہ بند ہو جاتا ہے۔ شمالی کوریا کے عوام نے اس حقیقت کو خوب سمجھ رکھا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ایک سوشلسٹ معاشرے یا سماج میں عوام کے باہمی اتحاد اور عوام کی طاقت کے برتے ہی پر سارے کام انجام پاتے ہیں۔ اگر عوام کو آزادی میسر نہ ہو تو کیا جسمانی اور کیا ذہنی و روحانی ہر طرح سے سارا معاشرہ انتشار کا شکار رہتا ہے۔

کامریڈ کم ال سنگ نے ایک موقع پر عوام اور خصوصاً محنت کش

عوام کے درمیان طبقاتی کشمکش کو سارے سماج کے لیے ، ملک کے لیے اور انسانیت کے لیے خطرہ بتایا ۔ ان کے نزدیک عوام کے معیارِ زندگی میں بڑی سے بڑی حد تک یک سانی و ہم سری ہونی چاہیے ۔

اپنے ملک کی مثال دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ طبقاتی کشمکش اور باشندگانِ ملک کے آپس میں طرز حیات ، طرز ماند و بود ، عام معیارِ زندگی میں زبردست فرق چند بیرونی اثرات کا خمیازہ تھا ، جسے صاف کرنے میں نصف صدی جدوجہد کرنی پڑی ۔ اب یہ بیرونی اثرات سماج سے نکال پھینکے گئے ہیں ، یہ بڑا انقلابی اقدام تھا ، ہر انقلاب کا ضروری جزو ۔

ہر سوشلسٹ انقلاب کے بعد ، کامریڈ کم ال سنگ نے اپنی تقریر میں کہا ، ایک دور تعمیر کا ضروری ہے ۔ جس طرح ہر انقلاب کے بعد انقلابی رجحانات میں تبدیلی آنا ضروری ہے جو حالات کا تقاضا اور ضروریات زندگی کی پابجائی کے لیے لابدی ہے ، اسی طرح تعمیری دور میں بھی سوشلسٹوں نے یہ ضروری سمجھا ہے کہ تعمیر کے معیار اور ذرایع حسب ضرورت بدلے جاتے رہیں ۔ قدیم معاشرے یا از کار رفتہ نظریوں کے نتائج جو ہمیں وراثت میں ملتے ہیں ، اکثر و بیشتر سرے سے بدلے جانے کے قابل ہوتے ہیں ، ان کا اسی نظر سے تجزیہ ضروری ہے ۔

انقلاب در انقلاب کے بعد ، کامریڈ کم ال سنگ نے کہا کہ جب ایک مرتبہ اشتراکی (یا اشتمالی ، کمیونسٹ) سوسائٹی کہیں قائم ہو جاتی ہے ، تب بھی چھوٹی چھوٹی باتوں پر نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے تاکہ قدیم اور پرانی عادتوں ، رسم و رواج اور ان کے اثرات چپکے چپکے نوخیز معاشرے میں سرایت نہ کرنے پائیں ۔

انقلاب در انقلاب کی تصریح کرتے ہوئے کامریڈ کم ال سنگ نے کہا کہ تین قسم کے انقلاب اشتراکی سماج میں ضروری خیال کیے گئے ہیں ۔

- ثقافتی انقلاب — Cultural Revolution
- فنی یا میکانی انقلاب — Technical Revolution
- نظریاتی انقلاب — Ideological Revolution

اپنی تقریر کے بہت بڑے حصے میں وہ ان ہی تینوں قسم کے انقلابات کی تفصیل اور اپنے ملک میں ، نیز بعض دوسرے "اشتراکیت پسند ممالک" میں ان تینوں انقلابات کی ضرورت کے احساس اور ان کی کامیابی کا ذکر کرتے رہے -

قیادت میں ہم آہنگی

اپنی تقریر میں کامریڈ کم ال سنگ نے ایک اور نکتے پر تادیر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور وہ تھا ملک کی قیادت میں ہم خیالی و ہم آہنگی کی ضرورت ـــــ اپنے ملک کی ہی بہت کچھ مثال دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ جیسے جیسے سوشلسٹ اور کمیونسٹ نظریے عملی شکل اختیار کرتے گئے ، سماج میں تنظیم اور یک جہتی کو فروغ ہوتا گیا مگر ساتھ ہی زندگی کے رخ بھی کئی کئی بننے لگے (اور افراد نے نئے نئے رخ اختیار کرنے کی طرح ڈالی) - ایسے میں بڑی ضرورت اسی مضبوط قیادت کی ہوتی ہے جو سارے عوام ، سارے سماج اور ہر طرح کی عملی و ذہنی زندگی پر نظر رکھ کر پوری یک جہتی اور ہم آہنگی کے ساتھ قوم کی نگرانی کرے -

ارباب علم و دانش

اربابِ علم اور دانشوروں کے طبقے کا ذکر کرتے ہوئے ، کامریڈ کم ال سنگ نے بڑی صراحت کے ساتھ کہا کہ نظریاتی انقلاب ، فنی انقلاب اور سماجی یا ثقافتی انقلاب کے دور سے گزرنے کے بعد محنت کش عوام از سر نو سوشلسٹ یا کمیونسٹ معاشرہ تعمیر کرنے کے کام میں لگ جاتے ہیں اور ان کی مقرر کردہ، منتخب کردہ حکومت کا فرضِ عین ہے کہ قوم کے تمام افراد کو ، بشمول اربابِ علم و دانشوران ، اُن تبدیلیوں کی طرف متوجہ کرے جو ان تینوں انقلابات کے نتیجے کے طور پر زندگی کے ہر ہر شعبے میں نمایاں ہونی شروع ہو چکی ہوتی ہیں -

انھوں نے بڑی وضاحت کے ساتھ کہا کہ ان کی حکومت نے یہ

کارنامہ بڑی کامیابی کے ساتھ انجام دیا ہے اور آج شمالی کوریا کے اربابِ علم و دانشور ملک میں اشتمالی نظریوں کی حفاظت کا حق ادا کر رہے ہیں ، ان کی اس کوشش کی بدولت شمالی کوریا کمیونزم کا قلعہ بنا ہوا ہے ۔

نظریۂ جوچے

اپنی تقریر میں ایک موقع پر کامریڈ کم ال سنگ نے یہ بھی کہا کہ بڑے بڑے معرکوں میں ایک ذرا سی چوک حالات کا رخ کہاں سے کہاں بدل دیتی ہے ، مثلاً تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ نظریاتی انقلاب کی سو فیصد کامیابی کے بعد بھی چند سوشلسٹ سماجوں میں پرانے خیالات ، سامراجی اور سرمایہ دارانہ طور طریقے ، بیرونی دشمنوں کے ہاتھوں افراد کے دل و دماغ پر ، ان کے ذہنوں پر اثر انداز ہونے لگے اور ان کی بدولت صورتِ حال یہ ہوئی کہ انقلاب کے بعد تعمیر کا جو دور شروع ہوتا ہے اس میں تعویق پر تعویق ہوتی چلی گئی اور بہت سے وہ کارنامے جو انقلاب نے سرانجام دیے تھے ، ناکامی کا شکار ہو گئے ۔

ایسے موقعوں پر ، کامریڈ کم ال سنگ نے کہا کہ شمالی کوریا کا اپنایا ہوا جُوچے نظام یا نظریہ بہت کام آتا ہے ۔ اس نظام یا نظریے کی کسی قدر تصریح کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ کسی عقیدے پر قول ، فعل اور خیال تینوں کا جمے رہنا ضروری ہے ۔ اسی طرح اس عقیدے کی حفاظت کی ضمانت ہوتی رہتی ہے ۔ معاشی معاملات اور قومی و ملکی دفاع ، ہر شعبے میں قول ، فعل اور خیال کی ہم آہنگی بڑا کام دیتی ہے ۔ عقیدے کی یہ پختگی جتنی زیادہ عوام میں سرایت کرتی جائے گی ، اتنی ہی عوام کی سیاسی آزادی ، خوداعتمادی ، اپنا کام آپ کرنے کی صلاحیت ، حتٰی کہ ملک کا بیرونی اثرات اور خطرات سے دفاع کرنے کی قوت بڑھتی چلی جائے گی ۔

فنّی انقلاب

اپنے ملک میں فنّی اور میکانی ترقیوں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے

کامریڈ کم ال سنگ نے کہا کہ ان کی حکومت کی بڑی کوشش ہے کہ اس میدان میں پارٹی ، حکومت اور عوام سب مل کر موجودہ معیار سے زیادہ اونچے معیار اور وسیع پیمانے پر ترقیاں کرنے کا عزم صمیم کرلیں۔ فنّی یا میکانی انقلاب کے لیے انھوں نے کہا کہ اس کے لیے یہی کافی نہیں کہ خاص خاص فن یا نئی نئی مشینوں کی ایجاد سے فائدہ اٹھایا جائے بلکہ یہ بھی بہت ضروری ہے کہ اس شعبے میں جو ہزاروں ہزار محنت کش مصروف کار ہیں ، ان کا معیارِ زندگی بلند کرنے ، انھیں زیادہ سے زیادہ جسمانی و ذہنی سکون فراہم کرنے اور ان کو ملک و قوم کی بہتر سے بہتر خدمت کرنے کے قابل بنایا جائے ۔

فنّی یا میکانی انقلاب کو باعزت ، باعظمت اور قابلِ احترام انقلاب اِسی طرح بنایا جا سکتا ہے کہ اس میں فنّی ترقیوں کی گنجائش کے ساتھ ساتھ انسانوں کی انسانی ضروریات اور سہولتوں کا بھی خیال رکھا جائے ۔

فی الوقت ، کامریڈ کم ال سنگ نے کہا ، ملک میں جو فنّی اور میکانی انقلاب کارفرما ہے اس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ فنّی معلومات کو عام کیا جائے، نئے سے نئے فنّی و میکانی آلات کی تیاری اور بڑی سے بڑی ، زیادہ سے زیادہ کارآمد مشینوں کی ایجاد کی حوصلہ افزائی کی جائے ، لیکن ملک جس جُوچے نظریہ کو اپنا چکا ہے ، اس کے پیش نظر انسان کو انسان بنائے رکھنا بھی ضروری ہے ، اسے مشین یا مشین کا تابع نہ بنا دیا جائے ۔اس کی مادی و ذہنی ضروریات کا بھی پورا پورا لحاظ رکھا جائے ۔

کامریڈ کم ال سنگ نے کہا کہ اسی طرح ہم ان سائنسدانوں اور ماہرین فن کو نئی سے نئی اور بہتر سے بہتر ایجادات پیش کرنے کے قابل بنا سکیں گے جو اس کام پر لگائے جا چکے ہیں ، اسی سے ان کے جذبۂ خدمت و تخلیق کو ، ان کی امنگ اور ان کے جوشِ خدمت کو تقویت ملے گی ۔

ثقافتی انقلاب

اپنے ملک کے ثقافتی انقلاب کا ذکر کرتے ہوئے کامریڈ کم ال

سنگ نے کہا کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ ثقافتی انقلاب کے ذریعہ سے ساری قوم میں علم و دانش کے صحیح معیار کی تبلیغ کی جائے۔ جب سارا معاشرہ علم و دانش کی روشنی سے منور ہو جائے گا تب ہی یہ ممکن ہے کہ ہر ہر فرد اپنی اپنی جگہ پر اچھا کمیونسٹ بن سکے اور اس کے ذہن سے محنت کش لوگوں کو طبقات میں تقسیم کرنے کا خیال محو ہو جائے اور وہ جسمانی محنت اور دماغی و علمی کام کو ایک سطح پر قابلِ تعریف و قابلِ قدر محنت تصور کرنے لگے۔ اس کے سوا تمام تصورات غائب ہو جائیں۔

انھوں نے کہا کہ اس کام کے لیے تعلیم کو عام کرنا اور زیادہ سے زیادہ عوام کو تحصیلِ علم کی طرف راغب کرنا ضروری ہے۔ تعلیم و تعلم عوام کے ان نمائندہ اداروں کے فرائض میں شامل ہونا چاہیئے کہ جو عوام کی خدمت کے علمبردار ہیں۔ نوجوانوں پر زیادہ توجہ دی جائے اور اس کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے کہ ہر ہر قدم پر جوچے کے اصولوں کی بھی ترسیل و تبلیغ ہوتی رہے۔ گویا ان کا ذہن، جسم، اخلاقی تصورات سب علم کی روشنی سے مُنوّر ہو جائیں۔

ثقافتی انقلاب، کامریڈ کم ال سنگ نے کہا، ان تینوں انقلابوں کا حصہ ہے جن کے بغیر کمیونسٹ تحریک زندہ نہیں رہ سکتی۔ دوسرے دونوں انقلاب اپنی اپنی جگہ بہت اہم ہیں لیکن یہ بھی کچھ کم اہم نہیں۔

تقسیمِ وسائل

مادی ترقی اور مادی وسائل کی سوشلسٹ نظریے کے مطابق مساویانہ تقسیم کا ذکر کرتے ہوئے شمالی کوریا کے رہنمائے اعظم نے یاد دلایا کہ کمیونسٹ معاشرہ اس وقت تک پھلنے پھولنے کے قابل ہو نہیں سکتا جب تک عوام کا ہر ہر فرد آزادی کی نعمت سے مالا مال نہیں ہو جاتا، اور یہ آزادی اسی وقت صحیح معنوں میں آزادی کہلائے گی جب اس کے ساتھ مادّی وسائل کو استعمال کرنے کی بھی پوری آزادی ہو۔ مادی وسائل کا اس طریقہ سے استعمال تو سوشلسٹ نظریے کی روح ہے۔

انھوں نے کہا کہ کمیونسٹ معاشرے کی تعمیر سے یہی مراد نہیں کہ لوگوں کو پوری پوری سیاسی و معاشی آزادی ہو اور اس کا احساس ہو ، بلکہ کمیونسٹ معاشرے کے معماروں کو یہ کام بھی انجام دینا ہے کہ جس مادی دولت اور پیداوار کو وہ مساوی تقسیم کرنے کی دُھن میں لگے ہوئے ہیں ، اس کی مقدار بھی زیادہ سے زیادہ بڑھائی جاتی رہے کہ تقسیم کے بعد انسانوں کی مادی ضروریات اچھی طرح سے پُوری ہوتی رہیں ۔

اس سلسلے میں کامریڈ کم ال سنگ نے سوشلسٹوں کے معاشی نظریوں کا ان کی ابتدا ، اٹھان ، نشیب و فراز اور ترمیم و تبدیلی کا خاصی تفصیل سے ذکر کیا اور بتایا کہ کوریا کے محنت کش عوام کی پارٹی کی چھٹی کنگرس نے اس سلسلے میں چند حتمی فیصلے کیے ہیں اور قابلِ عمل منصوبے حکومت اور عوام دونوں کے سامنے پیش کر دیے ہیں ۔

دس اہم تجاویز

ان منصوبوں کے علاوہ کامریڈ کم ال سنگ نے کہا کہ ان کی حکومت کے سامنے دوسرے سات سالہ منصوبے کی تکمیل کا مرحلہ بھی ہے اور انھیں پوری امید ہے کہ ۱۹۸۰ء کے دہے میں سوشلسٹ معاشی منصوبوں کے دس ایسے اہم کام مکمل کر لیے جائیں گے جن کو طویل المعیاد تجویزوں میں شمار کیا جاتا رہا ہے ۔ لیکن ان سب میں جُوچے نظریہ کی کارفرمائی کا پورا پورا لحاظ رکھنا ضروری ہے ۔

انھوں نے اپنی حکومت کا یہ عزم دُہرایا کہ اس کام میں ساری قوم کو ، ہر ہر فرد کو ، اپنا اپنا فریضہ انجام دینے کا پورا پورا موقع دیا جائے گا اور حکومت کی طرف سے نگرانی اور ترغیب دونوں کام جاری رہیں گے ۔

دس اہم تجویزوں کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ان سب میں مقدم تجویز سامان خوراک ، زرعی پیداوار اور بحری یا دریائی سامان خوراک کی زیادہ سے زیادہ مقدار ، اچھی سے اچھی قسم اور اس کے حمل و نقل کے انتظام کی ضرورت ہے ۔ ان سب کاموں کے لیے جگہ جگہ چھوٹے بڑے مرکز غذائی ضروریات کا اندازہ کرنے اور

ان کی تکمیل کے لیے قائم بھی ہیں اور مزید قائم کیے جا رہے ہیں۔

انھوں نے یہ کہاوت یاد دلائی کہ غذائی سامان اور کمیونزم کا چولی دامن کا ساتھ ہے ، آدمی فیاضی اور سخاوت کے لیے اسی وقت سوچ سکتا ہے کہ جب خود اس کا پیٹ بھرا ہو ، جیب بھری ہو ، کوٹھری بھری ہو ۔

فی الوقت بھی ایک منصوبے کی کامیابی کے بعد ملک کا غذائی مسئلہ بہت کچھ حل ہو چکا ہے ، دست گرد اس منصوبے کی تکمیل کے بعد تو یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں رہے گا ۔ انھوں نے یقین دلایا کہ پندرہ ملیون ٹن غلہ کی پیداوار کا جو ہدف مقرر ہوا ہے وہ ضرور پورا ہو کر رہے گا ۔

اس سلسلے میں انھوں نے دریاؤں ، نہروں ، پُشتوں اور آبپاشی کے دوسرے وسائل کا ذکر کیا اور بہت سی ایسی زمینوں کو قابلِ کاشت بنانے کی اسکیموں کا بھی ذکر کیا جو ابھی تک ناقابلِ کاشت پڑی ہیں ۔

تقریر کا یہ حصہ اعداد و شمار سے بھرا پڑا ہے ۔ زراعت کے سلسلے میں بھی جوچے نظریہ کی کارفرمائیوں کا بڑے زور شور سے ذکر کیا گیا ۔

زرعی اور غذائی مسائل کی تفصیل اور ان سے عہدہ برا ہونے کی اسکیموں کا بالتفصیل ذکر کرنے کے بعد ، کامریڈ کم ال سنگ نے ملک کی صنعتی ، فنی ، سائنسی اور میکانکی ترقیوں اور ان سے متعلق منصوبوں کا ذکر کیا ۔

مصنوعات میں انھوں نے کیمیائی سامان ، کپڑے کی صنعت ، رُوئی ، ریشم اور مصنوعی دھاگے سے بنے ہوئے مختلف سامان کا نام بہ نام ذکر کرتے ہوئے فخریہ انداز میں یہ دعوا کیا کہ بہت سے نئے نئے طریقوں کو بہت جلد اپنا کر شمالی کوریا نے ترقی پذیر ملکوں کے لیے مثال قائم کر دی ہے ۔

اس سلسلے میں انھوں نے کیمیائی کھاد ، ربڑ ، رال ، لاکھ ایسی اشیا نیز کوئلہ ، بجلی ، سیمنٹ اور چند خاص خاص دھاتوں کا بھی ذکر کیا جن کے لیے شمالی کوریا میں بڑی ترقی ہوئی ہے

اور مزید ترقیوں کی بڑی گنجائش ہے ۔

کامریڈ کم ال سنگ نے اپنی تقریر میں خاصی تفصیل سے چھوٹی چھوٹی مشینوں کے ذریعہ سے صنعتی ترقی اور بڑی بڑی مشینوں اور عظیم الشان کارخانوں کے ذریعہ سے بڑی بڑی مصنوعات کی تیاری کے فرق پر بحث کی اور دونوں کو اپنے ملک کے لیے ضروری قرار دیتے ہوئے ، مختلف شعبوں میں ان کی افادیت پر روشنی ڈالی۔

اس سلسلے میں انھوں نے فولاد کی صنعت اور فولاد سے متعلق منصوبوں کو اہم ترین بتایا اور کہا کہ دوسرے تمام منصوبوں کے ہدف تک پہنچنے کے لیے فولادی صنعت کے ہدف تک پہنچنا سب سے مقدم ہے۔

فولاد کی صنعت میں اب تک کی ترقیوں کا ذکر کرتے ہوئے کامریڈ کم ال سنگ نے بتایا کہ بہت قلیل عرصے کی کوشش سے ہی فی الوقت شمالی کوریا میں ایسی بڑی بڑی مشینیں بن رہی ہیں جو دراصل مشین سازی کی صنعت کو کسی جگہ بھی فروغ دے سکتی ہیں۔ یہ بڑی بڑی مصنوعات اچھے خاصے بڑے بڑے کارخانے تعمیر کر سکتی ہیں ۔

صنعتی ترقی اور عوام کو زیادہ سے زیادہ بلند معیار زندگی فراہم کرنے کی خاطر وسائلِ حمل و نقل کی طرف بھی شمالی کوریا کی حکومت نے بڑی توجہ دی اور معتدبہ ترقی کی ہے۔ ریل ، سڑک اور فضائی راستوں کے ذریعہ سے رسل و رسائل کی ترقی نے صنعت و تجارت کو بھی مدد دی اور عام زندگی میں بھی ان سہولتوں کے نتائج سامنے ہیں ۔

انتظامی سائنس

صنعتی ترقی کے سلسلے میں کامریڈ کم ال سنگ نے کہا کہ زرعی معیشت کے مقابلے میں صنعتی ترقیوں کی دیکھ بھال اور ان سے کماحقہ استفادے کے لیے بعض نئے فنی و سائنسی انتظامات ضروری ہیں،چنانچہ صنعت و تجارت کے لیے ایسے فنون کی تعلیم اور ایسے

آلات کی فراہمی کا قرار واقعی انتظام کر دیا گیا ہے جو پیداوار اور کھپت کے توازن کا اندازہ کراتی رہیں - یہ عام زبان میں انتظامی سائنس کہلاتی ہے مگر اس کا دائرہ بہت وسیع ہے اور ساری معاشی ترقی کا بہت کچھ دارومدار اس نئے فن سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنے پر ہے -

اپنی اس طویل تقریر میں جگہ جگہ ، کامریڈ کم ال سنگ نے عوام ، اہلِ دانش ، عوامی نمائندوں ، حکومت کے چھوٹے بڑے کارندوں اور نئے نئے فنون کے ماہروں کے درمیان زیادہ سے زیادہ تعاون اور اشتراکِ عمل پر زور دیا اور طبقاتی کشمکش سے ہر موقع پر نجات حاصل کرنے کی تلقین کی - ہر ایسے موقع پر حاضرینِ جلسہ نے ایسے جوش و خروش سے تالیاں بجا کے مقرر کے خیالات کا استقبال کیا کہ کئی کئی لمحے تقریر رکی رہی -

آزادی کا پھل

کسی مُلک کا آزادی حاصل کر لینا ایک بات ہے اور اس آزادی کے پھل اور اس کی نعمتیں عوام تک پہنچانے کا کام اپنی جگہ پر پہلے ہی کی طرح بہت بڑا کام ہے - اس تمہید کے ساتھ شمالی کوریا کے اس عظیم لیڈر نے اپنی تقریر کے آخری حصے میں چند بڑی دل آویز اور حقیقت پسندانہ باتیں کہہ ڈالیں - مثلاً یہ کہ انسانی آبادی "ملک" اور "قوم" کی حدود میں محدود رہتی ہے اور عوام کی ساری زندگی آزادی اور غلامی ، امیری اور غریبی ، ملک اور قوم کی آزادی و غلامی اور امیری و غریبی سے وابستہ رہتی ہے ، لہذا ملک و قوم کی آزادی کے بغیر عوام کی آزادی خواب و خیال ہے ! چنانچہ شمالی کوریا کے اس عظیم لیڈر نے خیال ظاہر کیا کہ اگر عوام آزاد ہونا اور آزاد رہنا چاہتے ہیں کہ اپنی زندگی کا ڈھانچہ اپنی مرضی کے مطابق بنائیں تو ان کو سب سے پہلے ملک اور قوم کو (طرح طرح کے بیرونی اثرات سے) آزادی دلانے کی کوشش کرنی چاہیے - اس کی کوشش کرنی چاہیے کہ ان کی حکومت ایک آزاد حکومت ہو کہ ایک آزاد حکومت ہی قومی تشخص اور عوام کی آرزوں کی ضمانت دے سکتی ہے - ایک آزاد

مطلق العنان ملک یا قوم یا آزاد و مطلق العنان حکومت کی پہچان ہی یہ ہے کہ وہ (اندرون ملک) ریاستی معاملات میں ، ملکی و قومی معاملات میں کسی سے متاثر ہوئے بغیر ایک آزاد پالیسی پر کار بند اور عمل پیرا رہ سکے۔

شمالی کوریا کے اس ستّر سالہ قائد نے دعوا کیا کہ اس کا ملک اور اس کی حکومت اپنی اندرونی اور خارجہ پالیسی مرتب کرنے میں ہمیشہ سے آزاد رہی ہے اور اسی لیے اس نے بڑے اطمینان سے خود اپنے لیے ایک نظریۂ حیات ـــــ جُوچے نظریہ تیار کر لیا اور اسی پر بلا کسی خوف و خطر کے عمل پیرا ہے۔

آزادی

کامریڈ کم ال سنگ نے یاد دلایا کہ ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے کہ شمالی کوریا یا کوریا نام کا کوئی آزاد ملک صفحۂ ہستی پر نہ تھا ، لیکن عوام اٹھے اور نہ صرف اپنی سر زمین کو غیروں سے آزاد کرایا بلکہ اپنی ایک ایسی آزاد حکومت قائم کر لی جو کسی دباؤ یا بیرونی اثر کے بغیر اپنے ملک کی بلا شرکتِ غیرے مالک ہے اور ایسی حکومت اور عوام کی آزادی لازم ملزوم ہوتی ہے ۔حکومت آزاد ہے تو عوام آزاد اور عوام آزاد ہیں تو حکومت پر کوئی بیرونی دشمن بُری نگاہ نہیں ڈال سکتا ۔

کامریڈ کم ال سنگ نے کہا کہ آیندہ بھی ہمارا یہی ارادہ ہے کہ ہم کسی کی تقلید کیے بغیر اور کسی کا اثر قبول کیے بغیر ، خود اپنی مرضی سے ، اپنے حالات کے مطابق ایسا کمیونسٹ معاشرہ بنائیں گے جو ہماری ضرورتوں اور آرزوؤں کو پورا کر سکے۔

انضمام

بالکل آخر میں شمالی کوریا کے لیڈر نے جنوبی کوریا کے انضمام کا مسئلہ چھیڑا۔ تقریر کے شروع میں بھی انھوں نے جاپان اور جنوبی کوریا سے آئے ہوئے وفدوں کا خاص طور سے شکریہ ادا کیا

تھا ، ان کی ہمت وجرات کی داد دی تھی اور اب تقریر ختم کرنے سے پہلے انھوں نے شمالی کوریا کی حکومت اور عوام کی یہ آرزو دُہرائی کہ شمالی و جنوبی حصے پھر سے ایک ملک بن جائیں۔ لیکن انھوں نے یہ وضاحت کر دی کہ ایسا اسی وقت ممکن اور قابل قبول ہو سکتا ہے کہ جب دونوں ملکوں کے عوام ، بلا کسی بیرونی مداخلت کے یہ طے کر لیں کہ ملک کے دونوں حصوں کو پھر سے ایک ملک بن جانا چاہیے ۔

اس کے لیے ، کامریڈ کم ال سنگ کے بقول، سب سے پہلے تو یہ ضروری ہے کہ جنوبی کوریا سے امریکی فوجیں واپس جائیں ۔

انھوں نے امید ظاہر کی کہ جس طرح وہ 'ہر اس شخص یا وفد سے دونوں حصوں کے انضمام کے سلسلے میں ملنے کو تیار ہیں جو بیرونی مداخلت کا مخالف ہو ، اسی طرح ان کو یہ بھی توقع ہے کہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا کہ کوریا کا جنوبی حصہ خود اپنے لیے پالیسی مرتب کرنے کا خواہاں ہوگا اور اپنی کوششوں سے ایسی پالیسی پر کاربند ہو سکے گا کہ شمالی حصے سے اس کا انضمام ہو سکے ۔

کامریڈ کم ال سنگ نے کہا کہ شمالی کوریا اور جنوبی کوریا متحد ہونے کے بعد ایک ایسے متحدہ آزاد ملک کی شکل میں نمایاں ہوں گے جو غیر جانبدار اور غیر وابستہ حیثیت سے ممتاز رہے گا ۔ متحدہ کوریا کسی ملک یا بلاک کا طفیلی ملک نہ ہوگا اور نہ اپنی کسی ضرورت کے لیے کسی سے امداد (خصوصاً فوجی امداد) لے گا ۔

یہ دور ہمارا دور، آزادی کا دور

انھوں نے عالمی سطح پر نظر ڈالتے ہوئے کہا کہ یہ دور ہمارا دور ، آزادی کا دور ہے ، ماضی میں جو ملک ظلم و ستم ، استبداد اور طرح طرح کے دباؤ کا شکار تھے آج کے دور میں دنیا کی بڑی طاقت بن کر سامنے آئے ہیں اور ان میں سے بعض کے لیے تو کہا جا سکتا ہے کہ دنیا پر حاوی ہیں اور مزید حاوی

ہوتے جا رہے ہیں بلکہ تاریخ کا دھارا موڑ دے رہے ہیں۔ آزادی کی لہر دنیا کے ہر براعظم میں محسوس کی جا رہی ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ بہت سے ملکوں میں عوام جو سامراج اور نوآبادیاتی نظام کے بند ھنوں سے آزاد ہوئے ہیں، اب بڑے زور و شور سے اور بڑے جوش و خروش سے شاہراہِ آزادی و ترقی پر تیز تیز قدم بڑھائے چلے جا رہے ہیں اور یہ سارے ترقی پسند اور ترقی پذیر ملک ان تمام رکاوٹوں کو ہٹانے اور ان تمام آثار کو مٹانے پر تلے ہوئے ہیں جو ماضی میں استعماری اور سامراجی عناصر نے ان کے راستے میں لاکھڑے کیے تھے۔

دیر تک تالیوں کی گونج کے ساتھ ہی کامریڈ کم ال سنگ نے کہا کہ بہت دلچسپ صورت حال یہ ہے کہ نہ صرف یہ کہ نو آزاد ملک بلکہ بہت سے وہ ممالک بھی کہ جو سرمایہ دار تھے اور سرمایہ دارانہ نظام کا خاص حصہ تھے اب ایک نئے معاشرے کی تعمیر کرتے، آزادی کی راہ اختیار کرتے نظر آ رہے ہیں۔ اسی طرح بڑے اعتماد اور وثوق کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب جو آزادی کا دور ہمارے زمانے میں شروع ہوا ہے یہ ہمارے عہد کا ایک ایسا خاصّہ ہے جسے نہ بدلا جا سکتا ہے نہ روکا جا سکتا ہے۔

اپنے ان خیالات سے سامعین کو آگاہ کرنے کے بعد چند جملوں میں کامریڈ کم ال سنگ نے ساری دنیا کے ترقی پسند عناصر سے اپیل کی کہ اس وقت آزادی کے متوالوں کی ہر ممکن مدد اور ہمت افزائی کریں اور کوشش کریں کہ ساری دنیا میں ہر ایک ملک، ہر آبادی، ہر طبقہ آزادی کی نعمت سے پوری طرح متمتع اور مستفید ہو سکے۔

اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے، انھوں نے وضاحت کی کہ ساری دنیا میں ہر ملک کی آزادی اس لیے بھی بہت ضروری ہے کہ عالمی جنگ کے خطرات سے نجات مل سکے، ایک ایسے دیرپا بلکہ مستقل امن و اماں کی فضا پیدا ہو جائے کہ جس کی بدولت ہر طرف فلاح و برکت کا دور دورہ ہو، عوام اطمینان کا سانس

لے سکیں اور ایک ایسا نیا انسانی معاشرہ مرتب کرنے کی طرف متوجہ ہوسکیں جو انسانیت کے شایان شان ہو۔

اپنی آزادی کو برقرار رکھنے اور دوسرے ملکوں کو آزادی دلانے کا ایک ضروری طریقہ یہ بھی ہے کہ ہر ملک اس کی کوشش کرے کہ بیرونی اثرات (فوج) کا اس کے ہاں عمل دخل نہ ہونے پائے۔ جب بیرونی ملکوں کے اثرات جو دراصل سامراجی چالیں ہیں، دوسرے کم سواد ملکوں میں ختم ہونے لگیں گے تو سامراجی طاقتیں اسی نسبت سے کمزور ہونے لگیں گی اور نتیجہ یہ ہوگا کہ آزادی کا جو دور شروع ہو چکا ہے اس کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی جائے گی اور آزادی کے کوشاں لوگوں کی مشکلات بھی کم سے کم ہوتی جائیں گی۔

کامریڈ کم ال سنگ نے آزادی حاصل کرنے اور اسے برقرار رکھنے کے لیے سب سے زیادہ ضروری بات یہ قرار دی کہ بین الاقوامی تعلقات میں اثرات اور دباؤ قبول کرنے کے بجائے غیر جانبدارانہ طور پر اپنے مفاد اور اپنی آزاد رائے اور مصلحتوں کو پیش نظر رکھا جائے۔ انھوں نے تسلیم کیا کہ فی الوقت دنیا میں چھوٹی بڑی ریاستیں بھی ہیں، امیر اور غریب ملک بھی ہیں، محتاج و غنی بھی ہیں، لیکن اگر یہ سب مل کر یہ طے کر لیں کہ ایک دوسرے پر قبضہ جمانے یا گرفت قائم کرنے کے بجائے سب کو ایک انسانی سطح پر لانے کی کوشش کی جائے گی تو تمام چھوٹے بڑے، امیر و غریب اور محتاج و غنی ملکوں کے عوام کا آپس میں دوستی، تعاون و اشتراک اور باہمی ہمدردی و احترام کا ایک خوشگوار و خوش آیند دور شروع ہو سکتا ہے۔ جس طرح کوئی ملک یہ نہیں چاہتا کہ اس کی آزادی، سالمیت اور خود مختاری پر حرف آئے اسی طرح دوسرے تمام ملکوں کو بھی یہ احساس ہونا چاہئے کہ کسی (چھوٹے یا اہل ضرورت) ملک کی آزادی، سالمیت یا خود مختاری کو خریدنے یا ہضم کر لینے کا ارادہ بھی نہ کیا جائے۔

اگر دنیا کی ساری (قابل ذکر) طاقتیں اس اصول پر کاربند ہو جائیں تو "حاکم" اور "محکوم" ملکوں کا فرق ختم ہو سکتا ہے اور اس طرح انسانوں کے درمیان کشمکش، کشاکش

اور کھنچاؤ تناؤ کی بہت بڑی وجہ ناپید ہو سکتی ہے ۔

اپنی تقریر کے اس حصے میں کامریڈ کم ال سنگ نے غیر جانبدار یا غیر وابستہ تحریک کو زیادہ سے زیادہ فعال ، کارآمد نیز اس کے دائرۂ عمل کو وسیع تر کرنے پر بڑا زور دیا ۔ انھوں نے رائے ظاہر کی کہ غیر جانبدار تحریک کو جتنا فروغ ہوگا اور غیر وابستہ ممالک کی تعداد جتنی زیادہ ہوتی جائے گی ، اتنا ہی عالمی سطح پر اور بین الاقوامی اداروں میں کسی بڑے ملک کے لیے یہ مشکل ہوتا جائے گا کہ وہ کسی چھوٹے ملک کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھائے یا مظلوموں کی آواز کو دبایا جا سکے ۔ یہ صورت حال پیدا ہو جائے تو نہ صرف چھوٹی اور ترقی پذیر قوموں کے درمیان یکجہتی کا جذبہ بڑھے گا بلکہ ان کی مادّی ترقیوں کی راہیں بھی وسیع تر ہوتی جائیں گی اور ان کی مالی مجبوریاں کم ہونے لگیں گی جو آج کی بڑی طاقتوں کو دعوتِ جرات دیتی رہتی ہیں ۔ یہ سب ہو جائے تو " ہمارا " وعدہ اور مقصد پورا ہونے لگے گا ، یہی صورتِ حال تو " اشتمالی تحریک" کی معراج ہے !

ان خیالات کے اظہار کے بعد انھوں نے اپنے ملک کی اندرونی حالت کا جائزہ لیا ۔قوم کے ہر طبقے سے اپیل کی کہ ملک کی ان ترقیوں پر نظر ڈالیں جو موجودہ حکومت کے دور میں ہوئی ہیں اور پھر حکومت کو مزید اقدام کرنے کے لیے زیادہ طاقتور بنانے کی کوشش کریں ۔

اپنی قوم ، پارٹی اور حکومت کے حق میں نعرۂ ہائے تحسین و ہل من مزید کی تادیر تکرار اور گونج کے بعد ، کامریڈ کم ال سنگ نے اپنی تقریر اس دعا پر ختم کی کہ دنیا بھر کے ان عوام کے باہمی اشتراک و تعاون اور باہمی دوستی میں اضافے پر اضافہ ہوتا جائے جو آزادی کے لیے کوشاں اور شاہراہِ آزادی پر افتاں وخیزاں، رواں دواں ہیں ۔

تاثرات

میں نے صدر کم ال سنگ کی تقریر کو پوری توجہ سے سنا اور اگر کسی وجہ سے انگریزی چینل میں رخنہ پڑا تو عربی چینل سے میں نے استفادہ کیا۔ میرا ذہن اس سے بھی خالی نہ رہا کہ کاش میں اردو ترجمہ بھی سن سکتا! اگر ہندستان میں اردو کی جگہ ٹھیٹھ ہندی کی کوششیں نہ ہوتیں اور پاکستان میں اردو میں فارسی اور عربی کو سمونے کی پر جوش کوشش نہ ہوتی تو اردو پورے برصغیر ہند و پاک کی ایسی زبان تھی اور ہے کہ جسے ہر فرد بشر سمجھتا ہے۔ یہ بڑی دل چسپ حقیقت ہے کہ کسی نہ کسی طور اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دیا گیا ہے اور ہندی کو ہندوؤں کی زبان سمجھا گیا ہے۔ اس خیال کو ختم کرنے کے لیے "ہندستانی" کی تجویز رکھی گئی تھی، مگر وہ بھی نذر بدگمانی ہوگئی۔ بہ ایں ہمہ اگر زبان کے باب میں پاکستان اور ہندستان متحد الفکر ہوجائیں تو اب دونوں ممالک کی مشترکہ زبان کی حیثیت ایسی ہو سکتی ہے کہ اقوام متحدہ اسے تسلیم کرے، اور وہاں اس زبان کو ساتویں زبان کی حیثیت سے تسلیم کر لیا جائے۔ اس وقت اقوام متحدہ اور اس کے ذیلی اداروں کی زبان انگریزی، فرانسیسی، روسی، عربی، چینی اور اسپینی ہیں۔

صدر کم ال سنگ کی تقریر کے متون فرانسیسی، عربی اور انگریزی زبان میں تقسیم ہوئے ہیں۔ یہ وہ زبانیں ہیں کہ جو ایشیا اور افریقہ میں پوری طرح سمجھی جاتی ہیں۔ میرا تاثر یہ ہے کہ اشتراکیت کے بار آور ہونے کے لیے افریقہ اور ایشیا کے میدان مناسب سمجھے گئے ہیں اور کم ال سنگ صاحب کی توجہات زیادہ تر ان علاقوں پر ہیں۔ دنیائے عرب کی شکست و ریخت کو وہ لابدی سمجھتے ہیں اس لیے وہ اس دنیا میں اشتراکیت کے بیج آج ڈال دینا چاہتے ہیں۔ وہ بہ ظاہر اس حقیقت سے بھی غافل نہیں ہیں کہ سارے افریقہ میں اسلام کے لیے بیداری پائی جاتی ہے۔ اس بیداری کو دنیائے عرب میں نظریاتی شکست سے بڑا صدمہ پہنچے گا۔ اس نقصان کو بھی دنیائے عرب نے صریحاً نظر انداز کیا ہے۔ افریقہ میں عیسائیت برسرعمل ہے اور اس کا اسلام سے براہ راست مقابلہ ہے۔ اب فیصلہ مستقبل کے ہاتھ میں ہے کہ اسلام سے مایوسی کے بعد افریقہ عیسائیت کی گود میں جائے گا یا اسے اشتراکیت میں پناہ

ملے گی ۔اگر اس حقیقت کو تسلیم کر لیا جائے ، اور تسلیم نہ کرنا بڑی شدید غلطی ہوگی ، کہ مستقبل قریب میں افریقہ سب سے بڑی طاقت بن کر ابھرے گا اور اس کی عظمت پر قدغن شاید ممکن نہ ہوگی تو نہیں کہا جا سکتا کہ عظیم افریقہ کا مزاج و رجحان کیا ہوگا۔ عالمی مدوجزر سے اس کا بڑا گہرا تعلق ہے۔

ان تقریبات سہ روزہ میں چین کا موثر وفد نہیں ہے ۔ میرے نزدیک یہ ایک بڑی اہم بات ہے ۔ پھر میں نے نوٹ کیا ہے کہ صدرِ چین کے پیغامِ تہنیت وتبریک کو پیونگ یانگ ٹائمز نے صرف تین سطروں میں شائع کیا ہے جبکہ صدرِ روس کا پیغام پوری اہمیت کے ساتھ اسی صفحے پر شائع کیا گیا ہے ۔

اس خطۂ ارض کی سیاست بڑی پیچیدہ ہے۔صدر کم ال سنگ کی تقریر میں کسی ملک کا نام نہیں لیا گیا ہے اور انھوں نے عالمی سیاسیات کو کم سے کم چھیڑا ہے ، بلکہ کہنا چاہئیے کہ نظرانداز کیا ہے۔ گزشتہ دنوں جب چین کے جناب جینگ نے شمالی کوریا کے غیر فوجی (ڈی ملٹرائزڈ) علاقے کا دورہ کیا تو نارتھ کوریا نیوز ایجنسی کے مطابق ان کا بیان تھا :

> " ــــ امریکا کسی تاخیر کے بغیر جنوبی کوریا سے اپنی افواج کو واپس بلا لے اور تمام فوجی تنصیبات کو اٹھا لے ــــ "

مگر چین کی سرکاری نیوز ایجنسی نے مسٹر جینگ کے اس مطالبے کو اپنی خبر میں صریحا نظر انداز کیا ہے۔ اس روشنی میں جب صورت حال کا میں جائزہ لیتا ہوں تو میرا تجزیہ مجھے اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ چین کا غیر اعلان کردہ موقف یہ ہے کہ امریکی افواج و تنصیبات کی جنوبی کوریا میں موجودگی اس مجمع الجزائر میں استحکام کے لیے فی الحال ضروری ہے اور جو صورتِ حال اس وقت ہے اسے قائم رہنا چاہیے ۔

میری رائے ہے کہ ذہنی طور پر صدر کم ال سنگ ہنوز کسی منزل پر نہیں پہنچے ہیں ۔ ان کو روس اور چین دونوں سے

واسطہ ہے ، ان کو کدھر جھکنا ہے اس کا فیصلہ ہنوز انھوں نے نہیں کیا ہے۔ان کو ہنوز اندازہ نہیں ہو سکا ہے کہ شمالی کوریا اور جنوبی کوریا کے انضمام میں کون سی طاقت ان کی فیصلہ کن مدد کر سکتی ہے۔ ان کو یقیناً اس کا پوری طرح اندازہ ہے کہ جہاں تک اس معاملے کا تعلق ہے امریکا اور روس کو اتحادی کی تعریف میں لایا جا سکتا ہے۔ مگر حالاتِ حاضرہ میں کیا چین شمالی کوریا کی کوئی مؤثر مدد کر سکتا ہے جبکہ وہ بہ ظاہر امریکا کا حلیف ہے مگر تائیوان کے معاملے میں امریکا سے شدید اختلاف رائے رکھتا ہے اور امریکا - تائیوان معاہدہ کی بشدت نفی کرتا ہے۔ کم ال سنگ اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ دونوں کوریاؤں کے انضمام کے لیے جنیوا میٹنگ میں جناب چو- این - لائی نے سب سے زیادہ شدومد کے ساتھ تائید کی تھی ، مگر چین کی موجودہ حکومت کا یہ اندازِ فکر بہ ظاہر نہیں ہے اور وہ اس علاقے میں پیش آمدہ حالات و مسائل کا جائزہ مکمل نہیں کر سکی ہے -

میرا تاثر یہ ہے کہ صدر کم ال سنگ شمالی کوریا کی جنگی تیاریوں سے مطمئن ہیں اور ان کو یہ اطمینان ہے کہ شمالی کوریا سے ہر ۲۵ سکنڈ پر اڑنے والا جہاز سیول تک دس منٹ میں پہنچ کر مسئلے کو حل کر سکتا ہے - مگر وہ کسی لمحے بھی اس خطرۂ عظیم سے غافل نہیں ہیں کہ ان کے اس اقدام سے اس علاقے میں ایٹمی جنگ ظہور پذیر ہو سکتی ہے-جنوبی کوریا میں امریکا کی ایٹمی تنصیبات اس کا واضح اشارہ ہیں کہ امریکا شمالی کوریا کی غیر معمولی عسکری طاقت سے آگاہ ہے اور جانتا ہے کہ شمالی کوریا سے غیر ایٹمی جنگ میں اسے ہزیمت ہو سکتی ہے- چین ایسے حالات میں معاون نہیں ہو سکتا جبکہ روس اپنی توسیع پسند پالیسی کی وجہ سے شمالی کوریا کی مدد کر سکتا ہے اور اس علاقے کو کلیۃً چین کے زیر نگیں جانے سے روکنے کا فیصلہ کر سکتا ہے -ایسی صورت میں خود چین کے لیے جو مسائل پیدا ہو سکتے ہیں ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

میں جب اس مسئلے پر ذاتی حیثیت میں غور کرتا ہوں تو

میں بہر حال تقسیمِ کوریا کو شدت کے ساتھ ناپسند کرتا ہوں اور اس کا حامی ہوں کہ جنگ و جدل کے بغیر انضمام کوریا کا عمل ہو جانا چاہیے - تقسیم کا یہ عمل بالادست اقوام کا ایک تباہ کن ہتھیار ہے جسے وہ شدت و کثرت سے استعمال کر کے اقوام وملل کو کمزور و ناتواں کر کے اپنے اثرات کو وسعت دیتی چلی جا رہی ہیں - سیاسیات سے قطع نظر صدر کم ال سنگ کی تقریر میں میں نے جس موضوع کی غیر موجودگی کو بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا وہ ہے طب و صحت - میں جانتا ہوں کہ صدر کم ال سنگ طب و صحت کو پوری اہمیت دیتے ہیں - بہ ایں ہمہ پالیسی تقریر میں اس موضوع کا عدم غور طلب ہے - مجھے اس سے بے اطمینانی ہوئی ہے -

اس تقریر کا ایک پہلو نہایت واضح ہے ، اور وہ یہ ہے کہ صدر کم ال سنگ اپنی دوستی کو عالمی سطح پر لے جانے کے آرزومند ہیں - وہ جوچے تحریک کے ذریعہ سے اپنی آواز کو گوش ہائے ملل تک بڑی احتیاط و شدت کے ساتھ پہنچا رہے ہیں - ان تقریبات میں ان کے حلقہ ہائے اثر کا کسی نہ کسی درجے میں اندازہ ہوجاتا ہے اور ان کی اولیتوں میں ممالک افریقہ کو دیکھ کر ان کے مستقبل کے عزائم کا اندازہ لگانا ممکن ہے -

گزشتہ دنوں ہندستان کے دارالحکومت نئی دہلی میں جوچے نظریہ پر ایک بین الاقوامی کنگرس کا انعقاد معنی خیز ہے - اس کو بڑی احتیاط کے ساتھ سمجھنا چاہیے - ہندستان کے علاوہ درجنوں ممالک میں جوچے نظریہ کی تبلیغ کے مراکز کا قیام قابل غور ہے - ان میں پاکستان کا دارالحکومت بھی شامل ہے - ان مراکز کے تمام عہدہ داران تقریبات جنم دن میں احترام کے ساتھ شریک کیے گئے ہیں اور ان کے لیے خصوصی ہوائی جہازوں کا اہتمام کیا گیا ہے - ہندستان ، بنگلہ دیش اور سری لنکا کے مندوبین کو لانے کے لیے پاکستان انٹرنیشنل ائیر لائنز کا ایک جہاز چارٹر کیا گیا - بنگلہ دیش اور ہندستان سے رقص و سرود کے طائفے آئے ہیں اور ان کی پرفورمنس کو کوریا ٹیلے وژن پر سب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے -

پاکستان کی نمائندگی

ان تقریباتِ جشنِ جنم کم ال سنگ میں پاکستان کی نمائندگی وزیر صنعت جناب الٰہی بخش سومرو صاحب کر رہے ہیں ۔ہندستان کی نمائندگی شریمتی رام دلاری سہنا فرما رہی ہیں کہ جو وزیر مملکت برائے صنعت ، اسٹیل اینڈ مائنز ہیں ۔ظاہر ہے کہ اس روشنی میں پاکستان سے وزیر صنعت ہی کو آنا چاہیے تھا !پاکستان کے جناب وزیر صنعت یہاں اس امر کے لیے سخت کوشاں سنے گئے ہیں کہ ان کی ملاقات علحدگی میں صدر کم ال سنگ صاحب سے ہو جائے اور شریمتی رام دلاری سنہا نے مجھے بتایا کہ وہ اس کوشش میں ہیں کہ ان کو مائنز اور اسٹیل کے مراکز دکھا دیے جائیں ۔

ڈیس یا اسٹیج پر میری نظروں نے شیروانی کو تلاش کیا مگر شیروانی میں ہندستان کے نمائندے مجھے ملے اور بہ مشکل میری آنکھوں نے جناب سومرو صاحب کو چوتھی قطار میں تلاش کیا کہ جو سوٹ بوٹ میں ملبوس تشریف فرما تھے ۔جہاں تک مجھے معلوم ہے اس قسم کی سرکاری تقریبات میں نمائندگانِ پاکستان کو شیروانی زیب تن کرنے کی ہدایت ہے ۔

قوس فتح و نصرت

(قوس العودہ المظفرہ)

پیپلز پیلیس میں ارشاداتِ صدر کم ال سنگ ختم ہوئے ۔ میں ذہنی طور پر ہنوز ان کے نشیب و فراز میں تھا کہ "گائڈ" اور مترجم نے اگلا پروگرام بتایا کہ "آرچ اوف ٹرائمف" چلنا ہے کہ آج اس نئی تعمیر کردہ قوس فتح و کامرانی کا افتتاح ہونا ہے ۔ہال سے ہزارہا مرد و زن ایسی تنظیم سے اٹھے اور باہر آئے کہ ذرا پتا نہ چلا ۔ باہر سواریاں تیار تھیں ۔ کم از کم دو ہزار موٹر کاریں ترتیب و تنظیم سے کھڑی تھیں ۔سب ان میں بیٹھ گئے اور قطار اندر قطار وہ سوئے قوس چل پڑیں اور ذرہ برابر ٹریفک جام ہوئے بغیر ہم سب کے سب

قوس فتح پہنچ گئے -

یہاں دیکھا تو ہزارہا بلکہ کہنا چاہیے کہ لاکھوں لوگ پہلے ہی سے موجود تھے- عساکر کوریا بھی اور عوام بھی ، اور خواص بھی- خواص ان کو کہا جا سکتا ہے کہ جو غیر ملکی مہمان ہیں- میں نے دیکھا کہ یہاں ایک جوش و خروش ہے- جسے دیکھا اسے سرخ رو پایا - افواج میں بڑا وقار ہے -نئی وردیاں اور امتیازی نشانات ان کو ممتاز کرتے ہیں -عوام ہیں کہ مسرت سے جھومے جاتے ہیں-ان کے ہاتھوں میں پلاسٹک پھول ہیں-بچوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے- بلاشبہ یہ سب کے سب طالب علم ہیں- ان کی مسرتیں دو بالا ہیں-

قوس فتح (آرچ اوف ٹرائمف) اُس فتح و نصرت اور کامرانی کی یاد میں اہل کوریا اور افواج کوریا نے تعمیر کی ہے جو اسے جاپان پر حاصل ہوئی ہے اور امریکا پر-قوس کی تعمیر کے ہر مرحلے پر مارشل کم ال سنگ کی رہنمائی حاصل رہی ہے- ٹیلی وژن کے ایک پروگرام میں دکھایا گیا ہے کہ کم ال سنگ کس طرح تعمیر قوس میں سب کے ساتھ کام کرتے رہے ہیں اور عساکر کوریا کے پہلو بہ پہلو رہے ہیں - بلاشبہ وہ افواج و عساکر کہ جن کو اپنی خودی سے محبت ہوتی ہے اور جنھیں اپنی رفعت و عظمت سے دل چسپی ہوتی ہے اور جن کو ہر ذرۂ وطن دعوت تقدیس دیتا ہے وہ خودداری ، خود اعتمادی اورخودی کے ایسے ہی کارنامے سر انجام دیا کرتی ہیں -

مگر وہ افواج و عساکر کہ جن کو اپنی منزل معلوم نہیں وہ بھٹکا کرتی ہیں- اپنے فرائض ادا کرنے کے بجائے سہولتوں کا حصول ان کی توجہ کا مرکز اور ان کی سعی کا محور ہوتا ہے- یہ وہ افواج ہوتی ہیں کہ جن کو تعمیر وطن سے کوئی دل چسپی نہیں ہوتی مگر تعمیر ذات جن کا منتہائے مقصود ہوا کرتا ہے -عساکر طاغوت ان کے سینوں پر آویزاں چمکتے ہوئے نشانات عظمت نوچ نوچ کر پھینک دیتی ہیں- وہ افواج و عساکر کہ جن کے لیے آسائشوں کی فراوانیاں فراہم ہوتی ہیں ، سواریوں کے لیے موٹر کاریں حاضر رہا کرتی ہیں، کمرے اور بیرکیں جن کی ایئرکنڈیشنڈ ہوتی ہیں ، وال ٹو وال

کارپٹ سے جن کے دفاتر مزین ہوتے ہیں ان سے تعمیر اور سعی و جہد کی کوئی توقع قائم نہیں کی جا سکتی - ان کو افواجِ طاغوت آج پارہ پارہ کر رہی ہیں -

افواج کے بارے میں یہ تاثرات اضطراری طور پر نوکِ قلم پر آکر حرفوں میں ڈھل گئے ہیں- اب ان کو حذف کر دینے کا کوئی فائدہ نہیں ہے - ان کا عدم اظہار عدم دیانت ہوگا - ایک وہ افواج و عساکر ہیں کہ غیر ملکی تسلط کو پارہ پارہ کر کے اور آزادیٔ کامل حاصل کر کے اپنی فتح و نصرت کی یادگاریں قائم کر رہی ہیں اور ہم ایسی افواج سے ناواقف نہیں ہیں کہ جو اپنے ہی ہم وطنوں کو فتح کر رہی ہیں مگر بہ ایں ہمہ ان سے کوئی کارنامہ سرزد نہیں ہوا ہے کہ وہ اس پر فخر کر سکیں اور فتوحات کے نشانات قائم کریں، اور سرِ افتخار بلند کر سکیں -

میرے دل میں ایک تلاطم برپا تھا ، فکر و نظر کا ایک ہیجان تھا کہ اس سے میرا دماغ پھٹا جا رہا تھا - ایک پورا عالم اسلام تھا کہ بیک آن میرے دل و دماغ میں سمایا ہوا تھا اور اس کا جو آج حال ہے میں اس کا موازنہ اس جدوجہد سے کر رہا تھا کہ جو کوریا میں میرے سامنے تھی ! ایک قوم ہے کہ غلامی کا طوق اپنی گردن سے اتار کر پھینک رہی ہے اور دوسری طرف اقوام وامم کا حال یہ ہے کہ وہ اپنی خودی کا سودا کر رہی ہیں اور عیش و عشرت ان کی خودداری اور خود اعتمادی کا ارزاں سودا کر رہا ہے - ان کے چراغ ہیں کہ پھونکوں سے بجھے چلے جا رہے ہیں اور فراوانیاں ہیں کہ ان کو تاریکیوں میں لیے جا رہی ہیں -

شمالی کوریا کے وزیر دفاع جناب او جن یو وہ شخصیت ہیں کہ جدوجہد آزادی میں مارشل کم ال سنگ کے شانہ بہ شانہ تھے - آزادی کی جو قیمت کوریا اور اہل کوریا نے ادا کی ہے اس سے یہ بہ خوبی آگاہ ہیں - آزاد کوریا کا جو مقامِ ارفع ہے اس کی حقیقتیں ان کو معلوم ہیں - اس موقع مسرت و نصرت پر ان کو پورا پورا حق حاصل ہے کہ وہ اپنے جذبات کا اظہار کریں اور قوس فتح کے افتتاح کے اس موقع پر حقائق کو پیش کریں - مجھے ان کی

تقریر کا انگریزی اور عربی متن مل گیا تھا اور میں اسے سامنے رکھ کر وزیر دفاع کی تقریر سنتا رہا اور جن جن مقامات پر عوام اپنے جذبات کا اظہار نعرہ ہائے تحسین و آفرین سے کرتے رہے اسے نوٹ کرتا رہا۔

اچھا ہے کہ میں اس موقع پر کی گئی تقریر کو یہاں درج کردوں:

خطاب وزیر دفاع شمالی کوریا

(۱۴/ اپریل ۱۹۸۲ء)

عظیم قائد کامریڈ کم ال سنگ کی سترویں سالگرہ کی تقریب میں شرکت کے لیے آنے والے تمام معزز مندوبین ، کامریڈ ، بیرون ملک سے آنے والے حکومتوں اور پارٹیوں کے نمائندگان !

تمام باشندگان پیونگ یانگ !

دوسرے تمام کامریڈ اور غیر ممالک سے آئے ہوئے دوستو !

ہم اپنے عظیم قائد ، کامریڈ کم ال سنگ کو سترویں سالگرہ کی مبارک باد دیتے ہوئے آج اس عظیم الشان قوس فتح کی نقاب کشائی کی دل آویز تقریب منانے جمع ہوئے ہیں - یہ عظیم الشان قوس فتح جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں ، بڑے تاریخی موران پہاڑ کے دامن میں تعمیر ہوا ہے اور اس کی تعمیر میں بلا استثنا کوریا کے ہر ہر فرد کی آرزوئیں ، تمنائیں ، محنت اور سب کی مشترکہ جدوجہد کی نشانیاں جلوہ فرما ہیں -

ہمارے عظیم قائد کامریڈ کم ال سنگ نے عمر کا بہت بڑا حصہ ملک کو آزادی دلانے ، جاپان کے استحصالی قبضے سے نجات دلانے اور اس ساری جدوجہد کی پیش بندی اور نگرانی کرنے میں صرف کر دیا اور مادر وطن کو غیروں کے تسلط سے آزاد کرانے کے بعد تعمیری انقلاب کی سرکردگی میں بیس برس گزار دینے اور اپنی شاندار کامیابی کا اعلان کرنے کے لیے یہ عظیم قائد اس پہاڑ کے دامن میں اسی جگہ ہم سے مخاطب ہوا تھا ، اور ہم نے اسی جگہ اس کی اتنی شدومد سے جنگ آزادی میں قیادت کا اور اس شاندار کامیابی کے لیے اس کا شکریہ ادا کیا تھا - شہر پیونگ یانگ

کا یہ میدان اسی لیے بڑا تاریخی میدان ہے ، جہاں آج آپ " قوس فتح " دیکھیں گے۔

اس تاریخی مقام پر قوس فتح کی تعمیر اس بات کا ثبوت اور مظہر ہے کہ ہم ، من حیث القوم ، اپنے عظیم قائد کے کارناموں کو آیندہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ جاوید بنانے کا عزم مصمّم کر چکے ہیں اور ہمارا یہ کارنامہ اس عظیم قائد کی سترویں سالگرہ کے موقع پر ساری دنیا کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے ۔

کوریا کی مزدور پارٹی کی مرکزی کمیٹی کی پالٹ بیورو کی ہدایت و اجازت سے میں آج یہ خوشگوار فریضہ ادا کر رہا ہوں کہ ان تمام افراد کا شکریہ ادا کروں کہ جو فوج ظفر موج کی شکل میں ، معمولی مزدور و معمار کی حیثیت سے جنھیں ہم آج Shock Brigade کہتے ہیں ، اس عظیم الشان قوس فتح کی تعمیر میں شب و روز مصروف رہے۔ ان کے دلوں میں جو جذبہ اس کام کے لیے ان کو اکساتا رہتا تھا ، یہی تھا کہ عظیم قائد کی جدوجہد اور ان کی زبردست خدمات کے لیے ان کا تہہ دل سے شکریہ ادا کریں ۔ان مزدوروں اور معماروں میں شہر پیونگ یانگ کے سارے شہری بھی شریک تھے اور میں ان کی خدمت میں بھی شکریہ پیش کر رہا ہوں جنھوں نے کسی نہ کسی حیثیت سے اس کی تعمیر میں حصہ لیا ۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ آج کے اس اجتماع میں اندرون ملک کے مہمانوں کے علاوہ ، بیرون ملک سے آئے ہوئے اپنی اپنی ملکی و قومی پارٹیوں کے نمائندے اور اپنی اپنی حکومتوں کے سرکاری نمائندے بھی تشریف فرما ہیں جو ہمارے عظیم قائد کی سترویں سالگرہ کی تقاریب میں شرکت کے لیے ہمارے ہاں آئے ہوئے ہیں - میں ان سب کی خدمت میں عرض کر رہا ہوں کہ سالگرہ کی تقریبات اور خصوصاً آج کی قوس فتح کی اس تقریب میں آپ حضرات کی شرکت نے ہمارے حوصلے بلند کیے ہیں اور ہماری خوشیوں میں بڑا اضافہ کیا ہے۔

میں ان تمام شرکائے جشن کی خدمت میں ، جو باہر کے ملکوں کے سرکاری نمائندوں یا اپنی اپنی پارٹی کے نامزد مندوب کی حیثیت سے

یا ہمارے کامریڈ بن کر ہمارے اس پُر مسرت موقع پر ہماری خوشیوں میں شریک ہونے آئے ہیں ، ہدیہ صد تبریک و تشکر پیش کرتا ہوں اور ان تمام بیرونی کامریڈ بھائیوں کا خاص طور سے ممنون ہوں کہ جنھوں نے اس " قوس فتح " کی تعمیر کے سلسلے میں بڑے پُرخلوص تعاون سے کام لیا ہے ۔

کامریڈ بھائیو ! مجھے اجازت دیجئیے کہ اس قوس فتح کی نقاب کشائی کے وقت میں ایک مرتبہ اور یاد دلاؤں کہ یہ قوس فتح ایک عظیم یادگار ہے ہمارے عظیم قائد کامریڈ کم ال سنگ کے زبردست کارناموں کی جو انھوں نے ملک و قوم کو بیرونی اثرات کی غلامی سے نجات دلانے میں انجام دیے ۔ان کی ساری جدوجہد ایک بڑی دلآویز داستان ہے بلند ہمتی اور حوصلہ مندی کی ، شب و روز لگاتار محنت کی ، جسمانی و ذہنی اذیتوں کی اور غیر معمولی ذاتی قربانی و ایثار کی اور ان کا بہت بڑا تحفہ ہمارے لیے نظریۂ جُوچے کی شکل میں آج ہمارا سب سے بڑا مطمحِ نظر ہے ۔

واضح باد کہ ہمارے اس عظیم قائد ، کامریڈ کم ال سنگ نے آزادی کی جدوجہد میں ہماری کوئی پچاس سال رہبری کی ہے۔ اس عرصے میں وہ مدتوں جاپانی استحصال اور قبضہ سے ملک و قوم کو نجات دلانے کی جدوجہد کرتے رہے ۔ ان کے انقلابی کارنامے بالآخر بارآور ہوئے اور پھر انقلاب کے بعد کی تعمیر میں ،اس پورے تعمیری دور میں انھوں نے قدم قدم پر شب و روز ہماری رہبری کی ، ساری قوم نے ان کی ہر ایک آواز پر لبیک کہا اور آج یہ صورت حال ہے کہ ساری قوم یہ محسوس کر رہی ہے کہ وہ کیسے کیسے انقلابات سے گزر کر اب اپنے پیروں پر کھڑی ہے اور اسے استحکام حاصل ہے ۔

آج اس عظیم قائد کی رہبری میں ، اس کی قیادت اختیار کر کے ، ہماری قوم کو ایسی بلند و بالا حیثیت نصیب ہوئی ہے جو اسے گزشتہ پانچ ہزار سال میں کبھی نصیب نہ ہوئی تھی۔ آج ہم اپنی قسمت کے آپ مختار و معمار ہیں ، ہماری ایک امتیازی شان ہے ، ہم مضبوط ہیں اور مستحکم ہیں ۔

ہم نے یہ محسوس کیا ہے کہ ہماری عظیم قوم پر یہ جو افتاد پڑی تھی کہ ہم ایک عرصے تک غیروں کے غلام بے دام بنے رہے وہ صرف اسی وجہ سے تھی کہ ہمارا کوئی بڑا قائد ، کوئی بڑا رہبر نہ تھا ، ہم قومی طور پر قیادت سے محروم تھے اور جیسے ہی یہ محرومی ختم ہوئی اور ہمیں کامریڈ کم ال سنگ کی ذات میں ایک عظیم قائد نصیب ہوگیا ، مصائب کا دور ختم ہوا ، ہماری جدوجہدِ آزادی کی تاریخ ہی بدل گئی ، فتح پر فتح اور کامیابی پر کامیابی ہمارے قدم چومنے لگی ۔

اس عظیم قائد نے ایک شاندار نظریہ ہمیں " جوچے " کی شکل میں دیا ، یعنی خودی و خودداری و خود اعتمادی و خود شناسی کا جذبہ ، اور خود بھی اسی نظریے پر عمل پیرا ہو کر اس کی عملی تعلیم ہم سب کو ایسی دی کہ انقلاب کے ذریعہ سے صراطِ مستقیم ہمارے سامنے آگئی ۔ اسی نظریے پر پوری قوم اس طرح عمل پیرا ہوگئی کہ انقلاب کے دوران جو تاریک دور آگیا تھا وہ بھی ختم ہوا اور ہم نے جاپان کا عائد کردہ نو آبادیاتی نظام بدل ڈالا ، جاپانی سامراج کا طوق اپنے گلے سے اتار پھینکا اور وہ تاریخی کامیابی حاصل کی جس نے ہم کو آزادی کی فضا میں سانس لینے کا موقع دیا ۔

کامریڈ کم الِ سنگ کی رہبری اور سرکردگی میں ہم نے جاپان کے خلاف جو جنگِ آزادی جیتی اس کی بدولت ساری قوم میں مسرت کی ہر دوڑ گئی ، ہماری امنگیں ابھر آئیں ، سارا ملک کوریا شادیانوں سے گونج اٹھا اور (ایسا معلوم ہوتا ہے کہ) ابد الآباد تک کے لیے اہالیانِ کوریا کی فلاح و بہبود کا سامان مہیا ہوگیا ہے ۔

قومی آزادی و خود مختاری کے حصول کے ان لمحات میں ساری قوم کی نظریں ، شکو و امتنان کے ساتھ عظیم قائد کم ال سنگ کی طرف اٹھنے لگیں ۔ وہ ہمارے لیے قطب تارے کے مانند تھے اور جیسے جیسے ان کی قیادت میں ہم کو جاپانی سامراج کے خلاف کامیابی پر کامیابی حاصل ہونے لگی ، ویسے ہی ویسے ہماری یہ بے تابی بڑھنے لگی کہ وہ وقت جلد آئے کہ ہم اپنے عظیم لیڈر کا عظیم الشان استقبال کرنے کا اہتمام کریں ۔

چنانچہ وہ وقت آ گیا اور ۱۲ / اکتوبر ۱۹۴۵ء کو ہم ، ہماری قوم کے ہزارہا ہزار افراد ، اسی صحن میں اسی میدان میں اس غرض سے آ کر جمع ہوئے کہ اس عظیم الشان ہستی ، اس عظیم المرتبت قائد ، کم ال سنگ کی خدمت میں ہدیۂ تشکر و امتنان پیش کرنے کا تاریخی کارنامہ سر انجام دیں ۔

اس عظیم المرتبت قائد ، کم ال سنگ نے جو سالہا سال کی جدوجہد ، جسمانی و ذہنی مشقت کی بدولت تھک کر چُور ہو گیا تھا جب گھر آیا تو ہمارے استقبال پر آگے بڑھا اور بھر پور قوت کے ساتھ ہمیں ایک اور تحفہ دیا اور یہ تحفہ تھا انقلاب کی کامیابی کے بعد تعمیر جدید کا منصوبہ اور اس کے لیے عملی طور پر ایک پارٹی ، ایک جماعت " جنرل اسٹاف آوف کورین ریوولیوشن" (اہالیاں کوریا کے لائے ہوئے انقلاب کے بعد تعمیر کے لیے فوجی تنظیم کے ذریعہ سے تعمیر جدید کی پیش کش) ۔ اس طرح اس عظیم قائد نے ہمارے استقبال کے جواب میں ساری قوم کو اس ہدیہ سے نوازا ۔

اس ملک کی طویل تاریخ میں وہ عظیم الشان اجتماع اپنی نظیر آپ ہی ہے جو اس عظیم المرتبت قائد کے استقبال کے لیے پیونگ یانگ کے باشندوں نے اس میدان میں پیش کیا تھا ۔ اس پُر مسرت موقع کو انتہائی مسرتوں سے بھرا ہوا تاریخی واقعہ کہنا چاہئے ۔

تاریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ اس میدان میں اس عظیم المرتبت لیڈر کی اتنی کامیابی کے ساتھ شاندار واپسی پر " کم ال سنگ زندہ باد " کے جو فلک شگاف نعرے بلند ہوئے تھے اور جن کی گونج آج بھی سنائی دے سکتی ہے ، دراصل ساری قوم ، تمام اہالیان کوریا کے صمیم قلب سے نکلی ہوئی آواز تھی جس میں شکر گزاری اور احسان مندی کے جذبات کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے ۔ ان نعروں میں یہ وعدہ بھی مضمر تھا کہ ساری قوم ہمیشہ ہمیشہ اس عظیم قائد کا احسان مانے گی ، ہمیشہ ہمیشہ اس کی ہدایات پر عمل پیرا ہو گی اور انتہائی ادب و احترام سے اس واقعے کو یاد رکھے گی کہ اسی قائد نے اس ساری قوم کو فلاح و بہبود

کی نئی راہ دکھائی ۔

اس تاریخی دن کا وہ منظر بھی قابل دید تھا کہ جب یہ عظیم قائد ، کوریا کا یہ فرزندِ دلبند ، ملک کا یہ سپوت "جنرل" کی وردی میں ملبوس ، بڑے اونچے چبوترے پر نمودار ہوا اور اس نے شکریہ اور شکرانے کے جواب میں خود بھی ساری قوم کا شکریہ ادا کیا ، ساری قوم کو مبارکباد اور اشیرباد دی اور پھر ساری آبادی نے ایسے زور شور سے اس کا استقبال کیا کہ کوریا ایسے ملک کے گوشے میں اس کی گونج جا پہنچی ۔ سارے ملک کا ہر ہر فرد شادمان و کامران نظر آنے لگا ۔

اس دن ، اس عظیم قائد نے اپنی تاریخی تقریر میں کہا کہ کوریا کو آزادی دلانے والے خود اہالیانِ کوریا ہیں ، ملک و قوم کو غلامی سے نجات دلانے کا سہرا کسی ایک کے سر نہیں بلکہ ساری قوم کے سر ہے ۔ یہ اس کی انکساری ہی نہیں بلکہ قوم پر پورے اعتماد کا ثبوت تھا ۔ اس نے اپنی تقریر میں کہا تھا :

" وقت آگیا ہے کہ اب تمام اہالیانِ کوریا اپنی ساری طاقت اور تمام وسائل مجتمع کر کے ایک نئے جمہوری کوریا کی تعمیر میں لگ جائیں ۔ ہر طبقے کے لوگوں کا فرض ہے کہ جذبۂ حب الوطنی کا بھرپور مظاہرہ کریں اور تعمیر جدید میں مصروف ہو جائیں اور اس تعمیرِ جدید کے سلسلے میں جن کے پاس طاقت و قوت ہے وہ طاقت و قوت پیش کریں ، جن کے پاس علم و معلومات کی دولت ہے وہ علم و معلومات عام کریں ، جن کے پاس روپیہ پیسہ ہے وہ روپے پیسے سے اس تعمیر جدید میں مدد دیں ، غرض وہ تمام افراد جنھیں اپنا ملک عزیز ہے ، اپنی قوم عزیز ہے ، جو جمہوریت کے شیدائی ہیں پورے اتفاق واتحاد کا مظاہرہ کرتے ہوئے کوریا کو ایک آزاد و خود مختار ریاست بنانے پر تُل جائیں " ۔

عظیم قائد کی تقریر کے یہ الفاظ مورانِ پہاڑ کے دامن ہی میں نہیں گونجے بلکہ سارے ملک میں ان کی آواز کی بازگشت سنائی دی ۔ یہ ایک بڑا اعلان تھا اس بات کا کہ ملک و قوم کو جاپان کے استحصال و نو آبادیاتی نظام سے نجات مل چکی ہے اور وہ آزادی کی شاہراہ

پر گامزن ہے۔اس کے قائد نے " جُوچے " نظریہ کی روشنی سارے راستے پر پھیلا دی ہے اور اسی روشنی میں قوم " تیز ترک گامزن منزل ما دور نیست "الاپتی ہوئی ،خودی ،خود شناسی ،خود اعتمادی اور خود داری کے عملی مظاہرے کرتی ہوئی ، اس راستے پر چلتی چلی جائے گی ۔

اس واقعے کو چالیس سال ہونے آئے کہ اس عظیم قائد نے ہمیں یہ نئی روشنی اور یہ بڑا سیدھا راستہ دکھایا تھا اور اس چالیس سال کے عرصے میں ہم اس کی ہدایت کے مطابق اس راستے پر چل کر ملک کی تعمیر جدید کرتے رہے ہیں ۔ زبردست تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں ، ایک نیا ملک ، نیا معاشرہ جنم لے چکا ہے جو جدید ترین تہذیب کی جانب رواں دواں ہے ۔

ملک کے دو علاقوں میں تقسیم ہونے کی مصیبت کے باوجود ، جس کی بدولت قوم کو چند در چند مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا رہا ، ہماری قوم نے سماجی انقلاب کے دونوں مرحلے بڑی قابل تعریف حد تک مکمل کر لیے ۔ اور آج ملک میں انتہائی ترقی یافتہ سماجی نظام رائج ہو چکا ہے جس کے لیے ہمیں بہت سی طبقاتی جنگیں بھی لڑنی پڑیں اور امریکا کے سامراجی حملوں کا بھی کامیابی سے مقابلہ کرنا پڑا۔ اس طرح جنگ و جدل کی بدولت ، ٹوٹا پھوٹا ملک، طرح طرح کے زخموں سے چُور ملک و قوم ، آج بالآخر ایک مضبوط قوم ، مضبوط ملک ، خوددار و خود اعتماد قوم اور مستحکم ملک ، اپنی دفاعی صلاحیتوں میں خود کفیل ، دنیا کے سامنے ہے اور یہ سب ایک قلیل عرصے کے اندر ہی ہو گیا ۔اس سب کا سہرا ہمارے عظیم قائد کم ال سنگ کے سر ہے جن کی فراست بھری رہبری وہدایات نے ہمیں قدم قدم پر کامیاب و شاد کام کیا اور " جُوچے " ایسا نظریہ ہمارے ہاتھ آیا ۔

آج کے اس یادگار موقع پر ، عظیم قائد کے لیے ساری قوم کی طرف سے بے حد و حساب تعریفی کلمات و جذبات اور حد درجہ اطاعت و وفاداری کے عہد کے ساتھ ساتھ میں یہ شرف حاصل کرنا چاہتا ہوں کہ ان کی خدمت میں ملک و قوم کی طرف سے

انتہائی پُر خلوص ہدیۂ تشکر پیش کروں اور کسی ملک و قوم کی طرف سے جو بھی اعلا سے اعلا اعزاز ہو سکے ، اپنی قوم ، ملک اور پارٹی کی طرف سے ان کی خدمت میں پیش کروں کہ انھوں نے ہمیں "جُوچے" نظریہ جیسا ہمہ گیر تحفہ دیا ، اور اپنی گوناگوں صلاحیتوں کو کام میں لا کر ہمیں جاپان کی غلامی سے نجات دلائی ، آزادی دلائی ، انقلابی جدوجہد کو اس خوبی و کامیابی کے ساتھ انجام کو پہنچایا اور نہ صرف یہ بلکہ آزادی و انقلاب کے بعد تعمیر کے سلسلے میں ، ایک نئے ملک ، نئے معاشرے کی نعمت سے قوم کو مالا مال کیا کہ شادمانی ، عظمت و مسرت آج ہماری قوم کا مقسوم بن گئی ہے۔

کامریڈ بھائیو !

یہ جو بلند و بالا اتنا با رعب " قوسِ فتح " آپ دیکھ رہے ہیں ذرا اس کی تعمیر کی تفصیل بھی سنیئے۔ یہ تعمیر ایک یادگار ہے مزدور پارٹی کی پُر خلوص کوششوں کی ، ساری قوم کی پُرخلوص کاوشوں کی اور اس سب کوشش و کاوش کا مقصد اصلی یہی رہا کہ آئندہ نسل کے لیے عظیم قائد کم ال سنگ کے نادر روزگار و ناقابل فراموش انقلابی کارناموں کو زندہ جاوید کر کے پیش کر دیں ۔

آج آپ دیکھ رہے ہیں کہ عظیم الشان " کم ال سنگ اسٹیڈیم" بھی اس قوسِ فتح کے قریب ہی موجود ہے۔ یہ پہلے " موران بونگ اسٹیڈیم " کہلاتا تھا ، مگر جب اس عظیم قائد ، کم ال سنگ نے اس اسٹیڈیم میں اپنی تاریخی تقریر کی ، اس کے بعد سے اس کا نام اسی عظیم قائد کے نام سے منسوب کو دیا گیا ہے۔ یہ ساری قوم کی متفقہ رائے تھی۔ گویا اس تاریخی میدان میں دونوں یادگاروں کا وجود ایک نئی تاریخی شان پیدا کر رہا ہے ۔

اس قوسِ فتح کی تعمیر میں ہم نے اپنے ملک کے اعلا ترین روایاتی طرزِ تعمیر کا خیال رکھا ہے اور ساتھ ہی جدید ذوق کا بھی مظاہرہ کیا ہے۔ بڑے بڑے اُبھرے ہوئے حروف میں وہ منظوم اقوال و خیالات لکھے گئے ہیں جن کا نام ہم نے " جنرل کم ال سنگ کا رجز " رکھ چھوڑا ہے۔ یہ وہ گیت ، رجزیہ کلام و نظم ہے

جو انقلاب کے دور میں ہمارا روزمرہ کا پُر جوش نعرہ تھا۔ اس قوس فتح میں کوئی بیس برس کے ان تمام واقعات کا کسی نہ کسی طرح اشارہ اور عکس نظر آ سکتا ہے جو اس عظیم قائد کے ہاتھوں انجام پائے اور اس طرح ان تمام کارناموں ، کارروائیوں ، خونیں معرکوں اور کامیابیوں و کامرانیوں کو یہاں ثبت کر کے انہیں دوام بخش دیا گیا ہے ۔

اس ساٹھ میٹر بلند قوس فتح میں آپ کو ایک پہاڑ کا ابھرا ہوا نقش نظر آئے گا۔ یہ ابھرا ہوا نقش " ماؤنٹ پیک دو " کا ہے ۔ اس پہاڑی کو ہمارے انقلاب کی تاریخ میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یہاں سے ہمارے اس عظیم قائد نے نعرۂ انقلاب و آزادی بلند کیا تھا اور اسی پہاڑی کے ارد گرد کے جنگلاتی علاقے میں ہماری ابتدائی کوششیں بار آور ہوئیں ۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ نظریہ " جوچے " کی داغ بیل یہیں پڑی تھی جو پھل پھول کر آج اتنا عظیم الشان، کامیاب، ہمہ جہتی نظریہ بن گیا ہے کہ ہمارے سارے مستقبل کی رہنمائی اسی کی روشنی میں ہوگی ۔

اس قوس فتح میں آپ کو یہ بھی نظر آئے گا کہ کوریا کی عوامی انقلابی فوج کے دستے کس شان سے بگل منھ سے لگائے رواں دواں ہیں۔ اور آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ اہالیانِ کوریا ، غول در غول، بچے ، بوڑھے ، جوان ، نوجوان ، عورت ، مرد ، ہر طبقے اور ہر پیشے کے لوگ ، انقلاب کے کامیاب خاتمے پر عظیم لیڈر کے استقبال کے لیے بڑے جوش و خروش کے ساتھ خنداں و فرحاں نعرہ زن ہیں ۔ ان تمام نقوش سے ایک بار اور یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ آج کے سارے اہالیان کوریا ، اپنے عظیم قائد کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ، ساری آئندہ نسلوں کے لیے ، آنکھ کا تارا بنا دینے پر تلے ہوئے ہیں ۔

یہ قوس فتح ایک عظیم یادگار عمارت ہے۔ اس کی تعمیر میں، اس کی تزئین و آرائش میں ، اسے پُر رعب مگر نفیس عمارت بنانے میں ، اس کے نقش و نگار میں انقلاب اور جد وجہد کی روح اجاگر کرنے میں ، ملک کے بہترین اہلِ دماغ نے اپنی اعلا ترین صلاحتیں صرف کر دی ہیں اور پھر عوام نے ، عوام کے ہر ہر فرد نے کچھ

نہ کچھ کام انجام دے کر اس کی تعمیر میں ہاتھ بٹایا ہے اور حصہ لیا ہے تاکہ اسے ساری قوم کا مجموعی کارنامہ کہا جائے اور وفا شعاری و احسان مندی کا مُرقع !

ملک کے طول و عرض سے پارٹی کے کارکن آ آ کر اس قوس فتح کی تعمیر میں حصہ لیتے تھے ، ہاتھ بٹاتے تھے ، جو جس سے بن پڑتا تھا کرتا تھا ۔ کارکنوں کی یہ فوج ظفر موج اپنے قائد کی خدمت میں ہدیۂ وفاداری و احسان مندی پیش کرنے کے لیے ایسی بے تاب تھی کہ یہ عظیم الشان عمارت دو برس کے اندر مکمل ہو گئی ۔ اس کے سارے نقش و نگار ، سنگ تراشی کے شاہکار ، عمارت سازی کے نمونے سب ملک کے مایہ ناز سپوتوں کے ہاتھوں مکمل ہوئے اور ہر ایک نے یہی نیت رکھی کہ کسی طرح اپنے اس عظیم قائد کے کارناموں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے درخشاں و جاوداں بنا دیا جائے ۔

آپ اس تعمیر میں جو بھی اینٹ پتھر دیکھ رہے ہیں وہ کسی نہ کسی فردِ قوم کی محنت کا ثمر ہے ۔ آپ اس قوس فتح کے ارد گرد آس پاس جو بھی سبزہ ، درخت ، یا پودا دیکھ سکیں سمجھ لیجئے کہ کسی نہ کسی وفادار شہری کا اپنے زبردست و عظیم قائد ، کم ال سنگ کی خدمت میں ہدیۂ تشکر و احسان مندی ہے ۔ ان وفادار شہریوں میں فوج کے سپاہی بھی ہیں ، کاشتکار بھی ، اہلِ حرفہ بھی ، سرکاری و نجی شعبوں اور اداروں کے اراکین بھی ، ہر ہر محکمے کے نمائندے بھی ، طالب علم ، پولیس اور شہری حفاظت کے ملازمین بھی اور عوام کے ہر طبقے کا کوئی نہ کوئی نمائندہ بھی ! ان معماروں میں ہمارے جنوبی علاقے کے افراد بھی شامل رہے ہیں اور بہت سے بیرون ملک کے ہمدردان کوریا بھی !

یقین ہے کہ یہ زبردست یادگار عمارت ہمیشہ ہمیشہ رہے گی اور ہمیشہ ہمیشہ اس عظیم قائد کے عظیم الشان و یادگار کارناموں کی یاد دلاتی رہے گی جو اس نے نظریۂ " جوچے " کو عملی شکل دینے کے سلسلے میں سالہا سال انجام دیے اور جن کی انجام دہی میں اس نے اپنی عمر کے بہترین حصے کو داؤں پر لگا دیا تھا ۔ ان کامیابیوں کو برقرار رکھنے اور آگے بڑھانے ، " جوچے " کے مقاصد

حاصل کرنے کی سعی کے لیے پارٹی اور عظیم قائد کی سرکردگی میں ساری قوم سرگرمِ عمل رہے گی -

کامریڈ بھائیو !

یہ بڑے فخر و اعزاز کی بات ہے کہ قوم نے یہ قوسِ فتح ایسے تاریخی مقام پر تعمیر کی ہے جہاں اس کے محبوب و عظیم قائد ، کامریڈ کم ال سنگ نے ، آزادی حاصل کرنے کے بعد فتح مندانہ انداز میں قوم سے پہلا خطاب کیا تھا اور ساری قوم کو مبارکباد دی تھی -

اس فخر و اعزاز کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس انقلاب کی تاریخ پر گہری نظر ڈالیں ، عظیم قائد کم ال سنگ کے کارناموں کا تفصیلی جائزہ لیں اور " جُوچے " نظریہ کا پرچار سارے عالم میں کرنا شروع کر دیں- اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ہم خود آپس میں اتحاد و اشتراک کی فضا میں ایسا معاشرہ مضبوط بنیادوں پر قائم کریں جو " جوچے " کا مطمح نظر ہے اور اس مطمح نظر کو قابلِ عمل بنا دیں -

اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ (حکمران) پارٹی کے تمام اراکین ، سارے مزدور و محنت کش بھائی یہ تہیہ کر لیں کہ "جوچے" کی روشنی میں نظریاتی، تکنیکی اور ثقافتی انقلاب کو پوری طاقت سے پائے تکمیل تک پہنچا دیں گے اور اس طرح سوشلزم کے مقصد ومفاد کے حصول کے لیے راہ ہموار کر لیں گے کہ قومی یک جہتی اور قوم کو از سرِ نو متحد کرنے کے لیے یہ سب بہت ضروری ہے -

ماضی کی طرح مستقبل میں بھی ہمارا پروگرام یہی ہے کہ سامراج کے خلاف تحریک کو پروان چڑھائیں ، آزادی کا جھنڈا اونچا رکھیں اور ساری دنیا میں ایک ایسے جدید سماج کی تعمیر میں مدد دیں جو امن کا ضامن ہو ، آزادی کا علمبردار ہو ، غیر جانبداری (غیر وابستگی) جس کے رہنما اصولوں میں سے ہو اور سوشلزم کے لیے ساری دنیا کے ترقی پسند عوام کی تائید حاصل کرنے میں مدد دے -

ہمارا مستقبل ، ہماری ساری قوم کا مستقبل بہت روشن ہے ،

ساری قوم کوریا کے محنت کش مزدوروں کی جماعت (حکمراں پارٹی) کی قیادت و رہبری میں " جوچے " کے اصولوں کا پرچم اٹھائے شاہراہِ ترقی پر گامزن ہے اور بڑی بڑی کامیابیاں ابھی ہمارے قدم چومنے کے انتظار میں ہیں ۔

محترم کامریڈ کم ال سنگ کے زیر سرکردگی پارٹی کی مرکزی کمیٹی سے سو فیصد معاونت و وفاداری ہمارا نصب العین ہونا چاہیے اور پورے اتحاد و اتفاق کے ساتھ ! اور پھر پہلے سے بھی زیادہ قوت و جرات استعمال کر کے " جُوچے " کے مطمحِ نظر کی تکمیل کی طرف متوجہ ہو جانا چاہیے ۔

زندہ باد کامریڈ کم ال سنگ ـــــ عظیم قائد پارٹی اور عوام کے !

زندہ باد کوریا کے محنت کشوں کی شاندار پارٹی جس نے اہالیانِ کوریا کی تمام تر کامیابیوں کے لیے لائحۂ عمل بنایا ، ضروری تنظیم بھی کی اور فتح مندیوں اور کامرانیوں سے قوم کا دامن بھر دیا ۔

نوراللہ صاحب

پاکستان کے بلوچی ناظم الامور جناب نور اللہ صاحب اس جمِ غفیر میں کسی طرح مجھ تک پہنچ گئے ۔ محبت سے میرا حال پوچھتے تھے ، میں نے شبِ گزشتہ ہی ان سے کہہ دیا تھا کہ وہ قطعاً میری فکر نہ کریں اور اپنی توجہات ارکانِ وفدِ پاکستان پر مرکوز رکھیں کہ یہ عاجز ضروریات سے بے نیاز ہے اور تکلفات سے ماورا ہو کر اور رہ کر مطالعے کو اہمیت دیتا ہے ۔ افتتاح قوسِ فتح کے لیے " خصوصی گیلری " میں میرا انتظام تھا ، مگر میں نے عوام میں گھل مل کر حالات کو دیکھنے اور سمجھنے کو اہمیت دی ہے ۔

نور اللہ صاحب کے ساتھ دو اور پاکستانی تھے جنھوں نے بڑے تامل کے ساتھ مجھے سلام کیا ۔ اسی تامل و تکلّف نیز تکلیف سے میں نے ان کو جواب دیا ۔ ان میں ایک بیوروکریٹ ہیں کہ جن کو بجا طور پر یہ مقام حاصل ہے کہ بابو اور منشی کی حیثیت سے وہ پاکستان پر حکومت کرتے ہیں ۔ دوسرے بزرگ ریٹائر ہونے والے فوجی افسر ہیں ۔

قائدِ وفد کے ساتھ ایک ڈائریکٹر وزارتِ خارجہ کا ہونا ضروری ہے اور مطالعہ کے لیے ہونے والا سفیر بھی ، اور خدمت کے لیے سفارت پاکستان کا پورا عملہ بھی - بے چارا یہ حکیم سعید کس کھیت کی مولی ہے ! تقریبات برائے تفریحات سے اس کا کیا واسطہ ! یہ حق ان ہی کو حاصل ہے کہ جو کیفیتِ خزانہ سے بے فکر و بے نیاز ہو کردادِ عیش تکلیف و تکلف کے بغیر دینے کے اہل ہیں اور حقائق کا مطالعہ اور واقعات کا مشاہدہ جن کی ضرورت نہیں ہے !

ترانۂ فتح

آج شام کا یہ پروگرام کئی اعتبارات سے دل چسپ ، اہم ، معنیٰ خیز اور دُور رَس نتائج کا حامل تھا - اس پروگرام سے آزادی کے لیے تڑپتی ایک قوم کا مزاج ، اس کا اندازِ پیش قدمی اور اس کا طریق فکر معلوم ہوتا ہے - ترانۂ فتح رقص و سرود کی زبان میں ڈرامائی انداز میں پیش کیا گیا - اس میں ہزار دل چسپیوں کے ساتھ لاتعداد شعلہ سامانیاں موجود ہیں جنھیں سمجھنے کی ضرورت ہے - جو لوگ فقط داد دے کر چلے گئے انھوں نے حال و مستقبل سے صَرفِ نظر کیا اور جنھوں نے اس پیش کش کے رُموز و نِکات کو ذہن نشین کر لیا ان کی فکری توانائیاں بیدار ہوئی ہیں - صبح سے اب تک پروگرام کا جو انداز رہا ہے ترانۂ فتح اِس کی معراج ہے - ترانۂ فتح رقص و سرود کی زبان میں کہانی ہے اُس ناقابلِ فراموش جدوجہد کی کہ جو عظیم کم ال سنگ کی بہترین قیادت کی مظہر ہے اور جس کا نقشہ میں نے ان صفحات میں کھینچنے کی کوشش کی ہے - اس سے سبق یہ ملتا ہے کہ طوفانی اور برفانی راہوں کو اختیار کرو کہ ملک کی آزادی آرام و آسائش سے زیادہ اہم ہے - اگر فکری اور سیاسی آزادی نصیب نہیں تو ساری آسائشیں سراب ہیں - آندھیوں اور طوفانوں کی پروا کیے بغیر اور ہمہ قسم کی تکلیفوں کو نظر انداز کرتے ہوئے بڑھتے چلے جانا ہی زندگی ہے اور یہی وہ زندگی ہے کہ جو رحمتوں اور برکتوں کا سامان کرتی ہے - کم ال سنگ مردانہ وار نئی

راہیں کھولتے چلے گئے اور موت سے لاپروا ہو کر اپنی راہ بناتے رہے حتیٰ کہ انھوں نے کوریا کو " جوچے " کا ایک تصور دیا اور ملک کو فتح و نصرت سے ہم کنار کر دیا ۔ ترانۂ فتح اس تصوّر پر مبنیٰ ہے اور اس ترانۂ فتح کی تخلیق کم ال سنگ صاحب کا ۷۰ سالہ جنم جشن بنانے کے لیے عمل میں آئی ہے ۔ اس کی تخلیق میں پیرنگ یانگ کے پانچ ہزار ان فن کاروں نے حصہ لیا ہے کہ جو اولاد کی طرح اس رہنما کی گود میں پلے ہیں اور فتح مند پارٹی کے زیر تربیت بچّے سے جوان ہوئے ہیں ۔ ترانۂ فتح در مدح کم ال سنگ ہے اور خوب ہے ۔

حصۂ اوّل : برادران وطن کے لیے ذمہ داریوں کا بوجھ

ہماری منزل کیا ہے ؟

کم ال سنگ کا آزادئ وطن کے لیے طویل سفر

حصۂ دوم : جوچے تحریک کا آغاز

امپیریلزم کے خلاف علم بلند کرو

نگاہ بلند سے تعمیر وطن کی جد وجہد کرو

ستارۂ کوریا

کامریڈ شپ کا گانا گاؤ

حصۂ سوم : جاپان کے خلاف جنگِ آزادی میں فتح و نصرت

جاپان کے خلاف گوریلا فوج کا قیام

شعاعِ آزادی

ہم آپ کے لیے غیر مشروط وفا شعاری کا اعلان کرتے ہیں

ہم اپنے سپہ سالار اعلا کے ساتھ ہزارہا میل چلیں گے

شمالی کوریا کے ۳۰ ملیون عوام جنرل کم ال سنگ کو سلام کرتے ہیں

حصۂ چہارم : شعلہ ہائے جنگ سے گزرتے ہوئے کوریائے جدید کی تعمیر

ہ جمہوریت کی بہار Vangsaudo

موسم بہار میں تخم ریزی

فتح و نصرت کا ماہ مئی

ہ عوامی جمہوریہ کے علم کے سائے میں

ہ امریکی سامراج کے خلاف جدوجہد

محاذ کی جانب قدم

مارشل کم ال سنگ کی سپہ سالارانہ قیادت

حصۂ پنجم : کوریا کی تعمیر نو ، چولیما کی جانب قدم

تباہ کاریوں کے تودوں پر

چولیما لہراتا ہے

شہر آہنی پر آسمان شب سے سرخ برف گرتی ہے
اور وطن کی بچیاں ریشم پروتی ہیں

حصۂ ششم : مقدس سوشلزم کی جانب قدم

عوام کی پُر محبت خدمت کے لیے سفرِ طولانی

زراعت کے میدانوں میں فراوانیاں

علم و حکمت کی سر زمین

کوریا ایک ہے اور ناقابلِ تقسیم

حصۂ ہفتم : جُوچے تحریک کی آفتابی روشنی میں

ہم اس راہ پر ہمیشہ چلتے رہیں گے

اور کوریا کو جنّتِ ارضی بنا دیں گے

اختتامیہ : ہمارے قائد کی طویل عمر اور صحت و عافیت

کم و بیش ڈھائی گھنٹے کا یہ اسٹیج ڈرامہ اپنے اندر ایک جہانِ معنی پنہاں رکھتا ہے اور درس ہے ان کے لیے کہ جو فکری اور سیاسی آزادیوں سے محروم ہیں اور حریت جن کے نصیب میں نہیں ہے۔معانی کی گہرائی اور مفاہیم کی گیرائی کے ساتھ یہ اسٹیج ڈرامہ پیش کش اپنے معراج پر تھی۔میں نے دنیا بھر میں اسٹیج ڈرامے دیکھے ہیں مگر میں نے یہ عظمت تیکنیک اور یہ شوکتِ پیش کش آج تک کہیں نہیں دیکھی۔زندگی کا یہ انوکھا تجربہ ہے اور حیرت و مسرت ہوئی ہے کہ اس قوم نے اپنے فکری اثاثوں کو عمل کی معراجوں تک پہنچا دیا ہے۔

رات گئے گیسٹ ہاؤس واپسی ہوئی۔ریستوران میں سعد یہ اور میں پہنچے۔ وہاں دیکھا کہ کئی مسکراتے چہرے استقبال کے لیے موجود ہیں۔آدھی رات گزر گئی مگر ان طالباتِ علم کے چہروں پر وہی مسکراہٹ تھی کہ جو گلاب کی کلی کھلتے وقت چشم شاعر دیکھتی ہے اور قلب شاعر جسے محسوس کرتا ہے۔ان بچیوں نے بکمالِ ادب اور بہ جمالِ شوق ہم دونوں کے سامنے انواع و اقسام کے کھانے چُن دیے - میں سبزی خور ٹھیرا ، چُن چُن کر وہ چیزیں لیتا کہ جن میں گوشت کا شائبہ تک نہ ہو ، میری کم خوری سے یہ بچیاں اشارات میں اظہارِ افسوس کیا کرتیں۔ اگر ان کا بس چلتا تو مجھے وہ زبردستی یہ نفیس و لذیز کھانے کھلا دیتیں -

نماز عشاء ادا کی - کمرہ بڑا گرم ہے -نہ جانے سوئچ کہاں ہے کہ میں اسے بند کردوں اور کم از کم فرش ہی ٹھنڈا ہو جائے - میں نے سرہانے کی کھڑکی کھول لی اور ہوائے سود کو بلا روک ٹوک آنے دیا کہ تمام دن کے ہلا کر رکھ دینے والے پروگراموں کے بعد میرے جذباتِ برانگیختہ کو سود کرنے کے لیے اس کی ضرورت تھی !

آزادی کوریا کے لیے جد وجہد

کامریڈ کم ال سنگ کا انداز فکر وطریق عمل

میرا یہ مطالعاتی سفر اور دورۂ پیونگ یانگ طب و تعلیم کی حد تک محدود ہے ، اور میں اس سے باہر جانا نہیں چاہتا ۔بہ ایں ہمہ

میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں صدر کم ال سنگ کی شخصیت کے بارے میں آنکھیں بند کر لوں اور نہ میرے لیے یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ میں آزادی کی اس طویل جدوجہد سے صرف نظر کر سکوں کہ جو موجودہ آزاد کوریا کے لیے کی گئی ہے ، اور جس کی یادگار کے طور پر " قوس فتح " قائم ہوئی ہے۔ اس موقع پر میں مزاجاً مشرقی اور مغربی پاکستان کے مابین آویزش اور سانحۂ تقسیمِ وطن کو لمحہ بھر کے لیے بھی فراموش نہیں کر سکتا اور دو بڑی طاقتوں کے اتحاد کو نہیں بھول سکتا کہ جس نے دنیا کے سب سے بڑے اسلامی ملک کو تقسیم کرا دیا ۔ اس روشنی میں جب میں کوریا میں آزادی کی جنگ کا مطالعہ کرتا ہوں تو میرا دل تعریف کے لیے بے قرار ہو جاتا ہے ، اور پھر میں سوچنے لگتا ہوں کہ ہم موجودہ پاکستان کی تعمیر کے لیے کیا کر رہے ہیں ؟

صدر کم ال سنگ کی ساری زندگی جدوجہد سے عبارت ہے اور ایک شخص کی فکر وجہد نے کوریا کو آزادی حاصل کرا دی، دیانتِ فکر و عمل کی ایسی مثالیں خال خال ہی ملتی ہیں ، مگر یہ ایثار اور قربانیوں کی بڑی حسین اور دل فریب داستان ہے ۔ یہ بلندیاں خلوص نیّت ، فکرِ صحت مند اور عملِ پیہم کے بغیر چھوئی نہیں جا سکتیں۔ میرے اُس روز نامچہ کے قارئین کو آزادیٔ کوریا کے لیے جدوجہد کا ذرا سا نقشہ تو ضرور دیکھنا چاہیے ۔ شاید ہم غور کر سکیں کہ ہم کو پاکستان کی بقا و استحکام کے لیے کیا کرنا چاہیے۔

عوامی جمہوریۂ کوریا میں آج جو ہمہ جہتی ترقی و خوشحالی کا دور دورہ نظر آتا ہے یہ ان تابندہ و درخشاں کامیابیوں اور کامرانیوں کا ثمرہ ہے جن کا سہرا اہل کوریا بجا طور پر صدر کم ال سنگ کے سر باندھتے ہیں ۔ ۵ / اگست ۱۹۲۵ء کو فتح و آزادی کے بعد جنرل کم ال سنگ کو کوریا کی ورکرز پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کا چیئرمین منتخب کر لیا گیا ۔ (اب کوریا کی ورکرز پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کے جنرل سیکرٹری ہیں) وہ شمالی کوریا کی پیپلز کمیٹی کے بھی چیئرمین بنے ۔ کوریا کو عوامی جمہوریہ قرار دیے جانے پر وہ کیبنٹ کے وزیر اعظم چنے گئے ۔ (اب عوامی جمہوریہ کوریا کے صدر ہیں) کم ال سنگ شروع دن سے اس ریاست کو سنوارنے اور خوب

سے خوب تر بنانے میں لگے رہے حتیٰ کہ آج یہ ایک ممتاز صورت میں دنیا کے سامنے ہے۔ اپنے عظیم مقصد میں کامیابی کے لیے ، جس میں جنگ آزادی بھی شامل ہے ، انہیں جن کڑی آزمائشوں اور حوصلہ شکن ابتلا و مصائب سے دوچار ہونا ہوا ان کی داستان تیس سال کے طویل عرصہ پر محیط ہے۔ کوریا کی عظمت اور اہل کوریا کی رفعت کے لیے پُرخلوص جدوجہد کی وجہ سے کوریائی عوام صدر کم ال سنگ کو بحیثیت قائد حد درجہ عقیدت و احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہ انہی کا جگرا تھا کہ اس زمانے میں بھی کہ جب جاپانی سامراج کے تسلط کے خلاف کسی کو دم مارنے کی جرات نہیں ہوتی تھی انہوں نے شمال مشرقی چین اور کوریا کے سرحدی علاقوں میں جاپان کے خلاف مسلح جدوجہد کی جھڑپیں جاری رکھیں۔ ان کی اس جنگ سے مزدوروں اور دہقانوں کو غلام وطن میں بے حد حوصلہ ملا اور انہیں امید بندھ گئی کہ جنرل کم ال سنگ یہ جنگ ضرور جیتیں گے اور واقعی جنرل کم ال سنگ نے ایک ہیرو کی حیثیت سے ملک کو غیر ملکی تسلط سے آزاد کرا کے ہی دم لیا۔

جاپانی تسلط نے چھتیس سالہ طویل عرصے میں کوریا پر جو ناانصافیاں روا رکھیں دراصل انہوں نے ہی اس کے خلاف مسلح جدوجہد کے لیے موقع فراہم کیا۔ اس صورتِ حال سے نہ صرف کوریا کے عوام کی خود اعتمادی کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے بلکہ اس جدوجہد کے رہنما کم ال سنگ کے فکر و نظر اور ان کے مزاج کو جاننے کی بھی راہ ہموار ہوئی ہے۔ غلامی سے نجات اور آزادی کی فضا اس وقت قائم ہو سکتی ہے کہ جب زندہ رہنے کا شعور حاصل ہو۔ کوریا میں جاپان اور امریکا کے خلاف جذبات بدرجۂ انتہا برانگیختہ ہیں۔ اس کا پس منظر سمجھنا ضروری ہے۔

کوریا پر حکمرانی سے جاپان کا مقصد کیا تھا اس کی وضاحت اس حقیقت سے ہوتی ہے کہ یکے بعد دیگرے مقرر کیے جانے والے نو کے نو گورنر جنرل جن میں سب سے پہلا تیراوچی تھا ، سب کے سب افواج سے تعلق رکھتے تھے۔

تیراوچی نے فوجی حکومت کے قیام کی کوشش میں تمام سیاسی

تنظیموں کا وجود ختم کر دیا۔ سیاسی اور تقریری جلسوں پر پابندی لگا دی اور بعض اخبارات کی فروخت ممنوع قرار دے دی۔ جس کے نتیجے میں کوریائی عوام، سیاست میں حصہ لینا تو درکنار، آزادئ تحریر و تقریر تک سے محروم ہو گئے اور حصول آزادی تک ان کی سیاسی زندگی معطل رہی۔

بالکل یہی کچھ معاشی صورت حال کا معاملہ تھا۔ کوریا کی معیشت ترقی کر رہی تھی مگر اس ترقی سے خود کوریا کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ رہا تھا بلکہ اسے باج گزار بنا کر ساری منفعت سے جاپان فیض یاب ہوتا تھا۔

۱۹۲۰ء کے دہے میں "چاول کی پیداوار بڑھاؤ" کا منصوبہ پیش کیا گیا لیکن یہ بھی دراصل جاپان کو درپیش مسئلۂ خوراک کا ایک حل تھا۔ جیسے ہی کوریا میں چاول کی پیداوار بڑھی زیادہ سے زیادہ چاول جاپان بھیجا جانے لگا اور وہاں سے فالتو اشیا کوریا میں بھجوا دی گئیں۔ ان غیر ضروری اشیا کی ترسیل اتنی بڑھی کہ ان کی مجموعی قیمت دوسرے تمام ممالک سے درآمد ہونے والی اشیا سے بھی زیادہ ہو گئی۔

"مشہور واقعۂ منچوریا" کے بعد جو ۱۹۳۱ء میں پیش آیا، جاپانی سرمایہ داروں نے اپنی پالیسی "زراعت مقدم" کو "معدنیات اور صنعت مقدم" میں تبدیل کر دیا۔ اس کا اولین مقصد کوریا میں جاپان کی سرمایہ کاری تھا، کیوں کہ یہاں ابھی فیکٹری قانون کا نفاذ نہیں ہوا تھا اور بچوں سے معمولی اجرت پر زیادہ کام لے کر خوب منافع کمایا جا سکتا تھا۔ اس کا دوسرا مقصد کوریا کو ایسا فوجی اڈہ بنانا تھا جو جاپان کو براعظم میں اپنے توسیعی عزائم پورے کرنے کے لیے بنیاد مہیا کرے۔

اس کے علاوہ کوریا میں ریلوے کی تعمیر سے بھی یہی مقصد حاصل ہوتا تھا۔ روس جاپان جنگ کے دوران میں جاپانی سامراج نے سنگینوں کے زور پر سیئول اور پوسان کے درمیان اور سیئول اور سنوئی جو کے درمیان ریلوے کی تعمیر کا کام بہت تیزی سے شروع کیا تھا مگر وہ ادھورا رہ گیا تھا۔ اب اسے تکمیل تک پہنچانے کے

ساتھ ساتھ ھمگانگ ریلوے بنائی ۔جس سے راجن ، انگی اور چونگ جن کی بالکل نئی بندرگاھوں اور نہگام اور مشرقی ساحل پر دیگر ترقی پذیر صنعتی اضلاع کے درمیان ریلوے کا ایک جال بچھ گیا ۔ان تمام ریلویز کا اصل تعلق و منشا یہ تھا کہ جاپان براعظم میں سبقت حاصل کر لے ۔

دوسری جنگِ عظیم شروع ھوتے ھی جاپانی سرمایہ داروں نے اپنے پاؤں زیادہ مضبوطی سے جما لیے،وہ منڈیوں پر چھا گئے ۔ انھوں نے جاپان کی غذائی قلت دور کرنے کے لیے کوریاؤں سے ان کی اشیائے روز مرہ تک چھین کر انھیں بھوکوں مرنے پر مجبور کر دیا ، پھر کوریا کے ھزاروں غریب مزدوروں کو " ذاتی خدمت کافوجی قانون " کے تحت زبردستی دھکیل کر جاپان ، منچوریا ، چین اور جزائر بحر جنوبی میں پہنچا دیا گیا ۔اسی پر بس نہیں کیا بلکہ کوریائی نوجوانوں کو اپنی ھوسِ ملک گیری کی جنگ کے لیے فوج میں بھرتی کر لیا ۔ اس سے آگے ایک قدم اور یہ بڑھا کہ کوریائی عوام کا قومی وجود ختم کرنے کے لیے جاپان نے " جاپان اور کوریا کی ایکتا " کا نعرہ لگا کر انھیں جاپانیوں کی رعیت بنانے کی پالیسی اختیار کی ۔

منامی جیرو (Minami Jiro) نے ، جسے ۱۹۳۶ء میں یہاں کا گورنر جنرل مقرر کیا گیا تھا ، کوریائی ناموں کو جاپانی طرز کے ناموں میں تبدیل کرنے کی پالیسی اختیار کی اور اس کا نفاذ اس سختی سے کیا گیا کہ ایک ھی دن میں تمام نام بدل دیے گئے ۔یہ عمل کوریائی عوام کے لیے حد درجہ توھین اور دکھ کا باعث تھا ۔

تمام اسکولوں میں کوریائی زبان کے استعمال پر پابندی لگا دی گئی جبکہ ابتدائی پہلی جماعتوں میں بچوں کو جاپانی زبان میں سبق پڑھائے جانے لگے ۔ تمام مقامی اخبارات کی اشاعت قطعاً ممنوع قرار دے دی گئی ۔ حتٰی کہ کوریاؤں کے لیے کوریائی زبان میں علمی ادبی مطالعہ بھی قابل گرفت جرم بن گیا ۔

جاپان نے سمندر پار اپنے جارحانہ توسیعی عزائم کو مزید فروغ دینے کے لیے کوریائی عوام پر اپنی گرفت اور مضبوط کر لی ۔ سیاسیات

معاشیات اور ثقافت غرض تمام شعبہ ہائے زندگی پر اپنی اجارہ داری قائم کر لی اور کوریاؤں کو جاپانیوں کی بہ نسبت کم معاوضہ ادا کیا جانے لگا۔ رفتہ رفتہ وہ لوگ کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گئے۔ حکومت سے مزاحمت کرنے والوں کے حوصلے پست کرنے کے لیے جاپانی طاقت نے انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک کر قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا کر دیا۔

جاپانی سامراج کے اس اقتدار سے تنگ آکر کوریائی باشندے جوق در جوق جیان داؤ اور چین کی طرف تلاشِ معاش میں نکل گئے۔ ۱۹۳۲ء میں گورنر جنرل اگاکی کازشی (Ugaki Kazushioe) نے "کوریا کے شمالی علاقے کی ترقی" کا بہانہ بنا کر سوزنی لکڑی کے کاشت کاروں کو جنگلات سے بے دخل کر دیا جس کے بعد وہ بھی جیان داؤ ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ایسے مہاجرین کی تعداد ۱۹۱۰ء میں ایک لاکھ دس ہزار تھی جو ہر سال بڑھتے بڑھتے ۱۹۳۷ء میں نو لاکھ تیس ہزار کے لگ بھگ ہو گئی۔

یہ تھے وہ حالات جنھوں نے انہیں اپنے وطن کی قدر کا احساس دلایا اور ان کے دلوں میں جلد سے جلد وطن کو آزاد کرانے کی خواہش پیدا کی۔ وہ بے صبری سے کسی ایسے عظیم قائد کے منتظر رہنے لگے جو ان کی تقدیر بدل دے اور انہیں ظلم و ستم سے نجات دلا دے۔

جنرل کا بچپن

جنرل کم ال سنگ ۱۵/اپریل ۱۹۱۲ء کو مانگ یونگ دائی کے ایک غریب کسان گھرانے میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اس وقت آنکھ کھولی جب قومی آلام و مصائب اپنی حد سے گزر چکے تھے۔ کم ال سنگ کی عمر ابھی صرف پانچ برس تھی کہ ان کے والد "واقعۂ کوریائی قومی انجمن" میں گرفتار کر لیے گئے۔ اور ان کا خاندان تتر بتر ہو گیا۔ اس المناک صورت حال پر کم ال سنگ خون کے آنسو روئے اور ان کے دل میں جاپانیوں کے خلاف آتش نفرت شدت سے بھڑک اٹھی۔

ان کی عمر سات سال ہوئی تو یکم مارچ کی مقبول عام بغاوت کا آغاز ہو گیا۔ عوام کو درانتیوں اور کلہاڑوں سے مسلح ہو کر یونگ یانگ قلعہ کی طرف جوش و خروش سے بڑھتے دیکھ کر کم ال سنگ بے حد متاثر ہوئے۔

بعد ازاں اپنے والدین کے نقش قدم پر چلتے ہوئے دریائے ایمنوک گانگ کو عبور کر کے چین میں داخل ہو گئے اور وہاں ایک اسکول میں تعلیم حاصل کرنے لگے۔ مارچ ۱۹۲۳ء میں جب کم ال سنگ گیارہ برس کے تھے وہ براؤ گو چھوڑ کر تنہا صرف تیرہ دنوں میں اپنے ددھیال مانگ یونگ دائی پہنچ گئے لیکن یہ جان کر کہ ان کے والد ابھی تک جاپانی پولیس کے قیدی ہیں واپس بداؤ گو چلے آئے۔

باپ نے قید و بند کی لرزہ خیز سختیاں جھیلنے کے باوجود انقلابی سرگرمیوں سے منھ نہ موڑا۔ آخر کار ان کی صحت جواب دے گئی اور وہ آزادئ وطن کی آرزوئے نا تمام دل میں لیے راہئ ملک عدم ہو گئے۔ آنجہانی باپ کی وصیت پوری کرتے ہوئے کم ال سنگ نے اعلا تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۲۶ء میں " سامراجی اتحاد سے ٹکراؤ "Down-with-Imperialism Union) کی تنظیم قائم کی۔ ترقی پسند نوجوانوں اور طلبہ کو تیار کیا اور کوریا کی آزادی و خود مختاری کی سرگرمیوں کا آغاز کر دیا۔ ان کی یہ طوفانی انقلابی ہنگامہ آرائی رنگ لانے لگی تو ۱۹۲۹ء کے موسم خزاں میں کومنتانگ پولیس نے انہیں گرفتار کر کے جی لن قید خانے میں ڈال دیا۔

جیل کی سلاخوں میں محبوس جوان کم ال سنگ شب و روز ملک سے محروم ہم وطنوں کو قومی ذلت و خواری سے نجات دلانے پر غور و فکر کرتا رہا۔ آخر اسے ایک ہی راستہ دکھائی دیا اور وہ تھا ہر قیمت پر ملک کو جاپانی سامراج کے تسلط سے آزاد کرانا۔ اس نتیجے پر پہنچ کر کم ال سنگ نے اپنی جان کی بازی لگا کر جاپانی سامراج کے خلاف جنگ کرنے کا پختہ عہد کر لیا۔

اپنی قید کے دوران ہی کم ال سنگ نے جاپان دشمن مسلح جدوجہد کا ایک مبسوط منصوبہ تیار کر لیا تھا۔ اس وقت

سرمایہ دار دنیا ، ایک شدید معاشی کساد بازاری کا شکار تھی - معاشی بحران کی تباہ کن گرفت سے چھٹکارا پانے کے لیے فاشسٹ ممالک جیسے کہ جرمنی ، اٹلی اور جاپان نو آبادیوں کی از سر نو تقسیم کے منصوبے بنا کر توسیعی جنگوں کی تیاریوں میں مصروف تھے - چنانچہ کم ال سنگ نے پارٹی کا اجلاس طلب کیا اور جاپانی سامراج کے خلاف فوری طور پر ایک منظم مسلح جدوجہد کی اشد ضرورت پر زور دیا - اس سلسلے میں انہوں نے گوریلا طرز جنگ اپنانے کی تجویز پیش کی ، اور اس کے لیے مخصوص طریقے اختیار کرنے کی ہدایت کی - مثلاً

۱ - جاپان دشمن عوامی گوریلا فوج کی تشکیل

۲ - ایک گوریلا اڈے کا قیام

۳ - مسلح جدوجہد کے لیے وسیع بنیاد کی تیاری

۴ - کوریائی اور جاپانی عوام کے اتحاد پر مبنی ایک متحدہ محاذ کی تشکیل

۵ - پارٹی تنظیموں کی عملی کارگزاری اور ینگ کمیونسٹ لیگ کو تقویت پہنچانے کے انتظامات

کم ال سنگ کی عمر ابھی صرف بیس سال تھی جب انہوں نے ۱۹۳۲ء میں جاپان دشمن گوریلا فوج تیار کر لی - لیکن اسے بے انتہا مشکلات اور آزمائشوں سے گزرنا پڑا کیوں کہ اس فوج کا اپنا کوئی علاقہ نہیں تھا نہ ایسی کوئی ٹھوس سیاسی قوت تھی جس پر وہ انحصار کر سکتی - نہ اسے کسی باقاعدہ فوج کا تعاون حاصل تھا نہ کوئی حکومت اس کی پشت پر تھی - ان نامساعد حالات کے باوجود یہ گوریلا فوج بیک وقت کئی قوتوں کا مقابلہ کر رہی تھی - ایک طرف جاپانی فوج سے مٹھ بھیڑ تھی تو دوسری طرف رجعت پسند کومنتانگ جنگی سرداروں اور جاپانی سامراج کے ایجنٹوں سے بھی نپٹنا پڑ رہا تھا - تاہم گوریلے پورے عزم و حوصلہ کے ساتھ جنرل کم ال سنگ کی قیادت میں تمام مشکلات پر قابو پاتے ہوئے اپنی مسلح جدوجہد کا دائرہ وسیع کرتے جا رہے تھے -

علاقہ سے محروم ، سیاسی قوت سے محروم اور بیرونی امداد سے محروم گوریلوں کے لیے ایسے فوجی اور سیاسی نوعیت کے اڈوں کا قیام ناگزیر تھا جہاں انہیں ہر قسم کی سوگرمیاں عمل میں لانے کے مواقع آسانی سے میسر آ سکتے ہوں اور وہ زیادہ نقصان اٹھائے بغیر دشمن پر کامیابی حاصل کر سکیں ۔

مختلف حالات کا سائنسی نقطہٗ نظر سے تجزیہ کرنے کے بعد جنرل کم ال سنگ نے فیصلہ کیا کہ کوریا اور چین کے سرحدی علاقے، وہ علاقے جو کوہ پیک دوسان کے ارد گرد ہیں جن کے پہلو میں دریائے تویان گانگ اور ایمنوک گانگ بہتے ہیں ، پہاڑی علاقے اور جیساندلو کے زرعی علاقے گوریلا اڈوں کے لیے مناسب ترین اور بہترین سود مند ثابت ہوں گے ۔ یہ علاقے جنگلات ، پہاڑوں کی ڈھلوانوں اور گہری وادیوں پر مشتمل تھے اس لحاظ سے یہاں قائم شدہ اڈے انہیں ایسی جغرافیائی پناہ گاہیں فراہم کرتے تھے جہاں وہ دشمن کے حملے سے محفوظ رہیں ۔

لہذا جنرل نے جنگ آزادی کے لیے یہیں گوریلا اڈے قائم کیے ۔ اور جاپان کے خلاف مسلح جدوجہد کو تیز کر دیا ۔ بعد ازاں ان گوریلا اڈوں نے گوریلا جنگ کے پھیلاؤ اور کامیابیوں میں عظیم کردار ادا کیا ۔

انقلاب کوریا کو جاری رکھنے میں اہم مسئلہ عوامی طبقوں کو اس جدوجہد کا حصہ بنانا تھا ۔ ۱۹۳۶ء میں جنرل نے ٹونگ گانگ میں ایک اجلاس طلب کیا اور یہ تجویز پیش کی کہ وطن کی بازیابی کے لیے ایک انجمن قائم کی جائے جس کا مقصد جاپان دشمن قومی متحدہ تنظیم کی صورت اختیار کرنا ہو ۔

اس سمت میں ۵/ مئی ۱۹۳۶ء کو ایک انجمن اے ، آر ، ایف ARF

(Association for the Restoration of the Fatherland)

کے نام سے قائم کی گئی ۔ یہ کوریا میں منفرد طرز کی پہلی عوامی تنظیم تھی ۔ جنرل کم ال سنگ اس انجمن کے چیئرمین چنے گئے اور

اپنے خطبۂ افتتاحیہ میں انہوں نے پوری دنیا کو مخاطب کیا۔
ان کے خطاب کا خلاصہ یہ ہے:-

" فی الحقیقت آج ہماری قوم فلاکت و نکبت سے دو چار ایسی زبوں حالی کو پہنچ چکی ہے کہ باید و شاید ! جو لوگ انتہائی بد قسمتی کے چکر میں پڑے ہوں انہیں اپنے وطن سے بھی بے دخل کر دیا جائے تو پھر آخر ان کے لیے کیا چارۂ کار رہ جاتا ہے ؟ ہماری قوم کے سامنے جاپانی سامراج کے لٹیرے غنیموں سے دست و گریباں ہونے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے -

یہ اس بات کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ ہزاروں لاکھوں نوجوان وطن کی محبت سے سرشار ہو کر کوریائی عوام کی انقلابی فوج میں شامل ہو گئے اور مسلح ہو کر جاپانی سامراجیوں کے خلاف جنگ میں دادِ شجاعت دے رہے ہیں۔ اب جاپانی سومایہ دارانہ نوآبادیاتی نظام کے خلاف ملک کے گوشے گوشے اور چپے چپے پر مزدوروں ، کسانوں ، جوانوں اور طلبہ کی جدوجہد جاری ہے -

یہ حقیقت اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ کوریائی قوم اپنی آزادی اور اپنی حاکمیت کی سچی لگن رکھتی ہے- اور اس میں ولولۂ جنگ کا ایک جذبۂ بے تاب موجزن ہے جو یقیناً قومی آزادی کے مقصد کی تکمیل کرے گا "-

اس کے علاوہ اس انجمن اے ،آر،ایف ARF کا ایک دس نکاتی پروگرام وضع کیا گیا جس میں بالتّصریح کوریائی انقلاب کی خصوصیات ،امور، حرکی قوت ، جدوجہد کے مقاصد ، حکمتِ عملی اور فوجی تدابیر کے اصولوں کی وضاحت کی گئی -

یہ مندرجہ ذیل ہیں -

۱ - جاپانی سامراج کی غاصب حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے پورے کوریا کو مستعد کر دینا اور کوریا میں حقیقی عوامی حکومت کا قیام عمل میں لانا -

۲- جاپان کو شکست فاش دینا اور اس کی کٹھ پتلی ریاست مانچوکو (Manchukuo) کا خاتمہ کر کے کوریائی اور چینی عوام میں اتحاد و یک جہتی پیدا کرنا۔

۳- جاپانی افواج ، مسلح پولیس ، پولیس اور ان کے ایجنٹوں سے ہتھیار ڈلوانا اور ایک ایسی انقلابی فوج تیار کرنا جو کوریا کی آزادی کے لیے جان و دل سے لڑے۔

۴- جاپان اور جاپانیوں کی ملکیت میں قائم تمام بڑے ادارے ، ریلویز ، بنکس ، شپنگ ، زرعی اور آب پاشی کے نظاموں پر قبضہ کر لینا ۔اور جاپان کے حامی غداروں کی تمام جائیداد اور جاگیریں ضبط کر کے اپنی تحویل میں لینا تاکہ ان کی آمدنی سے تحریکِ آزادی کو سرمایہ فراہم کیا جائے ۔اور کچھ حصہ سے غربا کو مالی امداد دی جائے۔

۵ - حکومت جاپان اور اس کے ایجنٹوں کی طرف سے عوام کو دیے گئے تمام قرضوں کی معافی اور تمام ٹیکسوں اور اجارہ دار نظاموں کی ادائی موقوف کرنا تاکہ وہ رقم مزدور طبقہ کا معیار زندگی بلند کرنے پر صرف ہو - نیز قومی صنعتوں ، زراعت اور تجارت کے وسائل عام اور آسان بنا کر انہیں ترقی دینا۔

۶- آزادئ تقریر ، آزادئ پریس، اجتماع اور تنظیم کا حق حاصل کرنا - دہشت پسند حکومت کی کوکھ سے جنم لینے والے جاگیردارانہ نظریات کی مخالفت کرنا اور تمام سیاسی قیدیوں کو رہائی دلانا۔

۷- ذات پات کی تمیز اور ایسے تمام غیر مساویانہ نظاموں کا خاتمہ کرنا جو خواص اور عوام کی تخصیص کرتے ہیں۔ عورتوں کی سماجی حیثیت کو ترقی دینا اور ان کی ذات کے احترام کا تحفظ کرنا۔

۸- خرکاری اور غلامانہ تعلیم کو ختم کرنا ، قومی زبان ذریعۂ تعلیم بنانا اور مفت لازمی تعلیم کا بندوبست کرنا۔

۹- آٹھ گھنٹے یومیہ اوقات کار مقرر کرنا ، مزدوروں کے حالات بہتر بنانا اور ان کی اجرتوں میں اضافہ کرنا ۔مزدور قوانین مرتب کرنا اور

بے روزگاروں کے لیے سرکاری بھتہ میں اضافہ کرنا۔

۱۰ ۔ اُن تمام قوموں اور ریاستوں سے جو کوریا سے برابری کا سلوک کریں باہمی اتحاد اور یگانگت قائم کرنا ۔اور جنھوں نے قومی تحریک میں غیر جانب داری روا رکھی ہو یا خیر سگالی کے جذبات کا اظہار کیا ہو ان سے رضاکارانہ بنیاد پر دوستانہ تعلقات قائم کئے جائیں۔

کوریا میں ماضی میں بہت سی جاپان دشمن اور خود مختاری کی تحریکیں اٹھتی رہیں مگر وہ ایک ایسی ہمہ گیر عظیم متحدہ تحریک میں نہ ڈھل سکیں جو آزادی کے بنیادی مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوتی، البتہ اس انجمن آرف کے قیام نے یہ مقصد پورا کر دکھایا ۔

شمالی نصف حصۂ کوریا کے عوام نے آزادی کے بعد زمام اقتدار سنبھالتے ہی عظیم خیالات پر مشتمل اس دس نکاتی پروگرام کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے میں دیر نہیں کی ۔ چنانچہ وہ اب سماجی سیاسی زندگی کے ہر شعبہ میں حقیقی مسرت و خوشحالی سے فیضیاب ہو رہے ہیں ۔

کوریا کے عوام اپنے ملک کے آپ معمار بن کر پوری لگن سے اسے جنت اَرضی بنانے میں مصروف و کوشاں ہیں۔

ڈونگ گانگ اجلاس (منعقدہ مئی ۱۹۳۶ء) کے بعد جنرل کم ال سنگ نے کوریا کے شمالی حصے سے ملحقہ وسیع علاقوں میں گوریلا اڈوں کے قیام کی مہم تیز کر دی ۔ ان خبروں سے چوکنّا ہوکر دشمن نے طاقت حاصل کرنے کے لیے کمک طلب کر لی اور عوام کے جذبۂ آزادی کو کچلنے کے لیے ان پر دوزخ کا عذاب نازل کر دیا۔ اس کے باوجود مئی اور جون کے درمیان جو جنگیں ہوئیں ان میں جاپانی دستوں کو شدید ہزیمت اٹھانی پڑی ۔ کوریائی عوامی انقلابی فوج Korean People's Revolutionary Army نے اچانک حملوں ، تیز رفتار حمل و نقل کے انتظامات اوربہتر منصوبہ بندی کی بدولت ہر جگہ برتری حاصل کی ۔

جاپانی فوج کی نظر میں فوجی حکمتِ عملی کے لحاظ سے ضلع

فوسنگ کا صدر مقام فوسنگ نہایت اہمیت رکھتا تھا اسی لیے انہوں نے یہاں کوانگ تانگ فوج اور کٹھ پُتلی مانچوکو فوج کے گیریژن اور پولیس ہیڈ کوارٹرز بنائے اور ایک پارٹی گوریلوں کو تلاش کرنے کی یہاں رکھ دی تھی -

جنرل کم ال سنگ نے اٹھارہ سو جوانوں پر ایک مشترکہ یونٹ کی کمان سنبھالی اور ۱۶ اگست کو اچانک حملے کی تیاری کی - حملے کا آغاز ضلعی صدر مقام سے جنوبی سمت میں کچھ فاصلے پر واقع سونگ شوزین سے کیا جہاں ایک ہی ہلّے میں دشمنوں کا صفایا کر دیا گیا - فوراً ہی اگلے روز ۱۷ اگست کو پیش قدمی کر کے ضلعی صدر مقام پر بھی دھاوا بول دیا - گھمسان کا رن پڑا لیکن جنرل نے بلا کی حکمت عملی سے کام لے کر جاپانی فوج کو گھیرے میں لے لیا جس سے دشمن کو عبرت ناک شکست کا منہ دیکھنا پڑا - اس زبردست فتح نے جنرل اور فوج کے حوصلے اور بھی بلند کر دیے -

جاپانی شہنشاہیت پورے ایشیا پر حکمرانی کے خواب دیکھ رہی تھی - اس مقصد کے لیے کوریا کو ایک حفاظتی اڈہ بنا لیا گیا تھا - عوام پر ناقابلِ بیان ظلم و ستم روا رکھنے کے ساتھ ساتھ ان کی قومی ثقافت کو بھی مسخ کیا جا رہا تھا - بظاہر " جاپان اور کوریا ایک ہیں" - یا " جاپانی اور کوریائی ایک ہی نسل کی شاخیں ہیں" - جیسے نعرے لگا کر انہیں فریب میں مبتلا کیا جاتا - ان حالات میں جب کوریائی عوام موت اور زندگی کے دوراہے پر کھڑے تھے انہیں جنرل کم ال سنگ اور اس کے مسلح دستوں کی صورت میں امید کی ایک کرن دکھائی دی -

یہی وہ وقت تھا کہ جب جنرل نے کوریائی عوام کے سروں پر سے غاصبوں کے عذاب دور کر کے قومی آزادی کا پھریرا لہرانے کے لیے دشمن پر کاری ضرب لگانے کا فیصلہ کیا -

۴ جون ۱۹۳۷ء کو کوریائی عوامی انقلابی فوج کے جوانوں نے ارضِ وطن میں پیش قدمی کی - سوزمین وطن پر قدم رکھتے ہی ان کے دلوں میں دشمن کو نیست و نابود کر دینے کا جذبہ طوفان کی صورت اختیار کر گیا - اسی رات پوچون بو پر سرخ گولوں کی ایسی

بارش ہوئی کہ آتشیں چمک سے رات کی تاریکی دن کے اجالے میں بدل گئی - حتّٰی کہ انقلابی فوج نے دشمن حکومت کے تمام اہم ٹھکانوں پر قبضہ کر لیا - " جنرل کم ال سنگ زندہ باد " کے فلک شگاف نعروں کی گونج سن کر ہر گلی محلے سے لوگ دوڑتے ہوئے باہر نکل آئے اور جنرل کے گرد گھیرا ڈال کر خوشی و مسرت کا اظہار کرنے لگے -

جنرل نے ان کے سامنے ایک تقریر کی جس میں کہا :

" آخری فتح ہمارے نصیبوں میں ہے جو اپنے وطن کی آزادی کے لیے لڑ رہے ہیں - آئیے ہم سب قدم ملا کر پورے جوش و استقلال کے ساتھ آگے بڑھیں کہ ہم دوبارہ بہت جلد اپنا ملک حاصل کر لیں گے اور پرمسرت زندگی سے لطف اندوز ہوں گے - "

پوچون بو کے معرکے میں فتح کی خبر بجلی کے کوندے کی مانند ملک کے کونے کونے میں پہنچ گئی - سسکتے ہوئے عوام میں جان پڑ گئی اور انہیں سسکانے والے دشمنوں کے ارمان مر گئے -

اپریل ۱۹۳۹ء میں جنرل کم ال سنگ نے کوریائی عوامی انقلابی فوج کے افسروں کا ایک اجلاس طلب کیا اور دوبارہ ارض وطن میں پیش قدمی کا خاکہ ان کے سامنے رکھا -

۱۵ / مئی کو انقلابی فوج کے جوانوں نے جنرل کی کمان میں ارض وطن کی طرف مارچ شروع کیا - چونگ پونگ پہنچ کر انہوں نے کیمپ کے گرد و نواح میں مختلف نعرے لکھ دیے - ایک نعرہ یہ تھا: " کوریائی جوانو ! فوراً میدان میں نکل آؤ اور پوری مستعدی سے جاپان کے خلاف جنگ میں حصہ لو - "

انقلابی فوج کے یونٹوں کی پیش قدمی سے خوفزدہ جاپانی فوج نے ساری توجہ اپنی سرحدوں پر متعین تعزیری دستوں پر مرکوز رکھی اور تعزیری شب خون مارنے کا منصوبہ تیار کیا -

۲۰ / مئی کو جنرل نے فوج کے کامریڈوں کی ایک میٹنگ پیگابونگ

کیمپ میں طلب کی اور اس صورتِ حال پر غور کرنے کے بعد فیصلہ کیا کہ پسان وسان فوجی سڑک" کے راستے دن دھاڑے موسان کے علاقے میں گھس کر بجلی کے کڑاکے کی مانند اچانک حملہ کر دیا جائے کیوں کہ دشمن کی ساری توجہ پہاڑی علاقے پر مرکوز ہے، لہذا ہماری کامیابی یقینی ہے۔"

اس بات کا دشمن تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ دن کے اجالے میں کوئی حملہ آور اس کھلی سڑک کو استعمال کر سکتا ہے جبکہ کوریا کی عوامی انقلابی فوج نے چالیس کلو میٹر اندر تک اس سڑک پر قبضہ کر لیا اور ۲۱ / مئی کو موہو پہنچ گئی۔

۲۲ / مئی کی رات کو سنساڈونگ اور سنگا چوک دو اطراف سے پیش قدمی کر کے دشمن پر ٹوٹ پڑے اور پلک جھپکتے میں دشمن فوج کا صفایا کر دیا۔

موسان میں انقلابی فوج کی پیش قدمی سے ہراساں ہو کر جاپانی افواج نے چاروں طرف سے ان پر حملہ کر دیا مگر جنرل کم ال سنگ کی مدبّرانہ فوجی حکمت عملی کے باعث انہیں بھاری نقصان اٹھا کر پسپا ہونا پڑا۔

موسان کی فتح نے ارض وطن میں پاؤں جمانے کا مقصد پورا کر دیا لہذا جنرل نے اپنے فوجی دستوں کو پیچھے ہٹ کر دریائے تومان گانگ کے پار مورچہ جمانے کا حکم دے دیا۔

اس فتح کی خبر نے بھی سارے کوریا کے عوام میں خوشی کی ولولہ خیز لہر دوڑا دی۔ بے شمار رضاکار انقلابی فوج میں شامل ہو گئے یا ہر طرح کا تعاون کرنے لگے۔

۱۹۳۲ء میں گوریلا فوج کے قیام کے بعد جنرل کم ال سنگ نے جاپان کے خلاف جس مسلح جدوجہد اور جنگ کا آغاز کیا اس میں انہیں بے حد تکلیفیں اٹھانی پڑیں۔ پہاڑوں کی خطرناک ڈھلوانوں اور نوکیلی چٹانوں پر ان کا بسیرا رہا۔ کئی کئی دن بھوکے پیاسے رہنا پڑا۔ سردی کی شدت برداشت کی مگر حوصلے بلند رکھے اور پے در پے فتوحات حاصل کرتے چلے گئے۔ کوریا کی جنرل حکومت

کے شائع کردہ اعداد و شمار کے مطابق موسم بہار ۳۲ ۱۹ء سے لے کر جون ۳۶ ۱۹ء تک کے عرصے میں ان کی انقلابی اور جاپانی فوجوں کے درمیان دو ہزار سے زیادہ معرکے ہوئے- اور مجموعی طور پر دس لاکھ گوریلوں نے ان میں حصہ لیا- شمال مشرقی چین میں صرف ۳۷ ۱۹ء میں تین ہزار نو سو لڑائیاں لڑی گئیں -

جنرل کم ال سنگ کی قیادت میں انقلابی فوج نے جو سیاسی اور فوجی کامیابیاں حاصل کیں انہوں نے کوریائی عوام کو بے پناہ حوصلہ بخشا - سیول ، یونگ یانگ ، چونگ جن ، ہنگ نام ، موسان اور دیگر شہروں کی فیکٹریوں میں اور دریائے ایمنوک گانگ کے ساتھ ساتھ برفانی اسٹیشنوں میں مسلسل ہڑتالوں اور تخریب کاری کے مظاہروں کا سلسلہ جاری رہنے لگا - جیلوں تک میں لڑائی شروع ہوگئی - کوریا کی آزادی اور مکمل فتح کے یقین نے ہر فرد کے دل میں جوش و ولولہ پیدا کر دیا جس سے ملک کے ہر حصے میں جاپانیوں کے خلاف عوامی تحریک شدت اختیار کر گئی - شمال میں کوہ پیک دوسان سے لے کر جنوب میں جزیرۂ چی جو تک تمام کوریائی عوام ، کیا بچے کیا بوڑھے ، کیا عورت کیا مرد ، سب کی زبان پر جنرل کم ال سنگ کا نام تھا جسے وہ آزادی کا سورج اور اپنا نجات دہندہ قرار دیتے تھے- ان کے دلوں میں اس کی عزت و توقیر اور عقیدت و احترام کی کوئی حد نہیں رہی تھی -

اس پس منظر میں اور پھر اس صورت حال میں کہ امریکی بم باری نے پیونگ یانگ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی ، میں جب اس شہر کو آج دیکھتا ہوں تو واقعی حیرت ہوتی ہے ، پیونگ یانگ کی آبادی کے بقدر بم گرنے کے بعد یہ شہر کلیۃً تباہ ہو چکا تھا - اس تباہی کے بعد جو تعمیر ہوئی ہے وہ دعوتِ فکر دیتی ہے اُن اقوام و ملل کو ، جیسا کہ پاکستان ہے ، کہ جو اپنی خودی کو فروخت کر کے اور خود اعتمادی کو تج کر بلا ارادہ شب و روز تخریب میں مصروف نظر آتے ہیں -

پیونگ یانگ میں مجھے ہر طرف ہر شعبۂ زندگی میں نہایت شاندار کامیابیوں اور کامرانیوں کے ثمرات عملی صورت میں دکھائی

دیہے۔ ملحقہ قصبات و دیہات صاف ستھرے اور نفاست کے آئینہ دار، سبز پوش درختوں سے آراستہ گلیاں اور سڑکیں، گلہائے رنگ رنگ سے معطر باغات، لہلہلاتے مشترکہ کھیت اور تعلیم جس کی بنیاد جوچے فکر پر استوار ہے۔

اس حقیقت کو اپنی نظروں سے دیکھ کر اس سرچشمۂ قوت کے بارے میں سوچے بغیر رہنا ممکن نہیں کہ جس نے کوریا کی تقدیر بدل کر اسے ایسا حسین و جمیل روپ بخش دیا کہ آج اسے دیکھ کر ہر دل باغ باغ ہوتا ہے۔

بلاشبہ اس تحیر خیز کایا کلپ کا سبب وہ روایات ہیں جو جاپان دشمن گوریلا فوج کی پندرہ سالہ طویل اور صبر آزما اس جدوجہد کے دوران قائم ہوئیں جس کی بنیاد جنرل کم ال سنگ نے رکھی تھی اور انہی انقلابی روایات کے طفیل کوریا کے عوام کو اپنے خوش حال معاشرے کی تعمیر کا موقع ملا۔ "یواین" افواج کو جنہیں افرادی اور فنی برتری حاصل ہونے کا غرور اور امریکی طاقت کی شہہ حاصل تھی شکست دینے اور ۱۵/ اگست ۱۹۵۲ء کی آزادی کے بعد شمالی کوریا کے عوام اج ایسے معاشرتی معجزات دکھا رہے ہیں جن پر دنیا انگشت بدنداں ہے۔

جدوجہد آزادی —— راہ پاکستان

لیٹنے کو تو میں بستر پر لیٹ گیا مگر فکر و نظر کے مدّ و جزر نے، خیالات کے طغیان اور محسوسات کی بپھری ہوئی امواج نے مجھے ماضی میں لے جا کر پھینک دیا۔ میں نے دیکھا کہ افواج برطانیہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے روپ میں مسلم ہند کی ہر طاقت کو غارت کر رہی ہیں۔ ہندستان پر مسلمانوں کی حکومت کا ہر چراغ وہ گل کرتی جا رہی ہیں، اور بالآخر انہوں نے غلبہ حاصل کر لیا۔ ہندستان میں مسلم راج نے دم توڑ دیا اور مسلم ہند پر برطانوی استعمار غالب آ گیا۔ غلامی کا طوق گلوں میں پڑ گیا۔ ڈیڑھ سو سال تک برطانیہ کی ہر پالیسی ہندستان میں مسلمانوں کو کمزور کر دینے

کی آئینہ دار رہی - زندگی کے ہر شعبے میں اور حیات کے ہر رخ مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کرنے کا سلسلہ پورے تواتر و تسلسل کے ساتھ جاری رہا ، حتیٰ کہ مسلمان واقعی یہ بھول گئے کہ کبھی وہ صدیوں ہندستان کے حکمراں رہے ہیں - واقعہ یہ ہے کہ برطانیہ ہندستان پر راج مسلمان کو کمزور کیے بغیر نہیں کر سکتا تھا - بہ ایں ہمہ ہندستان پر برطانوی غلبہ روکنے کے لیے مسلمانوں نے جو جدوجہد کی ہے اور ہر میدان میں جو زبردست قربانیاں مسلمانوں نے دی ہیں ان سے کوئی دیانت دار مورخ صرف نظر نہیں کر سکتا مگر اس سب کے باوجود برطانیہ نے ہندستان پر اپنی گرفت کو کم ازکم ڈیڑھ سو سال کا دوام دیدیا - اس پورے عرصے میں وہ طاقتِ مسلم کو زیر رکھنے سے ایک لمحہ غافل نہ رہی اور غیر مسلم طاقتوں کو ابھارنے میں اس نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا - زندگی کے ہر شعبے میں اور حیات کے ہر میدان میں برطانیہ نے مسلمانوں کو زیر کرنے اور رکھنے کا سامان پورے تواتر و تسلسل کے ساتھ جاری رکھا - ان کو ہندستان میں اگر خطرہ تھا تو یہی تھا کہ برطانیہ کی غلامی سے آزاد ہونے کا نعرہ اگر کوئی لگا سکتا ہے تو وہ مسلمان ہی ہیں ، اور واقعہ یہ ہے کہ اپنی تمام کمزوریوں اور ہزیمتوں کے باوجود ذہنِ مسلم کبھی اس حقیقت سے خالی نہ رہا کہ برطانیہ نے سات سمندر پار آکر مسلمانوں کی آزاد مملکت کو تاراج کر کے ان کو محکوم اور غلام بنایا ہے ، اور برطانوی استعمار کو دلِ مسلم نے کبھی قبول نہ کیا - خود میں نے " برٹش سبجکٹ " کی حیثیت سے آنکھ کھولی اور میری زندگی کا وہ الم ناک ترین لمحہ تھا کہ جب میرے ایک پاس پورٹ پر میری قومیت " برٹش سبجکٹ بائی برتھ " لکھی گئی - یہی وہ دن تھا کہ میرے جسم کے روئیں روئیں نے برطانیہ کے خلاف بغاوت کی تھی اور اسی دن غلامی کی شدید تکلیف میں نے محسوس کی تھی اور آزادی کا مفہوم میری سمجھ میں آیا تھا - میری فکری سیاسی زندگی کا آغاز اسی مقام سے ہوتا ہے - ہر چند کہ میں نے عملی سیاست میں نمایاں حصہ نہیں لیا کہ میرے حالات اور بزرگوں کے اشارات اس راہ میں مانع تھے ، مگر اس قدغن کے باوجود مجھے غلامی کی زندگی سے شدید نفرت تھی اور ان لوگوں سے شدید محبت کہ جو ہندستان کو انگریزوں کے غاصبانہ تسلط سے نجات دلانے کے لیے سربکف تھے -

اور اس میدان میں مسلمان کا جو جذبہ تھا وہ فطری تھا کہ حکومت اس سے چھینی گئی تھی۔ آزادی کی تڑپ جو مسلمان کے سینے میں ہو سکتی تھی وہ دوسرے سینوں میں ممکن نہ تھی۔ بہ ایں ہمہ مسلمان کے ساتھ آزادی کی جنگ میں برصغیر کے غیر مسلم بھی میدان عمل میں شد ومد کے ساتھ داخل ہوئے اور اکثریت اقلیت پر غالب آنے کے لیے پوری طرح کوشاں ہوئی۔ اسے تسلط برطانیہ سے زیادہ غلبۂ مسلم کے قوی خدشات لاحق تھے۔ اس لیے اس کی پالیسی آزادیٔ کامل سے مختلف تھی جس کا مظاہرہ کنگرس کے اجلاس میں ہوا کہ جب نیم آزادی (ڈومینین اسٹیٹس) کی تجویز پیش ہو کر منظور ہوئی۔ غیر مسلم ہندستان کی اس تجویز کو مکمل تائید حاصل تھی مگر اسی اجلاس میں بے قرار ہو کر ایک جرأت مند مسلم بھی کھڑا ہوا اور اس نے ببانگ دہل نیم آزادی کی تجویز کی شدت کے ساتھ مخالفت کی اور آزادیٔ کامل کی تجویز پیش کی۔ یہ مولانا حسرت موہانی تھے! اس فرق کو محسوس کرنا ضروری ہے کہ اس سے ہندستان میں سیاسی مدوجزر کا گہرا تعلق ہے۔

بارے ہندستان میں غلامی کا احساس ہر قلب میں اتر گیا اور انگریز کے لیے یہ فیصلہ ناگزیر ہو گیا کہ وہ ہندستان کو چھوڑ دے۔ مگر کس طرح؟

میں اس موضوع پر کسی تفصیل میں جائے بغیر اپنے تاثرات کو پوری آزادی کے ساتھ معرض تحریر میں لانا ضروری سمجھتا ہوں۔ میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا ہے کہ ہندستان میں تحریک آزادی کی شدت کے ساتھ مسلم طاقت کو اپنی برتری کا احساس ہمیشہ رہا ہے اور اس کے برعکس غیر مسلم اکثریت کو غلبۂ مسلم سے شدت کے ساتھ فرار تھا۔ اظہار کے بغیر یہ قلبی واردات تھیں کہ ماہرین نفسیات ان کا تجزیہ بخوبی کر سکتے ہیں۔

تصوّر و تخلیق پاکستان

مطالبۂ پاکستان کی نظریاتی بنیاد کے باعث قومیت پرستی کے اس جدید دور میں اس کی تخلیق کے سلسلے میں غلط فہمیوں کا پیدا ہونا حیرت انگیز نہیں۔ اس کا ایک اور سبب یہ بھی ہے کہ اس تحریک کی مدت بہت کم تھی جس کے نتیجے میں وہ دنیا کے نقشے پر ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے نمودار ہوا، اور چند سال کے اس مختصر زمانے میں اس کے کارکنوں کو یہ موقع نہیں مل سکا کہ ضروری تفصیلات کے ساتھ اس کے بنیادی تصور کو تاریخی عوامل کی روشنی میں دنیا کے سامنے پیش کر سکیں۔ علاوہ ازیں بعض سیاسی اور صحافتی طبقوں نے اپنے مفادات و اغراض کے پیش نظر اس کی مخالفت اتنے وسیع پیمانے پر کی کہ بنیادی حقائق لوگوں کے سامنے نہیں آسکے۔ برصغیر کی کثیر التعداد اکثریت یعنی ہندو قوم کے پریس اور سیاسی لیڈروں نے اس پروپیگنڈا کے ذریعہ سے عوام کو دھوکا دینے کی کوشش کی کہ مسلمان پاکستان اور تقسیم ہند کا مطالبہ برطانوی حکومت کے ایماء پر کر رہے ہیں اور درحقیقت یہ انگریز کے قدیمی حربہ یعنی "تقسیم کرو اور حکومت قائم رکھو" کے تاریخی عمل کا ایک شاخسانہ ہے۔ قائد اعظم کے ایثار، سیاسی تدبّر اور دیانت داری کا ان لوگوں کو خوب اندازہ تھا، لیکن مطالبۂ پاکستان کی مخالفت میں وہ ان پر بھی برطانوی ایجنٹ ہونے کا احمقانہ الزام لگاتے تھے۔

مطالبۂ پاکستان کی نظریاتی بنیاد اور اس کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے مسلمانان برصغیر کی تاریخ کے بعض واقعات کا تجزیہ ضروری ہے۔ ان کی آمد سے قبل متعدد اقوام یہاں آئیں اور حربی فتوحات کے نتیجے میں انھوں نے اپنی حکومتیں بھی قائم کیں۔ ان سب میں طاقتور اور کثیر التعداد آریا تھے، انھوں نے شمالی برصغیر کے وسیع علاقوں میں غلبہ حاصل کر کے تہذیب اور حکمرانی کا سکہ اس حد تک جما لیا کہ دوسری اقوام ان کے زیر نگیں آگئیں اور قدیم باشندے جو علیحدہ رہے وہ اچھوتوں اور غلاموں کی زندگی بسر کرنے لگے۔ آریاؤں کے بعد بھی بعض اقوام کے لوگ آئے۔ انھوں نے کامیابیاں بھی حاصل کیں اور حکومتیں بھی قائم کیں، لیکن رفتہ رفتہ ان کا علیحدہ

تشخص ختم ہوتا چلا گیا اور شمالی برصغیر (سندھ کے علاوہ) آریائی تہذیب کا گہوارہ بن گیا۔ یہ تہذیب اور مذہب جو زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ ہندو تہذیب اور مذہب کا نام اختیار کر چکی تھی، ایک ایسے دریا کی طرح پھیل گئی تھی کہ دوسری اقوام اور ان کی تہذیبیں اس میں مدغم ہو کر رہ گئیں۔ چنانچہ آٹھویں صدی عیسوی میں جب مسلمان برصغیر میں داخل ہوئے تو یہاں صورت حال یہ تھی کہ مشرقی اور مغربی خطوں میں بدھ اقلیت کی مختصر آبادیوں کے علاوہ شمال میں ہندو قوم اور مذہب کا مکمل اقتدار تھا۔ قدیم باشندے جو شدر کہلاتے تھے غلاموں کی حیثیت سے ان کی خدمت کرتے تھے، اور "اچھوت" سمجھے جاتے تھے۔ جنوب میں بھی آریائی تہذیب کے اثرات داخل ہونے لگے تھے۔

مسلمانوں کی فتوحات اور قیام اقتدار کے بعد قدرتی طور پر یہاں ایک تہذیبی کشمکش کا سلسلہ شروع ہو گیا، اس لیے کہ اسلام اپنے ساتھ حیات انسانی کے دینی اور دنیوی پہلوؤں کے لیے ایک مکمل ضابطۂ حیات لایا تھا اور اسی کی بنیاد پر اسلامی تہذیب کی عمارت قائم ہو چکی تھی۔ اس کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ جہاں تک اس کے بنیادی اصولوں کا تعلق تھا کسی دوسری تہذیب سے سودے بازی نہیں ہو سکتی تھی۔ دوسری اقوام کے لوگ اسلام قبول کر کے اس کے حلقے میں داخل ہو سکتے تھے، لیکن وہ پھر مکمل مسلمان ہو جاتے تھے۔ بہ الفاظ دیگر برصغیر کی تاریخ کا وہ صدیوں پرانا عمل جاری نہیں رہ سکتا تھا جس کی بدولت باہر سے آکر بسنے اور ایک مدت تک حکمرانی کرنے والی قومیں ہندو تہذیب کے بڑھتے ہوئے سمندر میں غائب ہو جاتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اب یہ دونوں تہذیبیں متساوی خطوط کی طرح ایک دوسرے کے سامنے موجود تھیں اور مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے سیاسی اقتدار کی موجودگی میں دونوں کو اس کا احساس ہو گیا تھا کہ ان کو اپنا علیحدہ تشخص قائم رکھتے ہوئے اسی خطۂ ارض میں رہنا ہے۔ خوش قسمتی سے مسلمان " لا اکراہ فی الدین " کا اصول اپنے ساتھ لائے تھے اور کسی حالت میں اس راہ سے نہیں ہٹ سکتے تھے۔ ان کی حیرت انگیز رواداری کی پالیسی کی بنیاد یہی آیت قرآنی

تھی - چنانچہ تاریخ کے ہزار سالہ دور پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ دین و مذہب کے علاوہ علوم و فنون، اور معاشرت کے متعدد پہلوؤں کے لحاظ سے دونوں کے علیحدہ تشخص کا وجود برابر نظر آتا ہے - ہاں سیاسی نظم ونسق کی مشینری اور معاشی و اقتصادی نظام میں تعاون و یک جہتی ممکن ہی نہیں بلکہ ناگزیر تھی چنانچہ ان میدانوں میں ہندو اور مسلمان باہم کار بار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں -

یورپی اقوام کے آنے اور بالآخر برطانوی اقتدار کے قیام سے برصغیر کا سیاسی نقشہ انقلابی انداز میں بدلنے لگا - یورپ میں قومیت کے تصور کی بالادستی قائم ہو چکی تھی ، اور اس کے عناصر میں مذہبی زندگی کا کوئی مقام نہ تھا ، اور اس کو ہر شخص کا ذاتی مسئلہ سمجھا جانے لگا تھا - اجتماعی اور بالخصوص سیاسی زندگی کی بنیاد کلیۃً قومیت کے تصور پر ہی تھی - چنانچہ اقتدار حاصل کرنے پر برطانوی استعمار کے سامنے سب سے زیادہ اہم مسئلہ یہ تھا کہ اس اقتدار کو مستحکم بنانے کے لیے کیا راہ عمل اختیار کی جائے - ان کے سیاسی رہنماؤں اور حکومت کے اہم کارکنوں نے جلد ہی اندازہ لگا لیا کہ ہندو اور مسلمان قومیت کی بنیاد پر تو نہیں لیکن مذہب کی بنیاد پر دو قومیں ہیں جو اگرچہ ایک دوسرے میں مدغم تو نہیں ہو سکتیں لیکن متحد ہو کر حکومت کی مشینری کے خلاف ایک مشترکہ محاذ بنا سکتی ہیں - چنانچہ اس امکان کو محال سے محال تر بنانا اور "لڑاؤ اور حکومت کرو" کے ذریعہ سے اپنے استعمار کی جڑوں کو مضبوط کرنا برطانوی حکومت کی پالیسی کا اولین مقصد بن گیا - چونکہ انگریزوں کے پاس اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ سے آیا تھا ، قدرتی طور پر انھوں نے ہندوؤں کی سرپرستی کر کے ان کو آگے بڑھانے اور مسلمانوں کی قوت اور اثر کو کمزور کرنے کی کوشش ابتداء ہی سے شروع کر دی - ہندوؤں کی طرف سے ان کو تعاون ملا - چنانچہ اٹھارویں صدی کے ربع دوم میں بنگال اور جنوبی ہندستان میں مغربی تعلیم کے لیے اسکول اور کالج قائم ہوئے - اس تحریک میں راجہ رام موہن رائے نے نمایاں کردار ادا کیا - یہی سبب ہے کہ آج ان کو ہندو قومیت کا عظیم بانی سمجھا جاتا ہے - ان کی

اپنی تعلیم مشرقی انداز سے ہوئی تھی لیکن ان کی تحریک کا محور مغربی طرز تعلیم تھا۔ برطانوی استعمار نے اس دور میں مسلمانوں کی اقتصادی حالت گرانے اور ان کے سیاسی اثر کو ختم کرنے کے لیے جو اقدامات کیے ان کی تفصیلات تاریخی تصانیف میں مطالعہ کی جا سکتی ہیں۔

مسلمانوں پر اس دور میں احساس محرومیت کے اثرات برابر بڑھ رہے تھے، مغلیہ سلطنت کا چراغ ٹمٹما رہا تھا اور شہنشاہ کی حکومت "از دلّی تا پالم" بھی نہ تھی۔ ان ہی حالات کے پیش نظر بعض علماء اور مشائخ اور چند دیگر رہنماؤں نے جن میں وہ ہندو سردار اور زمیندار بھی شامل تھے جن کو اقتدار اور جاگیروں سے محروم ہونا پڑا تھا، ایک انقلابی تحریک چلائی۔ ۱۸۵۷ء کا انقلاب ہماری تاریخ کا ایک عظیم واقعہ ہے اور اس کی ناکامیابی ایک عظیم سانحہ۔ اس کے نتیجے میں برطانوی حکومت نے اقتدار اور نظم ونسق براہ راست خود سنبھال لیا۔ اس زمانے میں مسلمانوں پر ناقابل بیان مظالم ڈھائے گئے۔ لاتعداد لوگوں کو پھانسیاں دی گئیں۔ ان کی جاگیریں ضبط کی گئیں اور ان کے محلات مسمار کرا کر ہل چلوائے گئے۔ دہلی کی جامع مسجد پر قبضہ کر لیا گیا اور کئی سال تک مسلمانوں کا داخلہ اس میں بند رہا۔ غرضکہ وہ قوم جو برصغیر پر ہزار سال تک حکمراں رہی تھی اب قعر ناکامی میں دھکیلی جا رہی تھی۔ خوش قسمتی سے اس زمانے میں ان کو ایک رہنما مل گیا جس کی کوششوں نے ان کو مکمل تباہی سے بچا لیا۔ سید احمد خان نے، جو ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے تھے اور جنھوں نے برطانوی حکومت کی ملازمت کر لی تھی، یہ المیہ اور مسلمانوں کے مصائب اپنی آنکھ سے دیکھے تھے۔ ان کے دل پر ان غمگین واقعات کا گہرا اثر تھا۔ ان کے تعلقات حکومت سے اچھے تھے اور بعض انگریز افسروں سے ان کی دوستی بھی ہو گئی تھی۔ چنانچہ انھوں نے طے کیا کہ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر اپنی قوم کی اصلاح کریں۔ ان کی محکم رائے تھی کہ ہندوؤں کی طرح مسلمانوں کو بھی حکومت سے تعاون کرنا چاہیے اور مغربی تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔ سید احمد خان ایک دور بین اور دور اندیش شخص تھے اور اگرچہ خود انھوں نے انگریزی تعلیم حاصل نہیں کی تھی، انھوں نے اندازہ

لگا لیا تھا کہ اسی کے ذریعہ سے مسلمان اپنی حالت کو بہتر کر سکتے ھیں۔ ۱۸۷۵ء میں ایک اسکول اور اگلے سال علیگڑھ میں کالج قائم کیا ، جس کے نتیجے میں مسلمانوں میں مغربی تعلیم کا رواج ھوا اور وہ بھی ترقی کے راستے پر گامزن ھو گئے ۔

۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کنگرس قائم ھوئی اور اس سے برصغیر میں سیاسی نقشے کی شکل بدلنی شروع ھو گئی۔ سید احمد خاں نے سوچا کہ مسلمانوں کے لیے سیاست سے علیحدہ رھنا جس پر وہ اب تک زور دیتے رھے تھے ، مفید ثابت نہیں ھوگا۔ گزشتہ پچاس سال سے ھندو لیڈر مسلمانوں کو علیحدہ چھوڑ کر صرف اپنی قوم کی اصلاح اور ترقی کے لیے کوشش کر رھے تھے جس کے باعث وہ اقتصادی تعلیمی اور سیاسی میدانوں میں ھندوؤں سے پیچھے رہ گئے تھے۔ اب کنگرس نے ھندو مسلمانوں کے ایک قوم ھونے کا نعرہ لگایا اور ان کو کنگرس میں شریک کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ تعداد کی کمی اور ترقی کی کم رفتاری کے باعث کنگرس میں ان کی شرکت کا ایک ھی نتیجہ ھوتا کہ وہ ایک غیر فعال اقلیت بن کر ھندو اکثریت کے رحم و کرم کے محتاج بن جاتے۔ ھندو اکثریت کو ان سے ھمدردی نہ تھی اور نہ ھوتی ، اور نتیجہ یہ ھوتا کہ رفتہ رفتہ برصغیر کی سیاسی زندگی میں ان کا علیحدہ تشخص ختم ھو جاتا۔ سید احمد خاں جانتے تھے کہ دینی ضابطۂ حیات کی بنیاد پر مسلمان ایک قوم ھیں اور ایک ایسی قوم جو کسی دوسری قوم میں مدغم نہیں ھو سکتی۔ ان حالات اور واقعات کے پیش نظر انھوں نے مسلمانوں کو کنگرس سے علیحدہ رھنے کا مشورہ دیا اور نہایت مدلل اور زوردار الفاظ میں دو قومی نظریہ پیش کیا۔ چونکہ برصغیر کی ھزار سالہ تاریخ کی یہ ایک بنیادی حقیقت تھی اور کنگرس صرف اپنے مفاد کی خاطر یک قومی نظریہ یعنی ھندو اور مسلمانوں کا ایک قوم ھونا ثابت کرنے کی کوشش کر رھی تھی ، مسلمانوں نے سید احمد خان کے خیالات اور ان کی قیادت کو تسلیم کر لیا۔ ان میں سے بہت کم کنگرس میں شریک ھوئے۔

سید احمد خان کی وفات (۱۸۹۸ء) کے بعد جلد ھی انھوں نے اپنا علیحدہ سیاسی ادارہ قائم کرنے کی کوشش شروع کر دی اور بالآخر

۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ وجود میں آ گئی۔ مجھے تاریخ کی تفصیلات بیان کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن اس اہم پہلو کا ذکر کیا جا سکتا ہے کہ قائد اعظم کی، جو کنگرس اور لیگ دونوں میں شامل ہو گئے تھے، اور دیگر لیڈروں کی کوشش سے ۱۹۱۶ء میں لکھنٔو پیکٹ کے ذریعہ سے آزادی کی جنگ کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد ہو گیا۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کا حق جداگانہ انتخاب تسلیم کر کے گویا ان کو علیحدہ قوم مان لیا۔ اس اتحاد کی عمر مختصر ثابت ہوئی اور لکھنو پیکٹ کے چھ سات سال بعد ہی اختلافات اور فسادات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اسی زمانے میں دو قومی نظریہ کا تصور پھیلنے لگا اور اس کے ساتھ ہی برصغیر کو ہندو اور مسلم ریاستوں میں تقسیم کیے جانے کا خیال بعض لوگوں نے پیش کرنا شروع کر دیا۔ علامہ اقبال جیسے اعلا مفکر نے ۱۹۳۰ء میں اپنے مسلم لیگ کے صدارتی خطبے میں اس کو دلائل کے ساتھ پیش کیا۔ قائد اعظم کی سربراہی میں مسلم لیگ کی تنظیم نو ہوئی اور جلد ہی لیگ نے بھی تقسیم ہند کا مطالبہ، قرارداد لاہور کے ذریعہ سے ۱۹۴۰ء میں پیش کیا۔ کنگرس اور ہندوؤں کی دوسری تنظیموں نے مخالفت شروع کر دی۔ انگریز بھی شروع ہی سے اس مطالبے کی مخالفت کر رہے تھے۔ کرپس مشن اور بعد میں کیبنٹ مشن کی کوششوں اور اقدامات کے مطالعے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ برطانوی حکومت کی ہمدردیاں، کنگرس اور اس کے مفادات سے تھیں، لیکن مسلمانان برصغیر نے، جن میں اقلیتی صوبوں کے مسلمان پیش پیش تھے، یہ مطالبہ منوانے کے لیے مسلم لیگ کے ذریعہ سے قائد اعظم کی سربراہی میں وسیع پیمانہ پر تحریک چلائی جس کا ذکر تاریخ کے صفحات میں تحریک پاکستان کے عنوان سے کیا جاتا ہے۔ انھوں نے اس کے لیے جان و مال کی بازی لگا دی۔ شروع میں تو انگریز کو مسلم قوم کی یکجہتی اور مسلم لیگ کی قوت کا صحیح اندازہ نہیں تھا۔ دو قومی نظریہ جو اس مطالبے کی بنیاد تھا، اس کے حلق سے نہیں اترتا تھا، کیونکہ اس کی بنیاد دینی اخوت پر تھی جو مغرب کے تصور قومیت میں کسی صورت سے شامل نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ برطانوی حکومت مطالبۂ پاکستان کی برابر آخری وقت تک مخالفت کرتی رہی۔ اس کا ثبوت ہمیں انگریز مصنفوں کی جدید تصانیف اور مراسلت میں مل جاتا ہے۔ اس شواہدی

مواد کا بڑا حصہ شائع ہو چکا ہے اور تاریخ کا طالب علم اس کا مطالعہ کر سکتا ہے۔ لارڈ کلایو سے ماؤنٹ بیٹن تک کم و بیش ہر گورنر جنرل نے مسلمانوں کے مفادات نظر انداز کرنے اور ان کے سیاسی تشخص کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن آخرالذکر نے ان کے مطالبات کی مخالفت اور اس سلسلے میں جو اقدامات کیے وہ اس دور میں سیاہ ابواب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پنجاب اور بنگال کی تقسیم، کشمیر اور حیدرآباد کے مسائل سے متعلق اس کا رویہ، کانگریس لیڈروں سے ہم آہنگی، پنڈت نہرو سے ذاتی تعلقات اور ان سے متاثر ہو جانا اور قائد اعظم کے لیے نامناسب الفاظ استعمال کرنا اور مینن سے تقسیم ہند کا پلان تیار کرانا، ماؤنٹ بیٹن کی حکومت کے وہ اقدامات ہیں جو ناانصافی اور جانب داری کی شکل میں تاریخ کے صفحات پر سیاہ دھبوں کی طرح ہمیشہ قائم رہیں گے۔

میں نے اپنی یومیہ یادداشت میں یہ خیالات اس لیے شریک کیے ہیں کہ جب "کوریا کہانی" معرض تحریر میں آئے گی تو میں پاکستان کے قیام و بقا سے بار بار بحث کروں گا اور جب میں پاکستان کے حالات کا درد و الم کے ساتھ ذکر کروں گا تو قارئین کو سمجھنے میں آسانی ہوگی کہ پاکستان کس قدر عظیم تحریک اور جدوجہد اور ایثار و قربانی کے نتیجے میں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا اور ہم نے پاکستانی کی حیثیت سے اپنے اس پیارے وطن کو مبتلائے الم کرنے میں کس سنگ دلی کا مظاہرہ کیا ہے۔

۱۵ - اپریل ۱۹۸۲ء - جمعرات

شہر پیونگ یانگ سے دُور ایک تاریخی دیہات کی بلندیوں پر تعمیر کردہ سرکاری مہمان خانوں میں سے ایک میں میرا قیام ہے۔ ہر مکان کہیں گہری وادیوں کو جھانک رہا ہے اور کہیں ان کا عکس اس جھیل میں اتر رہا ہے کہ جو حسن کے اعتبار سے قابلِ دید ہے۔ تمام مہمان اس بستیٔ نو میں ٹھہرائے گئے ہیں۔ میں نے آج صبح صبح قبل طلوع آفتاب عالم تاب گھر سے باہر نکل کر ماحول کا جائزہ لیا۔ موسم خوب سرد ہے۔ ہر چند کہ کمرا گرم ہے اور بجلی سے اس کا فرش و ماحول گرم ہے بایں ہمہ رات مجھے کمبل اوڑھنا پڑا۔ صبح جب باہر نکلا تو برفانی ہواؤں نے گھیر لیا۔ مگر میری گرمیٔ فکر نے اس پر جلد قابو پا لیا۔ بالکل پہاڑ کا مزہ ہے۔

فاصلوں پر جگہ جگہ گھر بنے ہیں ، ماحول میں سبزے کی بہتات ہے اور پھولوں کی کثرت - کہر کے پردوں میں سے وادیوں میں بہ مشکل جھانکا جا سکتا ہے - دور جھیل کا پانی نظر آ رہا ہے - دل چاہا کہ میلوں پیدل نکل جاؤں - پھر بھی میل بھر میں چل لیا - معلوم نہیں کہ میری اس حرکت کا کون نوٹس لے رہا ہے یا میں آزاد ہوں - نسیم سحری سے اپنے پھیپڑوں کو تازہ اور روانئ خون کو کثافتوں سے صاف کیا اور پھر آ کر میز پر بیٹھ گیا - میزبانی کے حسن و انداز کی تعریف نہ کرنا کیسے ممکن ہو سکتا ہے - شمالی کوریا کی حکومت نے میزبانی کو بھی حسن و فن بنا دیا ہے - کل کے تمام دن کا جائزہ لیا اور جو پیش رفت کل ہوئی ہے اس کا جائزہ لے کر تاثرات لکھ لیے ہیں - میں سوچتا رہا کہ فکر کے بعد اگر عمل نہ ہو تو تعمیر کی جانب کوئی قدم اٹھ ہی نہیں سکتا - اس وقت اس دنیا میں لوگ اپنے اپنے انداز پر رہ رہے ہیں - اور ان کی راہیں مختلف ہیں :

کچھ اقوام ایسی ہیں کہ ان کو نہ دولتِ فکر نصیب ہے اور نہ دولتِ عمل - یہ اقوام اس دنیا میں شاید اس لیے ہیں کہ فکر و عمل سے آراستہ اقوام ان کو اپنا آلۂ کار بنائیں اور ان کی طاقت پر اپنی تعمیر کا سامان کریں - اس صفحۂ ارض پر آج بھی ایسی اقوام کی کمی نہیں ہے - پھر بعض اقوام و ملل آج فقط فکر کی گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی ہیں - ان کے ہاں فکرِ بلند بھی ہے اور فکرِ عمیق بھی - فصاحت و بلاغت کے دریا بھی اور شعر و ادب کے بحرِ ناپیدا کنار بھی - یہ اقوام عالم عمل کی دنیا سے ہنوز دور ہیں - ہر چند کہ فتح و نصرت کی اور عظمت و رفعت کی تڑپ ان میں ہے مگر ان کے فکر کی توانائیاں اور ان کے مظاہر مجلسیں آراستہ کرنے اور محفلیں سجانے سے آگے نہیں بڑھی ہیں - وہ سمجھتے ہیں کہ ان مجالس و محافل سے منزلِ مقصود تک پہنچا جا سکتا ہے - مگر تاریخ نے بتایا ہے کہ فکر سے آراستہ مگر عمل سے محروم اقوام کو سربلندیاں اور سرفرازیاں کبھی حاصل نہیں ہوئی ہیں - آج کی دنیا میں ایسے حالات کی گرفت میں دنیائے اسلام ہے جس میں پاکستان اہمیت کے ساتھ شریک ہے -

اور پھر ایسی اقوام و ملل بھی اس کرۂ ارض پر وجود رکھتی ہیں کہ انہوں نے فکر و نظر کی تمام توانائیوں کے ساتھ عمل کو اصول زندگی بنایا اور فکر و عمل کو ساتھ لے کر پیش قدمیاں کیں۔ یہ وہ اقوام و ملل ہیں کہ جو آج جہاں بانی کی شان رکھتی ہیں اور بے فکر اور بے عمل دنیا پر ان کو غلبہ حاصل ہے۔

میں بلا خوف تردید شمالی کوریا کو ان اقوام و ملل میں شریک کر سکتا ہوں کہ جو فکر و عمل کی طاقتوں سے سوشار ہیں۔ یہی وہ کوریا ہے کہ جس کا بال بال غلام تھا ، اور آج یہی کوریا ہے کہ فکر و عمل کی طاقت سے وہ دنیا کی بڑی امریکی طاقت سے برسر جنگ ہے ، اور امریکی شکست جس کی منزل مقصود ہے۔ امریکی طاقت نے ہنوز کوریائے جنوبی کو اپنے زیر نگیں بنا رکھا ہے مگر میں یہ پیشن گوئی کر سکتا ہوں کہ کل دونوں کوریاؤں کا ملنا یقینی ہے اور امریکا کو یہاں لازماً شکست ہوگی ۔ مگر ایسے حالات کے لیے چین کا طرز عمل بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ صدر کم ال سنگ کو ، جہاں تک میں نے اندازہ لگایا ہے ، چینی حکمت عملی سے اتفاق رائے نہیں ہے۔ چین کا امریکا کے ساتھ تال میل کم ال سنگ صاحب کی نگاہ میں پسندیدہ نہیں ہے۔ چین کو اپنے قریبی دشمن سے نبرد آزما ہونا ہے اور روس کے عزائم کو پامال کرنا ہے۔ اس نے امریکا کو روس کے اُس پار اپنا حلیف بنانا طے کیا ہے۔ اس وقت روس، امریکا اور چین کے درمیان ہے۔ اس پالیسی نے امریکا کو جنوبی کوریا میں قدم جمائے رکھنے کے مواقع فراوانی کے ساتھ فراہم کر دیے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت حال شمالی کوریا کے حق میں نہیں ہے۔ اس سے جنوبی کوریا کی آزادی معرض خطر میں پڑی رہے گی اور شمالی اور جنوبی کوریا کے ملنے میں بڑی تاخیر ہوگی۔ میرا تاثر یہ ہے کہ صدر کم ال سنگ کو اسی صورت حال نے روس کی طرف دیکھنے کا موقع دیا ہے۔ حال آں کہ روس کوریا کا دوست نہیں ہو سکتا۔ شمالی کوریا میں چین سے کھنچاؤ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ جشن ولادت کم ال سنگ میں چین کا وفد موجود نہیں ہے ، اور اخبارات نے صدر چین کے پیغام تبریک کو غیر نمایاں جگہ دی ہے جبکہ صدر روس کے پیغام کو اخبارات میں نمایاں جگہ ملی ہے اور روس کی جانب

سے آمدہ تحائف کے لیے خصوصی تقریب پیونگ یانگ میں انعقاد پذیر ہوئی ہے اور اسے اخبارات نے پوری اہمیت کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اس تقریب میں پاکستان کو قرار واقعی مقام حاصل نہیں ہوا ہے جبکہ انڈیا کو یہاں پوری اہمیت حاصل رہی ہے۔روس نے وفد کی صورت میں شرکت نہیں کی ہے ، مگر اس سے اس کے انداز فکر کی تکذیب و نفی نہیں ہوتی ہے -میں نے اخبارات دیکھے ہیں - ہندستان کے صدر ریڈی کے پیغام تبریک کو اہمیت دی گئی ہے جبکہ صدر پاکستان کے پیغام تبریک کو اخبارات نے نظر انداز کیا ہے اور ان کے پیغام رساں کو غیر اہم مقام دیا ہے- صدر پاکستان کے ذاتی نمائندے کو ضرور خصوصی موٹر کار ملی ہے ، دو موٹر سائیکل سوار اور ایک جیپ بھی اُن کی سواری کے ساتھ چلتی ہے ، مگر ان کا مقام چوتھی قطار میں متعین ہوا ہے-اور شاید ٹیلے وژن کیمرے کی آنکھ کو ان کی طرف دیکھنے سے منع کر دیا گیا ہے-

پاکستان چین کا حلیف ہے اور بہ ظاہر امریکا پاکستان کا دوست ہے-اس اتحادِ ثلاثہ کو اسی وقت اہمیت حاصل ہو سکتی ہے کہ جب اس میں ہندستان بھی شریک ہو جائے - میرا اس پر اسرار رہا ہے کہ چین اور ہندستان کے مابین استواریٔ تعلقات میں پاکستان کو مثبت پیش رفت کرنی چاہیے اور اس راہ پر بڑی سرعت کے ساتھ چلنا چاہیے -ہندستان آگاہ ہے کہ روس سے اس کی دوستی بالآخر نقصانات پر منتج ہوگی-ہندستان کی زنانہ قیادت پاکستان کو زک پہنچا کر ہی اپنے وجود کو برقرار رکھ سکتی ہے، چناں چہ اس نے مشرقی پاکستان کو ہزار خطرات مول لے کر مغربی پاکستان سے جدا کر دیا اور اس کے لیے روس کی حمایت حاصل کرنے کی خطرناک غلطی کی ہے-روس جس طرح پاکستان کی تقسیم کا حامی رہا ہے اور آج بھی ہے اسی طرح وہ اپنے بہترین مقاصد کے لیے ہندستان کے اتحاد کو بھی پارہ پارہ کر دینا ضروری سمجھتا ہے اور اس کی یہ ضرورت بے نقاب ہے -پنڈت جواہر لال نہرو کے لیے مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے الگ کرنے کی کوشش کرنا کون سا مشکل کام تھا ، مگر وہ کہا کرتے تھے کہ :

"ـــــبڑی مشکل سے اس علاقے سے نجات ملی ہے- میں یہ آفت

پھر مول لینا نہیں چاہتا، ہمیں اس سے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہو سکتا ہے۔" جواہر لال نہرو کی تائید میں ہندستان کا ہر صاحبِ بصیرت رہا ہے، اور آج بھی ہے۔ تقسیم پاکستان کرا کے مسز گاندھی نے ایک بڑی غلطی کی ہے جس کی سزا ہندستان کو بالآخر ملے گی۔ انہوں نے دیکھ لیا کہ بنگلہ دیش ان کے قابو میں نہیں رہا۔ وہ رہ بھی نہیں سکتا تھا۔ خود بنگلہ دیش کا مقام کیا ہے اس کے بارے میں حالات کا فیصلہ یہی ہے کہ اسے چین کی حفاظت میں ہی رہنا ہوگا۔ میں حالات کو جن زاویوں سے دیکھ رہا ہوں ان کا بدیہی تقاضا یہ ہے کہ پاکستان کو خود بھی ہندستان سے تعلقات کو درست کرنا چاہیے اور اپنے تمام تر اثرات کو کام میں لا کر چین و ہند کے مابین اتحاد قائم کرا دینے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہی وہ اتحاد ہے کہ جو پاکستان اور ہندستان کی آزادی کی ضمانت بن سکتا ہے اور اس میں چین کی شمولیت ایشیا کی عظمت کی ضمانت بن سکتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو ان علاقوں میں روس کے اثرات لازماً آئیں گے۔ صاحبانِ سیاستِ عالم جان سکتے ہیں کہ سنٹرل ایشیا کی پانچ مسلم ریاستوں کو زیر نگیں رکھنے کے لیے ایران و افغانستان کو زیر نگیں لانا روس کی حکمت عملی ہے۔ اور پاکستان کو اپنے زیر اثر رکھنا اس کی ضرورت ہے۔ وہ افغانستان میں پیش قدمی کر چکا ہے اور ایران میں امریکا کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے حالاتِ حاضرہ نے روس کو دخل دینے کے پورے مواقع فراہم کر دیے ہیں۔ ایران کا مثبت انقلابِ اسلامی روس کی تحویل میں چلے جانے کے خطرات سے دوچار ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کا قرار واقعی نوٹس لیا جائے۔ نظر یہ آ رہا ہے کہ اب ایرانی بلوچستان اور پاکستانی بلوچستان کا مسئلہ کھڑا ہوا ہی چاہتا ہے۔ پاکستان میں روس کی اس جارحیت کو روکنے کی کوئی صلاحیت موجود نہیں ہے۔ وزارتِ خارجۂ پاکستان میں جس قد و مزاج کے لوگ کام کر رہے ہیں میں ان کی پرواز فکر سے واقف ہوں۔ جو سفارت و قیادت جناب شاہ ظاہر شاہ کے ملک سے نکالے جانے کا قرار واقعی نوٹس نہ لے سکے اور جو سیاست قتل داؤد خان کے واقعہ سے استخراج نتائج نہ کر سکے اس

کے مجہول الفکر اور مغلوج العمل ہونے میں کیا کوئی شبہ کیا جا سکتا ہے ؟ شاہ ظاہر شاہ کے زوال سے اب تک جو حالات سامنے آئے ہیں وہ سمرقند و بخارا کے واقعات ماضی کا صریحی عکس ہیں جن کو سمجھنے کے لیے تاریخ کا از بر ہونا ضروری تھا ۔ پاکستان کی وزارتِ خارجہ کے بقراط اور ان کی اپنی پسند کے بنائے ہوئے سفرائے پاکستان اپنے مطالعہ اور اپنے فکر سے ماورا رہ کر قیاسات پر نہیں قصہ کہانیوں پر اپنی جو رپورٹیں مرتب کرتے ہیں ، ان پر بنائی ہوئی بعض پالیسیاں اس درجہ بے حقیقت اور بے وقعت ہیں کہ ان پر عمل کرنے سے ہم کسی منزل پر نہیں پہنچ سکتے ۔

اس باب میں شاہ ایران کا انداز فکر پوری قطعیت کے ساتھ منزل و راہ کی فہم کا عکاس تھا ۔ شاہ ایران کا اصرار تھا کہ آر ۔ سی ۔ ڈی میں ہندستان کو شریک کر لیا جائے مگر کہا گیا ہے کہ پاکستان نے اس سے اتفاق رائے نہیں کیا ۔ شاہ ایران از تاجکستان تا کابل سڑک کی تعمیر کو دیکھ رہے تھے اور ہمارا حال یہ ہے کہ کابل تا کوئٹہ سڑک کی تعمیر کو ہماری سیاسی بصارت و بصیرت سمجھ لینے سے قطعاً عاری نظر آ رہی ہے ۔

پاکستان، کی خارجہ حکمتِ عملی کو شاید اس کا بھی کوئی ہوش نہیں رہا ہے کہ ایک وقت تھا کہ روس کے زیر نگیں پانچوں مسلم ریاستوں میں آزادی کی تڑپ پیدا ہوئی تھی ۔ اگر اس کا نوٹس لے لیا جاتا اور مطالعہ کی قوت اور فہم و فراست کا اہتمام کر لیا جاتا تو اس وقت ایران افغانستان اور پاکستان کے مابین اتحاد ہر قیمت پر کر لینا چاہیے تھا ۔ ایسا اتحاد روس کے زیر نگیں پانچوں مسلم ریاستوں میں آزادی کی راہوں کو ہموار کر سکتا تھا اور آٹھ ریاستیں سنٹرل ایشیا میں ایک نئی مسلم طاقت کی نمود بن سکتی تھیں ۔ مگر ہم نے ایسا نہیں کیا اور شاہ ایران کی بے چینیوں کو بہر طور نظر انداز کیا اور ہندستان کو آر سی ڈی میں شریک نہیں ہونے دیا کہ جو شاہ ایران کی وجہ سے ممکن تھا ، اس لیے کہ وہ ہندستان میں ایران کے سرمائے کو تحفظ دے رہے تھے اور ہندستان کی صنعت کو اس سے طاقت مل رہی تھی ،

افسوس یہ بھی ہے کہ میری اس رائے کا نوٹس نہیں لیا گیا اور ہندستان سے استواریٔ تعلقات کے اقدامات اس وقت ہوئے کہ جب تاخیر ہو چکی تھی اور حالات بدل چکے تھے۔ اور پھر اس میدان میں پیش رفت کا انداز ایک بار بھی مثبت نہ رہا اور ہندستان جو وفد گیا اس نے دولت و ثروت کے مظاہرے کے ساتھ اپنی برتری کا گن بھی گایا اور فکر و بیان میں وہ سیاسی غلطیاں کیں کہ خیرسگالی کا یہ وفد اپنے ساتھ ہندستان کی بدگمانیاں کما کر لے آیا۔ اور بالآخر اب وہ وقت آ چکا ہے کہ پاکستان کو ہندستان اپنا خورد بنانے کے لیے بھی تیار نہیں ہے اور روس ہم کو تر نوالہ بنانے کے لیے تیار بیٹھا ہے۔ اب ہم جاگے ہیں اور سوچ رہے ہیں کہ خیر سگالی کا وفد ہم پاکستان سے روس بھجوائیں ۔یہ ہے پاکستان کی خارجہ حکمت عملی کا معیار کہ روس جب افغانستان کو تہہ و بالا کر چکا تھا تو پاکستان کی وزارت خارجہ کے بقراط روس سے قطع تعلق کا فیصلہ کر رہے تھے اور سمجھانے کے باوجود اس کو سمجھنا نہیں چاہتے تھے کہ ہم اپنی اخلاقی پامالیوں اور اپنی پاکستان نادوستی اور ہوس مال و زر کی وجہ سے بزدل ہو چکے ہیں اور ایسے شدید حالات میں روس کا مقاطعہ کرنے کی پالیسی اختیار کرنا ہماری طاقت سے باہر ہے ۔ میرا اصرار تھا ، تحریری بھی اور زبانی بھی ، کہ ہمیں روس سے بگاڑنے کی پالیسی اختیار کر کے صریحاً نقصانات ہوں گے ۔مگر پاکستان کی اس خارجہ حکمت عملی نے اہل علم کے لیے روس کی ہر دعوت کو رد کیا اور چن چن کر روابط کا ہر ذریعہ قطع کر دیا ۔ظاہر ہے کہ یہ پالیسی قطعی نامعقول تھی اور اس کے خراب اثرات نکل کر رہے ۔ اور اب بعد از خرابی بسیار اس وزارت خارجہ کو روس خیر سگالی کا وفد بھجوانے کا خیال آیا ہے اور صدر مملکت پاکستان کو خیر سگالی کے لیے توضیحات پیش کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے ۔وزارتِ خارجہ کے ایسے تمام بقراطوں کے بارے میں میری رائے ہے کہ ان سب کا احتساب ہونا چاہیے ۔

افتتاح مینارۂ فکر جُوچے

گزشتہ ایک سال کے قلیل عرصے میں شمالی کوریا کے عوام نے اور اُس کی افواج نے جو تعمیرات کی ہیں ان میں " مینارۂ فکر جُوچے" بھی ہے جو بلا شبہ ایک عظیم منصوبے کی حیثیت رکھتا ہے۔ دریائے تیودانگ کے کنارے یہ ۱۷۰ میٹر بلند مینار شمالی کوریا پر سایہ فگن ہے اور اس کی چوٹی پر علم و عمل کی سرخ روشنی ان کی جدوجہد کے ہر پہلو کو روشن کرتی ہے۔

شمالی کوریا کی آزادی اور تعمیر نو فکر جُوچے کی رہین منّت ہے۔ یہ وہ نعرۂ خودی ہے کہ جسے صدر کم ال سنگ نے رہنما بنایا ہے اور شمالی کوریا کے ہر فرد کو فکرِ خودی (جُوچے) سے آراستہ کر دیا ہے۔ خود اعتمادی اور خود کفالتی تحریک جوچے کا درس ہے اور ہر میدان میں شمالی کوریا میں اس درس سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ میں نے اس تحریک کے خدوخال کو احتیاط سے سمجھا ہے اور میں آگے شرح و بسط کے ساتھ اس کا حال لکھوں گا۔ یہ وہ انداز فکر ہے کہ جو میری فکر سے ہم آہنگ ہے۔ میں پاکستان میں خودی، خود اعتمادی اور خود کفالتی کی آواز بلند کرتا رہا ہوں۔ اقبالؒ نے نظریۂ خودی کی عظمتوں سے فرد ملّت کو آگاہ کر دیا ہے مگر اس ملّت نے اس کو شعر و ادب سمجھ کر قرآن کی طرح جزدان میں بند کر دیا ہے اور خودی کو ایک دن جامۂ عمل نہ پہنایا۔ میں نے جاگو جگاؤ کا درس ملّت پاکستانیہ کو اس انداز سے دیا ہے:-

جاگو.....

- جہل اور ناخواندگی کا عفریت ہمارے فکر و عمل پر حملہ آور ہے، طاقتِ علم اور عملِ صالح سے اس عفریت کو شکست دے دو!
- افراد کی صحّت، اور پُوری ملّتِ پاکستانیہ کی صحت خطرات سے دوچار ہے۔ پوری قوم عدمِ صحت اور آلام کی گرفت میں ہے۔ دانشِ قدیم اور روشنیٔ جدید پر مشتمل ایک متوازن منصوبۂ صحت

تیار کرو کہ جو خود کفالتی اور خود داری کا آئینہ دار ہو۔

- اقتضائے ملّی سے متصادم اور متضاد اور حُریّتِ فکر سے عاری اور بہکے ہوئے نظامِ تعلیم و تربیت کو بدل ڈالو کہ اس کے بغیر نہ قوم کا جہل دُور ہوگا اور نہ کاملاً نفاذِ شریعتِ اسلامی ممکن ہو سکتا ہے۔ اپنی تمام توانائیوں اور صلاحیتوں کو مجتمع کر کے تعلیم و تعلّم میں انقلاب لانے کے لیے مستعد ہوجاؤ اور سینہ سپر !
- غیر ملکی امدادوں اور قرضوں نے ہماری غیرت اور حمیّتِ ملّی کو تباہ کر دیا ہے اور ہماری حُریّتِ فکری و سیاسی کو کچل کر رکھ دیا ہے۔ خودی کی پوری شان کے ساتھ اور خود کفالتی اور قناعت کے ہتھیاروں سے اپنے کاسۂ گدائی کو توڑ ڈالو۔
- ہم آج زوالِ اخلاق کا شکار ہیں۔ ہماری شخصی اور ملّی بد اخلاقیوں نے ہماری عزت کو خاک میں ملا دیا ہے۔ اپنی اس پستی کا احساس کرو اور خوب سمجھ لو کہ حسنِ اخلاق، حسنِ عمل اور حسنِ سلوک کے بغیر تم نہ سر بلند ہو سکتے ہو اور نہ سرفراز۔

جگاؤ.....

- اپنے ضمیر کو جو تمہارا سب سے دیانت دار محاسب ہے۔
- اپنی خودی کو کہ جو تمہاری عظمت و رفعت کی مظہر و امین ہے۔
- اپنے جسم کی سوئی ہوئی طاقتوں کو کہ وہ تمہاری سب سے بڑی محافظ ہیں۔
- اُن اربابِ فہم و اختیار کو کہ جو تم کو مثبت نظامِ تعلیم دینے کے ذمے دار ہیں۔
- اُن اربابِ قلم کو کہ جن کا قلم امت کی قسمت بدل دینے کی طاقت اور شان رکھتا ہے۔
- اُن اصحابِ فکر و نظر کو کہ جن کی صحتِ فکر و نظر قوم کی عظمتوں کا سامان کر سکتی ہے اور نظریاتِ غیر کا موثر رد کر سکتی ہے۔
- اُن اہلِ وطن کو کہ جو تعمیرِ ملّت سے غافل ہیں اور فکرِ غیر کو اپنا کر اپنی خودی کا سودا کر رہے ہیں۔ یاد رکھو کہ خودی

انمول ہے۔ خودی کے بغیر انسان انسان نہیں رہ سکتا۔
اُن صاحبانِ تعلیم و تعلم اور متعلّمین کو کہ جن کی صحتِ فکر و عمل کے بغیر ملّتِ اسلامیہ جہل کی گرفت سے آزاد نہیں ہو سکتی، اور یہ فراموش نہ کرو کہ علم و حکمت کے بغیر ملّت کی سر بلندی و سرفرازی کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا۔

اب کہ میں شمالی کوریا آیا تو جُوچے فکر کو اس کے ہم معنٰی پایا اور اس تحریک کا گہرائی کے ساتھ اس انداز سے مطالعہ کیا کہ خودی کو عملی زندگی میں کس طرح رچایا بسایا گیا ہے۔

سعدیہ اور میں اپنے رہنما اور مترجم کی معیت میں جب اپنے وِلا سے نکلے تو ۹ بجے کا عمل تھا۔ ذرا تاخیر ہوئی تھی جس کی وجہ سے ڈرائیور نے رفتار تیز کر دی تھی، اس تیزی میں اچانک دائیں سڑک سے ایک موٹر کار اور حفاظتی جیپ اچانک سڑک پر آئی اور ہمارے ڈرائیور کو حادثے سے بچانے کے لیے اپنی موٹر کو بائیں جانب کھیت تک لے جانا پڑا۔ یہ سواری پاکستان کے صدر کے خصوصی نمائندے کی تھی جس پر دائیں جانب پاکستانی علم لہرا رہا تھا اور بائیں طرف شمالی کوریا کا جھنڈا دعوتِ فکر دے رہا تھا۔ اگر ہمارا ڈرائیور محتاط نہ ہوتا تو دو پاکستانی ہی آپس میں لڑ جاتے اور پاکستان میں انتشارِ فکر کا عملی مُظاہرہ سر زمینِ کوریا پر بھی ہو جاتا۔ بال بال بچ گئے اور غیر ملک میں ہم بدنام نہ ہوئے۔

صدرِ پاکستان کے خصوصی مندوب تاخیر سے پہنچے ہیں، اس لیے ان کو خصوصی مقام پر جانے سے روک دیا گیا اور وہ آج ہم جیسے عوام میں شریک ہیں اور اس تقریب کو نہ جانے کس دل و دماغ سے دیکھ رہے ہیں۔ میں نے ان سے ملاقات کو ضروری نہیں سمجھا۔ ان کے ساتھ وزارتِ خارجۂ پاکستان سے دو بقراط آئے ہیں جن سے مجھے شدت کے ساتھ فرار ہے۔ سفارت پاکستان کے قائم مقام سفیر جناب نور اللہ صاحب میرے پاس آ گئے۔ انہوں نے حال دریافت کیا۔ میں نے جواب دیا کہ "ـــــ بدحال ہوں۔ کل سے اس ملک کے اور اپنے احوالِ وطن پر غور کر رہا ہوں۔ شمالی کوریا کی

جد وجہدِ آزادی اور جد وجہدِ تعمیر کو دیکھ رہا ہوں اور غور کرتا ہوں ہم تعمیر کا کیا سامان کر رہے ہیں ۔ سخت ذہنی الجھن میں ہوں —"

نُور اللہ ایک آہِ سرد بھر کر رہ گئے ۔

صدرِ اسلامی جمہوریۂ پاکستان کے نمائندہ خصوصی اور ان کے ساتھ بقراط تماشا دیکھنے میں مصروف ہو گئے ! تماشا میں بھی دیکھ رہا تھا !

میں یہ دیکھ رہا تھا کہ دریائے تیودانگ کے دو پُلوں کے مابین ایک کلو میٹر سے زیادہ کا فصل ہے ۔ اس فصل کو دونوں جانب شمالی کوریا کے لوگوں نے کھڑے ہو کر پاٹ دیا ہے ۔ ان کے دونوں ہاتھوں میں پلاسٹک کی گلابی جھنڈیاں ہیں ۔ ایسا لگتا ہے کہ دونوں جانب گھنے گلابی درخت اُگے ہوئے ہیں اور یہ درخت اس وقت جھوم جھوم جاتے ہیں کہ جب شمالی کوریا کے نائب صدر جناب کم ال آند ہی اور طوفان بن کر ان سے خطاب کرتے ہیں ۔ کم ال کوریا کی ورکرز پارٹی کی جنرل کمیٹی کے پولٹ بیورو کے رکن ہیں ۔ ان کا خطاب خالی از دل چسپی نہیں ہے ۔

جوچے مینار کی نقاب کشائی کے موقع پر جناب کم ال ، ممبر ، پریسیڈیم ، پالٹ بیورو مرکزی کمیٹی ، مزدور پارٹی ، کوریا و نائب صدر عوامی جمہوریۂ کوریا کی بڑی طویل تقریر کے چند نکات :

"یہ ہمارے لیے بڑی خوشی و کامرانی کی بات ہے کہ ہم آج ، محترم عظیم رہنما ، کامریڈ کم ال سنگ کی سترّویں سالگرہ کی تقریب کے موقع پر نظریۂ جوچے کے یادگاری مینار کی نقاب کشائی کر رہے ہیں ۔

"میں پارٹی کے ان تمام اراکین ، کارکنوں ، شاک بریگیڈ کے جوانوں کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا اور ان کو مبارکباد دیتا ہوں جنھوں نے اس مینار کی تعمیر میں امتیازی خدمات انجام دی ہیں ، یہ مینار پیونگ یانگ سمیت سارے ملک کے باشندوں کے لیے ایک ایسی یادگار عمارت ہے جس کی قدر و قیمت دائمی ہے ، ہمیشہ ہمیشہ

اسے قدر و احترام کی نظروں سے دیکھا جایا کرے گا ۔۔ پیونگ یانگ کے شہریوں نے تو اپنے ہاتھوں سے اس کی تعمیر کی ہے، ان کا اشتراک خلوص و عمل دونوں کا مظہر ہے ۔

"یہ عمارت اس بات کی مظہر ہے کہ تمام اہالیان کوریا، ہماری ساری قوم ،ہمارے محترم عظیم قائد کم ال سنگ کے تمام عملی کارناموں اور ان کے نظریاتی رہنما اصولوں کو دوام بخشنے کا عزم مصمم کیے ہوئے ہے ۔ ان تمام عملی کارناموں اور نظریاتی اصولوں کو ساری قوم بڑا انقلابی سرمایہ سمجھتی ہے اور تہیّہ کیے ہوئے ہے کہ جوچے کے انقلاب انگیز نظریے کی اعلا ترین کامیابی تک کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھے گی ۔

"جاپانی سامراج و استحصال کے خلاف جب اس عظیم قائد ، کم ال سنگ نے علمِ آزادی و حریت بلند کیا ، جو بجائے خود ایک بڑی شاندار و انقلاب انگیز تحریک تھی،تو ہر ہر قدم پر جوچے نظریہ سے ہدایت و رہنمائی لی جاتی رہی ، اور اسی نظریے پر عمل درآمد کر کے ہماری قوم نے اپنے مخصوص انداز میں اپنی وہ تمام مشکلات اور وہ تمام مسائل حل کر لیے جو اس ملک کی حد تک محدود و مختص تھے ۔

" آزادی کے بعد اِسی جوچے نظریہ کے تحت ایک انقلابی پارٹی وجود میں لائی گئی اور حکومت وقت نے بھی اسی نظریے کو اپنا کر اُس نئے معاشرے کی داغ بیل ڈالی جس پر آج ہم نازاں ہیں ۔ یہ سارا عرصہ ایسا گزرا ہے کہ اس کے دوران بڑے عجیب عجیب اور اہم واقعات پیش آتے رہے ہیں ، بڑی بڑی سماجی تبدیلیاں ہوئی ہیں،بہت سے تعمیری کام ہوئے ہیں اور جوچے تحریک کے نتیجے میں جو بہت سے اور بہت بڑے بڑے کام ہم کو سر انجام دینا تھے ان کی تکمیل کی صورتیں نکلتی رہی ہیں ۔

" سچ بات تو یہ ہے کہ ہماری یہ بڑی خوش قسمتی ، بہت بڑا اعزاز اور حد درجہ باعثِ مسرّت امر ہے کہ ہم کو ایک عظیم قائد کم ال سنگ کی ذات میں نصیب ہوا جو غیر معمولی ذہانت کا مالک بھی ہے اور قیادت کی بھی بڑی صلاحیت رکھتا ہے ۔ اسی لیے اس

نے ایسے انقلابی کارنامے انجام دیے ہیں جو کبھی نہ مٹنے والے کارنامے ہیں یا حد درجہ معقول اور قابل صد تعریف و توصیف بھی ہیں اور ان کی مثال پر عمل پیرا ہو کر ، اس عظیم قائد کی بتائی ہوئی انقلابی ذہنیت سے کام لے کر اس راستے پر بڑی تیزی سے چلا جا سکتا ہے جو جوچے نظریہ کا راستہ ہے۔

" آج کی اس پُر افادیت تقریب میں جو نظریۂ جوچے کے یادگاری مینار کی نقاب کشائی کے لیے ہو رہی ہے ، اپنے عظیم قائد ،کامریڈ کم ال سنگ کے لیے ساری قوم کے جذباتِ احترام و وفاداری کی بھرپور نمائندگی کرتے ہوئے ، اس عظیم قائد کی خدمت میں ،جو قوم کا بھی عظیم قائد ہے اور پارٹی کا بھی، ہدیۂ تبریک و تشکر پیش کرتا ہوں ۔

" یہ ۱۷۰ میٹر بلند جوچے مینار ، جو آپ دیکھ رہے ہیں، دریائے تیودانگ پر چُونے اور سفید پتھر سے بنی ہوئی عمارت ہے ۔عمارت کی حیثیت سے اپنی ظاہری شکل و صورت اور جسامت کے لحاظ سے کہا جاتا ہے کہ یہ غیر معمولی عظمت کا حامل ہے اور اس کی قدرو قیمت سدا ایسی ہی بلند رہے گی ، نیز عظیم کارناموں کے مظہر کی حیثیت سے بھی یہ مینار ناقابل فراموش بنا رہے گا ۔

" اس مینار کی بلند ترین چوٹی پر جو لمبی سی مشعل ،یعنی مخزنِ نور نظر آ رہا ہے وہ ایک علامت ہے اس روشنی کی جو نظریۂ جوچے نے چاروں طرف پھیلا رکھی ہے ۔اس مینار پر یہ جو تین انسانی اجسام ایک دوسرے سے پیوست نظر آ رہے ہیں یہ بھی ایک اشارہ ہے اس طرف کہ ساری قوم جوچے کا پرچم اٹھائے شاہراہِ ترقی کی طرف گامزن ہے ۔اسی طرح کی بعض اور تمثیلیں بھی نقش ونگار کے ذریعہ سے نمایاں کی گئی ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ جوچے کی طاقت و قوت کا مظاہرہ بطرزِ احسن ہو سکے اور جُوچے سے متاثر طرزِ تعمیر کا بھی کچھ نمونہ پیش ہو جائے ۔

" مینار کے سامنے اور پشت پر ، دونوں طرف سنہرے حروف میں Joshe لکھا ہوا ہے ،گویا ساری قوم کا یہی متفقہ و مشترکہ واحد نصب العین ہے ۔ایسے ہی نقش و نگار کے ذریعہ سے یہ بھی

دکھایا گیا ہے کہ عہد بہ عہد واقعات کیسے کیسے پیش آتے رہے اور جوچے کی روشنی میں کیسی کیسی مہمیں سر کی جاتی رہیں اور اب بھی قوم اسی نظریے کی رہبری میں ، اسی پرچم تلے ترقی کناں ہے۔

" ستونوں کی قطار کے ساتھ ساتھ ایک تعریفی گیت کندہ ہے ۔ جس میں عظیم قائد کم ال سنگ کے انقلابی و لافانی کارناموں کو الاپا گیا ہے اور اظہارِ احسان مندی کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ اسی عظیم قائد نے ہمیں یہ روشن راہِ عمل دکھائی اور زندگی وموت کی کشمکش سے نکال کر ساری قوم کو زندہ قوم ، باوقار اور خوددار قوم بنا دیا۔ ستونوں کی اس قطار کے دونوں طرف پتھروں پر ایسے گلدستے بنائے گئے ہیں جن میں میگ نولیا پھول کی شکل بھی نمایاں ہے اور خود " کم ال سنگ " نامی پھول بھی دکھائے گئے ہیں۔ اس سنگین نقش سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ ساری قوم اس مینار کے ذریعہ سے اس عظیم قائد کے لیے انتہائی عزت و احترام اور حد درجہ جذبۂ وفاداری و اطاعت کا نقشِ دوام پیش کر رہی ہے اور اس کی پیروی کا عزم صمیم رکھتی ہے ۔ مینار کے دونوں جانب جو چھوٹے چھوٹے خوشنما شہ نشین بنائے گئے ہیں ، یہ کوریا کی تہذیب و ثقافت ، نیز طرز تعمیر کے جدید زمانے کے طرز عمارت سے امتزاج کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مینار کے سامنے ، دریائے تیسود انگ کے عین وسط میں دو بڑے بڑے فوارے تعمیر کیے گئے ہیں جن کا پانی ۱۵۰ میٹر کی بلندی تک اچھلتا رہتا ہے۔ ان فواروں کی بدولت مینار اور آس پاس ، نیز دریا کے ساحل کی خوبصورتی اور رونق میں بڑا اضافہ ہو گیا ہے ۔

یہ مینار اپنی ساری عظمت و شکوہ کے ساتھ دو سال سے بھی کم مدت میں تیار ہوا ہے جس کے لیے ان تمام مزدوروں ، کارکنوں ، ہاتھ بٹانے والوں اور رضاکاروں کا شکریہ ادا کرنا واجب ہے جنھوں نے دور دراز علاقوں سے آ آ کر ، اپنا بہترین فریضہ سمجھ کر اس کی تعمیر میں کچھ نہ کچھ حصہ ضرور لیا ، اور اس ساری محنت اور تن دہی سے ان کا مقصد یہی تھا کہ اپنے عظیم قائد کے زبردست کارناموں کو نقشِ دوام کی صورت میں پیش کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ جاوید بنا دیں کہ کوریا کی پوری قوم اور آئندہ نسلیں

ان کارناموں کو یاد رکھ سکیں -

" اس مینار کا ہر ہر پتھر ، ہر اینٹ ، ہر نقش اور ساری پھول پتیاں اُس محنت و مشقت اور پُرخلوص جذبۂ خدمت و احسان مندی کی مظہر ہیں جو اس کے بنانے والوں ، مزدوروں ، پارٹی کے کارکنوں کی فوج ظفر موج کے دل میں اپنے عظیم قائد کے لیے موجزن ہے - انھوں نے بلا مبالغہ دن رات کام کیا ہے ، سنگ تراشوں ، مصوّروں نقّاشوں ، سب نے کوشش اسی بات کی کی ہے کہ ملک و قوم کو جس انقلابی دور سے گزرنا پڑا اور اس عظیم قائد ، کامریڈ کم ال سنگ نے جو زریں کارنامے انجام دیے ان کو آئندہ نسلوں کے لیے نقش و نگار میں محفوظ کر دیا جائے اور جوچے نظریہ کا فنِ تعمیر تک میں جو اثر ہوا ہے اسے نمایاں کیا جائے - اس مینار کے لیے بہت سا سامان ، چھوٹا بڑا ، ہلکا اور وزنی سب ہمارے قومی کارکنوں، مزدوروں ، کارخانوں اور فیکٹریوں کے محنت کشوں نے انتہائی توجّہ اور نزاکت کا خیال رکھتے ہوئے تیار کیا - پھر یہ کہ دُور اور نزدیک سے قوم کے افراد ، فوجی سپاہی ، پولیس کے سپاہی ، طالب علم، کاشتکار ، عام تجارت پیشہ افراد ، غرض ہر عمر ، جنس اور پیشے سے تعلق رکھنے والے افراد نے اپنے ہاتھ استعمال کر کے، اپنا ذہن استعمال کر کے ، کسی نہ کسی طرح اس یادگاری مینار کی تیاری میں حصہ لیا ہے -

" جنوبی کوریا کے عوام اور انقلاب پسندوں نے جو قومی یکجہتی اور دونوں حصوں کو پھر سے ملا کر ایک ملک بنانے کی جدوجہد میں مصروف ہیں ، اپنی جان ، مال ، عزت آبرو کو خطرے میں ڈال کر اس مینار کے لیے بڑا قیمتی بلکہ کمیاب سنگ مرمر ہم کو بھیجا - اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے دلوں میں ہمارے اس عظیم قائد کے لیے اور اس کے کارناموں کے لیے کس قدر احترام و محبت و اخوت کے جذبات موجود ہیں - جاپان میں مقیم اہالیان کوریا نے ہزارہا ہزار بیج اور پودے ایسے پھولوں کے ہم کو اس یادگار کے چاروں طرف لگانے کے لیے بھیجے جن سے اس کی خوبصورتی میں اضافہ ہو ، نیز ایک عدد سونے کی بنی ہوئی قینچی بھی بھیجی تاکہ اس سے اس کی نقاب کشائی کے لیے فیتہ کاٹا جائے -

" صرف یہی نہیں بلکہ تقریباً دنیا کے ہر حصے سے سیاسی اور سماجی خدمات میں مصروف حضرات نے جُوچے نظریہ سے اپنی دلچسپی اور ہمارے عظیم قائد سے اپنی عقیدت کے اظہار کے طور پر ہر طرح کا اعلا قسم کا عمارتی سامان اور پھول پودے بکثرت ہم کو بھیجے جس کے لیے ہم ان سب کے حد درجہ شکو گزار ہیں اور یہ احساس ہم کو ہے کہ ہمارے عظیم قائد کم ال سنگ کے لیے دنیا بھر میں کس درجہ محبت و احترام کا جذبہ موجود ہے۔ یہ احساس ہمارے لیے موجبِ صد اطمینان و مسرت بھی ہے۔

"اب ہم سب کو اور زیادہ ہمت اور قوت کے ساتھ ،اپنے عظیم و محترم قائد ، کامریڈ کم ال سنگ کی رہبری میں اس راہ پر گامزن ہونے کی جدوجہد کرنی چاہیئے جو ہمارے لیے جوچے نظریے نے روشن کر دی ہے۔

زندہ باد کامریڈ کم ال سنگ —— عظیم قائد پارٹی کا ، عوام کا

" زندہ باد عظیم الشان جماعت کوریا کے محنت کشوں کی جس نے ان تمام کامیابیوں کے لیے ہمیں منظم کیا اور حوصلہ دیا !

" زندہ باد عظیم تصور و نظریہ جوچے ! "

شرفِ ملاقات

مینارۂ فکرِ جُوچے کی تقریب سے فراغت پا کر سب کے سب مندوبین (تعداد غالباً دو سو) پارلیمانِ ملّی کی عمارت جا پہنچے ۔ یہ گریٹ ہال بھی کہی جا سکتی ہے۔ اور واقعی جس طرح کم ال سنگ گریٹ لیڈر ہیں اسی طرح یہ ہال بھی گریٹ ہے کہ جو ان کی فکرِ بلند اور عزمِ جواں کا عکاس ہے۔ یہاں داخلے پر خاص پابندیاں ہیں ۔ دعوت نامے خوب چیک کیے جا رہے ہیں۔ آج صبح مجھے ایک شناختی کارڈ بھی مل گیا ہے کہ میں اسے اپنے پاس رکھوں اور جہاں ضرورت ہو دکھادوں ۔ گریٹ ہال میں پہلا مرحلہ یہ ہے کہ آج اس ہال میں گریٹ لیڈر مندوبین سے ملاقات کریں گے ۔اس کے لیے سب مندوبین نہیں ہیں ، انتخاب ہے چنانچہ سعدیہ کو یہاں جانے کی دعوت نہیں ملی اور ان کو گریٹ ہال کے

ایک ہال میں انتظار کرنا پڑا اس لیے کہ ایک دوسرے ہال میں جو ضیافت ہو رہی ہے اس میں سعدیہ مدعو ہیں۔ ملاقات جس ہال میں ہوتی ہے اس کا طول و عرض بتانا مشکل ہے۔ شاید ۲۵ فیٹ چوڑائی اور ۱۵۰ فیٹ لمبائی ہے اور اس میں چاروں طرف قیمتی صوفے لگے ہوئے ہیں۔ ان میں کوئی ۱۵۰ مندوبین بڑی آسانی سے سماگئے۔ تواضع شربت سے ہوئی۔ سگریٹ اور ماچس ہر ایک کے سامنے موجود تھی۔

یہاں میری ملاقات ایران کے ایک نمائندے سے ہوگئی کہ جو گزشتہ دنوں ہی پاکستان سے گزر کر ہندستان گئے تھے۔ وزارتِ خارجۂ ایران سے ان کا تعلق ہے۔ فارسی میں کلام ہوا اور پھر وہ اردو بولنے لگے اور کبھی انگریزی۔ ان کو اصرار تھا کہ صدر ضیاءالحق اپنی پارٹی بنا رہے ہیں۔ میں نے ان کو بتایا کہ افواہ صرف اس قدر ہے کہ مسلم لیگ کہ جو منتشر تھی اب شاید متحد ہو رہی ہے اور یہ متحد مسلم لیگ صدر ضیاءالحق سے اتفاق رائے کر کے ان کی حکومت میں شریک ہو سکتی ہے۔

اس ہال کی چھت میں کم از کم ۲۲ درمیانہ سائز کے جھاڑ آویزاں ہیں اور کم از کم ۱۰ بہت بڑے جھاڑ ہیں۔ اندازہ یہ ہوا کہ اس عمارت میں اس قسم کے متعدد ہال ہیں۔ ابھی میں جائزۂ حالات لے رہا تھا اور لوگوں کی نشست و برخاست کو دیکھ رہا تھا کہ روشنی ہوئی۔ یہ علامت ہے کہ گریٹ لیڈر کی آمد ہے۔

ذرا دیر بعد وہ تشریف لے آئے۔ مہمانوں نے کھڑے ہو کر اور تالیاں بجا کر ان کا استقبال کیا۔ فوٹو گرافر اور ٹیلے وژن کے لوگ ان کے جلو میں تھے۔ مہمانوں کی قطار بنا دی گئی اور گریٹ لیڈر ایک سرے سے آخر سرے تک خود جاکر سب سے ملے۔ اب تک میں نے یہ دیکھا ہے کہ میزبان شخصیات ایک جگہ کھڑی ہو جاتی ہیں اور مہمان قطار سے جا کر ان سے ملتے ہیں۔ یہ بڑا اہم فرق ہے اور اس میں زیادہ احترام ہے کہ میزبان خود جا کر اپنے مہمانوں سے ملتا ہے۔ کویت میں بھی ہزہائی نس خود چل کر سب سے ملاقات کرتے ہیں۔ ایک آدمی ساتھ تھا کہ جو ملک کا نام پہلے ہی دریافت کر لیتا تھا اور گریٹ لیڈر کو بتا دیتا تھا کہ وہ کس ملک کے مہمان سے

ہاتھ ملا رہے ہیں- میں نے پاکستان بتایا اوران کو ان کے جنم دن پر مبارک باد بھی دیدی-

ایک گروپ فوٹو

ملاقات کر کے گریٹ لیڈر واپس تشریف لے گئے اور تمام مہمان ایک ہال میں گئے کہ جو ہر اعتبار سے فوٹو گرافی کا ہال ہے -اس میں گروپ فوٹو کے تمام انتظامات موجود ہیں- یعنی ایلومینم کی سیڑھیاں تک بنی ہوئی ہیں- اوپر روشنی کا انتظام بھی ہے- ہم کم از کم ۱۰۰ بلکه اس سے بھی زیادہ آدمی تھے-ہمارے پاس پہلے ہی کارڈ موجود تھا کہ ہمیں سیڑھیوں پر کس جگہ کھڑے ہونا ہے - میری سیڑھی ۲ تھی اور جگہ بالکل وسط میں ، گریٹ لیڈر کے بالکل پیچھے- مگر وہاں دوسرے قابض ہو چکے تھے اور وہاں تک میری رسائی کا کوئی امکان نہ تھا -اس فوٹو میں میں نے دیکھا کہ بکثرت افریقی آکر شامل ہوئے ہیں ،مرد ، عورتیں اورکرسیوں پر جگہیں ان ہی کے لیے مخصوص ہوئی ہیں -پاکستان کے صدر کے خصوصی مندوب بھی کہیں پیچھے کھڑے کیے گئے ہیں-اس احترام میں افریقی اولیت کے مقام پر ہیں -

کم اِل سنگ رسولی

کل صبح جب صدر کم ال سنگ تقریر کرنے آئے تھے تو میری نظرِ طبیب نے سب سے پہلے ان کی صحت کا جائزہ لیا -ان کے چلنے کے انداز کے بعد نگاہ ان کے جسم پر گئی اور پھر ان کے چہرےمہرے سے گزرتی ہوئی ان کی گردن پر مرکوز ہو گئی کہ جہاں ایک رسولی بہت نمایاں ہے-صدر کم ال سنگ کا شمار بڑے انسانوں میں ہوتا ہے جس کے اظہار کے لیے سارے سامان کیے جاتے ہیں-ایسے بڑے لوگ اپنی کمزوریاں بھی چُھپایا کرتے ہیں اور اپنی بیماریاں بھی - جب تک ممکن ہوسکا اس رسولی (ٹیومر)کو وہ اپنے بڑھائے ہوئے بالوں میں چُھپاتے رہے مگر اب رسولی کا سائز اتنا بڑا ہے کہ لمبے بال اس کی پردہ پوشی نہیں کر سکتے ، بہ ایں ہمہ صدر کم ال سنگ

کسی ایسے انداز سے اپنی تصویریں نہیں کھنچواتے کہ ان میں رسولی ظاہر ہو جائے۔ صدر کم ال سنگ کے یہ رسولی کم از کم ۱۹۲۹ سے ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اس راز کے انکشاف میں سی۔ آئی۔ اے کے سراغ رسانوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ خود صدر کم ال سنگ اس رسولی کو سرطان رسولی سمجھتے رہے ہیں اور اس کا اظہار انہوں نے کیا بھی ہے، مگر درحقیقت یہ سرطانی رسولی نہیں ہے۔ مگر یہ سوال اپنی جگہ ہے کہ وہ اس معمولی رسولی کو بذریعۂ جراحت نکلوا کیوں نہیں دیتے؟ کیا ان کو یہ خطرہ ہے کہ اس سے ان کے گردوں کا مرض ابھر آئے گا یا ان کو دل کی کوئی تکلیف ہو جائے گی؟ میرے سرسری معائنہ کا جہاں تک تعلق ہے میرا خیال ہے کہ صدر کم ال سنگ کے گردے ضعیف ہو چکے ہیں اور اس وجہ سے ان کو عارضۂ قلب بھی لاحق ہو سکتا ہے۔

بینکوئٹ

لفظ بینکوئٹ بالعموم رات کے کھانے پر لاگو ہوتا ہے مگر یہاں دن کو آج اسی عمارت کے ایک وسیع ہال میں بتقریبِ جنم‌دن صدر کم ال سنگ ایک بینکوئٹ کا انتظام ہے۔ اس ہال میں میز نمبر ۲۸۱ پر میری اور سعدیہ کی جگہ ہے۔ گروپ فوٹو کے بعد تمام مہمان یہاں پہنچ گئے۔ زبردست انتظام ہے۔ ہال ویسا ہی عظیم ہے جیسا کہ کمرۂ ملاقات۔ وہی ۲۲ شینڈ لیئر چھوٹے اور دس انتہائی بڑے۔ سب شیشے کے اور سونے نما دھات کے۔ ہر ہال میں یہی انتظام ہے۔ اس ہال میں شریکِ طعام کم از کم دو ہزار آدمی ہیں۔ جب سب بیٹھ گئے تو ذرا دیر بعد گریٹ لیڈر کی آمد ہوئی۔ پُرجوش تالیوں کی گونج اور نعرہ ہائے تحسین و تبریک کے شور میں تشریف آوری ہوئی۔ ہال بقعۂ نُور بن گیا۔

کھانے کی میز پر انواع و اقسام کی بکثرت اشیائے خور و نوش لگی ہوئی ہیں اور بکثرت اشیا وقفے وقفے سے لائی جا رہی ہیں۔ کھانوں کی اس قدر انواع و اقسام کم دیکھنے میں آئی ہیں۔ اور مشروبات کی ایسی فراوانی بھی شاذ کہ ہر آٹھ آدمیوں کی میز پر کئی قسم کی شراب کی بوتلیں ہیں۔ اور آبِ معدنی اور عصارۂ انگور

و انار وغیرہ بکثرت حاضر ہیں ۔

شراب

یہاں شراب کا رواج عام ہے ۔ ہر کس و ناکس اطمینان سے نوشِ جان کرتا ہے ۔ یہ قلم سے ناکس کا لفظ کیسے نکل گیا ! یہاں کوریا میں ناکس کوئی نہیں ہے ۔ یہاں انسان کی عزت کی جاتی ہے اور اس کا احترام کیا جاتا ہے اور یہاں علم و عالم کی قدر و منزلت ہے اور خوب ہے ۔ شراب گراں بھی نہیں ہے کہ کم تنخواہ والے حاصل نہ کر سکیں ۔ شمالی کوریا میں ناکس صرف وہی ہے کہ جو یہاں پارٹی کا وفادار نہ ہو اور ملک کا دوست نہ ہو ۔ ہاں ایسے ملک بھی ہیں کہ وہاں آج بھی عالم مُوردِ عتاب ہے اور موضوعِ استہزا و تذلیل ہے ۔ اور اس کے برعکس غیر وفاداریٔ ملک و ملت سزا وار تحسین ہے ! ان میں ایک میرا بد قسمت پاکستان بھی ہے جس کی عظمت و رفعت اور قدر و منزلت کو ہم نے اپنی کوتاہ اندیشیوں سے تباہ و برباد کر کے رکھ دیا ہے اور جہاں صاحبانِ علم وحکمت طنز و مزاح کا موضوع ہیں ، اور ان کی ناقدریاں اور ناشناسیاں عروج پر ہیں ۔ وزارتوں کے بقراطوں نے ان پر عرصۂ حیات تنگ کیا ہوا ہے ۔ درس گاہیں پامال ہو رہی ہیں ۔ استاد طالب علم دست بگریباں ہیں ۔ صاحبان لوح و قلم حقارت کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں ۔ جہل کا ہر سامان قابلِ فخر اور علم وعرفان کی ہر کوشش قابلِ گرفت ۔ یہ وہ پاکستان ہے جس کی راہیں غیر متعین ہیں اور منزل غیر مقصود راہ و منزل سے بے گانہ یہ ملتِ اسلامیہ ایسے سفر کے لیے نکلی ہے کہ جس کی حقیقتوں کا خود اسے کوئی ادراک نہیں ۔ اور ہم یہ احساس کرنے کے لیے تیار ہیں نہ آمادہ کہ ارضِ پاک کی محبت سے محروم یہ قوم بے مقصد و بے کار نظام تعلیم کے ظلم و ستم کا شکار ہو رہی ہے اور گزشتہ ۳۵ سال سے کوئی قیادت اس درد کی دوا نہیں کر سکی ہے ۔

پاکستان وہ ملک ہے کہ جہاں شراب اس لیے ممنوع ہے کہ اسلام نے اسے حرام قرار دیا ہے ۔ آمنا و صدقنا ۔ اسلامی نظامِ حیات کے

نِفاذ کے لیے ظاہر ہے کہ ایسا کرنا ضروری تھا ۔ بھٹو صاحب بھی اس سہارے زندہ رہنا چاہتے تھے اور قیادتِ حاضرہ بھی اس کو اپنے استحکام و قیام کا ذریعہ بنانا ضروری سمجھتی ہے، مگر خوب جانتی ہے کہ امتناعِ شراب نے پاکستان میں شراب نوشی میں کمی نہیں، اضافہ کیا ہے ۔ قریب کے ممالک سے شراب پیپوں میں نہیں سونے کے بدلے ٹرکوں میں لاد لاد کر لائی گئی ہے اور بر سرِ عام لنڈھائی گئی اور اب بھی ایسا ہو رہا ہے ۔ مگر کوئی اس کے لیے آج بھی تیار نہیں ہے کہ دلوں کو بدلنے کا سامان کیا جائے اور قلوب کو آشنائے انقلاب کرنے کی تدابیر اختیار کی جائیں ۔ شمالی کوریا میں بلا شبہ شراب پی جاتی ہے اور یہاں لحم خنزیر بھی جائز ہے اور حلال ۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ شراب نوش اور خنزیر خور قوم ایک "گناہ" کر کے ہزاروں گناہوں سے گریزاں ہے اور کنارہ کش ۔ یہاں تالے کُنجی کا کوئی تصور نہیں ہے ، چوری کا کوئی خدشہ نہیں ہے ، عصمتوں کو پامال کیے جانے کا کوئی احتمال نہیں ہے ، اہل علم کو یہاں حقیر نہیں گردانا جا سکتا ، یہاں انسانوں کی عزتوں پر ڈاکے نہیں ڈالے جاتے ۔ اور ہم ہیں کہ شراب چھوڑ کو ہزار گناہ علی الاعلان کرتے ہیں ، اور ہم کو شرم ہے نہ حیا! اِس وطن پاک میں رات دن ڈاکے پڑ رہے ہیں ۔ عزتیں اور شرافتیں سستی اور عصمتیں ارزاں ہیں ۔ کوئی ہے کہ جو عقل و خرد کو بروئے کار لاکر اور فکر و نظر کو استعمال کر کے ان دو کے مابین فرق قائم کرے اور امتیاز !

میں یہاں جس وِلا میں رہ رہا ہوں اس میں کُنڈے ہیں نہ تالے ۔ جگہ بلند اور سارا علاقہ سنسان ، چار دن یہاں قیام کے دوران ایک بار بھی فکر لاحق نہ ہوئی کہ کوئی سامان بند کرنا ہے ۔ سوٹ کیس کھلے پڑے رہے اور پیسے میز پر رکھے رہے ۔ رات کی تاریکیوں میں جدھر چاہے نکل جائیے ۔

ایک ماحول یہ ہے ۔ اس کے برعکس مملکتِ خداداد پاکستان اور اسلامی جُمہوریہ کا حال دیکھیے : ملک کا ہر اخبار ہماری فکرِ بد حال اور ہمارے اخلاقی زوال اور ہمارے کردار کے اضمحلال کا گواہ ہے ۔ عصمتیں پامال ہو رہی ہیں ، عزتیں لُوٹی جا رہی ہیں ، گھر

اور بنک لُٹ رہے ہیں جہل بڑھ رہا ہے، علم و عالم کے لیے راہیں بند ہیں اور مسدود -

دونوں کی عملی حالت کا مقابلہ کرکے بتائیے کہ ایک غیر جانبدار آدمی اسلامی جمہوریہ پسند کرے گا یا سوشلسٹ جمہوریہ ؟

اگر ہم نے نعرہ بازیاں بند کر کے حُسنِ عمل کا سامان نہ کیا اور اسلام کو اس سے زیادہ اپنے قیام و استحکام کے لیے استعمال کرنے کی غلطی اور عاقبت نا اندیشی کو جاری رکھا تو پاکستان میں اسلام کا زوال ہمارے ہاتھوں ہوگا مگر اس خطرناک کھیل سے سارے عالم اسلام میں توازن بگڑ جائے گا اور کمیونزم اور سوشلزم کے لیے راہیں ہموار ہوتی چلی جائیں گی - جس کے ذمہ دار سب سے زیادہ ہم ہوں گے کیونکہ ہم ہی اسلام کے لیے کھوکھلے نعرے لگا رہے ہیں -

پیغام تبریک

صدر کم ال سنگ کی تشریف آوری کے بعد پریزیڈیم کے رکن جناب لی جونگ اوک صاحب نے ان کی خدمت میں ان کے جشن ۷۰ سالہ پر ان کو ایک طول طویل پیغام تہنیت و تبریک پیش کیا - اس کی طوالت قطعی خواب آور ہو جاتی مگر وقفے وقفے کے بعد نعرہ ہائے تحسین و آفرین نے سوتوں کو جگا جگا دیا !

اس موقع پر مختلف ممالک کے صدور اور وفود کے قائدین نے اپنی اپنی زبانوں (عربی ، فرانسیسی ، انگریزی ، جاپانی وغیرہ) میں ہدیۂ تبریک پیش کیا - اسے " ٹوسٹ پروپوز " کرنا کہتے ہیں - ان کے کوریائی زبان میں تراجم ہوتے رہے - مترجمین کی ایک مضبوط جماعت کوریا میں موجود ہے - ہر زبان کے مترجمین وفود کے ساتھ ہیں اور زبان و فہم کی کوئی تکلیف نہیں ہونے دیتے - کھانے کی میز پر مینیو بھی انگریزی ، فرانسیسی ، عربی اور جاپانی زبانوں میں رکھے ہیں - اس موقع پر موزنبیق کے صدر ساموراموائیس میخائل صاحب کی تقریر کو خوب اہمیت دی گئی ہے - مقررین میں زیادہ تر افریقی

ممالک سے تعلق رکھتے تھے۔خیال تھا کہ پاکستان کے مندوبِ خاص کچھ ارشاد فرمائیں گے۔مگر خیریت ہوئی۔ورنہ وہ شاید انگریزی بولتے اور یہ اچھا نہ ہوتا۔

ٹوسٹ پروپوز کرنے کی بھرمار

جناب کم ال سنگ کا خطاب

آج کے بینکوئٹ میں اس قدر زیادہ ٹوسٹ پروپوز ہوئے کہ یقیناً سب ہی لوگ اٹھتے بیٹھتے تھک گئے۔وقت بھی زیادہ ہو گیا۔بینکوئٹ شروع ہوئے اب ڈھائی گھنٹے ہو چکے ہیں۔میں نے ہر نمکین چیز سے پرہیز کیا ہے۔گوشت تو میں جب سے یہاں آیا ہوں ترک کر ہی چکا ہوں۔میز پر ایک برتھ ڈے کیک رکھا تھا۔میری نیت اس پر تھی کہ اس سے سہارا کروں گا۔مگر بالآخر پتہ یہ چلا کہ وہ تو مصنوعی کیک ہے اور ایسا کیک ہر میز پر رکھا ہوا ہے! نتیجہ یہ ہوا کہ میں عظیم الشان ضیافت سے بھوکا ہی واپس آ گیا۔البتہ کوئل کا ایک انڈا میں نے اس لیے نوش جان کر لیا کہ یہ ایک نئی چیز تھی اور اس کا شمار ڈیلی کیسی میں ہوتا ہے۔سعدیہ نے یاد دلایا کہ ۱۹۷۵ء میں جب ہم ملیشیا گئے تھے تو پروفیسر نجیب العطاس صاحب کے ہاں کھانا کھایا تھا۔ان کی اہلیہ نے کوئل کے انڈوں کا پلاؤ پکایا تھا، اور ہم نے بڑی دلچسپی کے ساتھ کھایا تھا۔

اس خورو نوش کا حاصل وہ تقریر ہے کہ جو صدر کم ال سنگ صاحب نے اس موقع پر کی۔یہ بڑی معنی خیز تقریر ہے اور اس کی روح وہی ہے کہ جس کا اظہار ان کی پہلے دن کی تقریر میں ہوا تھا۔

محفل رقص و سرود

یہ میرے بچپن کی بات ہے، عمر شاید ۵-۶ سال ہوگی۔آپا کلّو (محترمہ روشن آراء۔دختر مرزا بُلاقی بیگ) کے ہاں پہاڑ گنج دہلی میں کوئی تقریب تھی۔جہاں تک مجھے اس وقت یاد آتا

ہے کہ کسی بچے کی مسلمانیاں تھیں۔اس موقع پر ان کے ہاں ایک محفلِ رقص و سرود برپا ہوئی تھی۔آپا کلّو کے شوہر (نام یاد نہیں آ رہا ہے) ہمارے بہنوئی حبیب الرحمان صاحب کے بڑے دوست تھے، اور ہمارے چھوٹے بہنوئی حافظ محمد یحیٰی صاحب سے بھی ان کی یاد اللہ تھی۔میں ان دونوں بہنوئیوں کے ساتھ اس محفل میں شریک ہوا تھا۔طوائف تھی اور گانا تھا۔سازندے بڑے عجیب و غریب لباسوں میں تھے۔لوگ ان طوائف کو پیسے رُپے بار بار دے رہے تھے۔میں بھائی حبیب الرحمٰن صاحب کے پاس بیٹھا تھا۔انہوں نے مجھے شاید ایک روپیہ دیا اور میں نے ہاتھ بڑھا کر یہ روپیہ طوائف کو دیا اور جب اس نے روپیہ ہاتھ میں لیا تو میں نے اس کا ہاتھ کھینچ لیا! یہ حرکت بلاقصد و ارادہ ہوئی، مگر اس نے محفل کو قہقہہ زار بنا دیا، اور میں شرمندگی کے مارے گڑ گیا۔بچپن کا یہ واقعہ میرے ذہن میں آج بھی بڑا تازہ ہے اور اس کی شرمندگی اور خجالت کا وزن آج بھی وہی ہے کہ جو آج سے ۵۵-۵۲ سال قبل تھا۔بابو شمبھوناتھ جی بڑے وضع دار انسان تھے۔شاید ہنوز بقیدِ حیات ہیں۔سالِ گزشتہ میں ان سے ملنے گیا۔اُسی دلّی پرنٹنگ ورکس میں کہ جہاں رات دن چھاپنے کی مشینیں چلا کرتی تھیں بابو جی ایک کونے میں نحیف و نزار بیٹھے تھے اور سارا پریس مارکیٹ بن گیا تھا۔دل بڑا دکھا تھا ان کو دیکھ کر! نہ جانے کیا حالات ہوئے کہ پریس بند ہوا اور بابو شمبھو ناتھ جی کا حال یہ ہوا۔لالہ شام ناتھ ان کے قابل فرزند تھے کہ جو پارلیمان تک گئے اور وزیر مملکت تک بنے۔مگر میرے دوست شام ناتھ سرطان سے جوان عمری میں مر گئے اور بابو شمبھو ناتھ جی کی کمر توڑ گئے۔ہر چند کہ باپ بیٹے کے تعلقات استوار نہ تھے، مگر باپ بہر حال باپ ہوتا ہے۔اس کے بعد حالات دگرگوں ہی رہے اور اب تو سب کاروبار ختم ہوا۔اس پرنٹنگ پریس سے ہمدرد کا بڑا گہرا تعلق رہا ہے۔ہمدرد کے سارے کام میرے زمانے میں یہاں ہوتے رہے ہیں اور دوسرا لطیفی پریس تھا۔وہاں خان صاحب عبداللطیف صاحب مالک تھے اور مولانا کرامت عثمانی منیجر۔یہ دونوں اللہ کو پیارے ہوئے۔

ممالک سے تعلق رکھتے تھے ۔خیال تھا کہ پاکستان کے مندوبِ خاص کچھ ارشاد فرمائیں گے ۔مگر خیریت ہوئی۔ورنہ وہ شاید انگریزی بولتے اور یہ اچھا نہ ہوتا ۔

ٹوسٹ پروپوز کرنے کی بھرمار

جناب کم ال سنگ کا خطاب

آج کے بینکوئٹ میں اس قدر زیادہ ٹوسٹ پروپوز ہوئے کہ یقیناً سب ہی لوگ اٹھتے بیٹھتے تھک گئے ۔وقت بھی زیادہ ہو گیا ۔بینکوئٹ شروع ہوئے اب ڈھائی گھنٹے ہو چکے ہیں ۔میں نے ہر نمکین چیز سے پرہیز کیا ہے ۔گوشت تو میں جب سے یہاں آیا ہوں ترک کر ہی چکا ہوں ۔ میز پر ایک برتھ ڈے کیک رکھا تھا ۔میری نیت اس پر تھی کہ اس سے سہارا کروں گا ۔مگر بالآخر پتہ یہ چلا کہ وہ تو مصنوعی کیک ہے اور ایسا کیک ہر میز پر رکھا ہوا ہے ! نتیجہ یہ ہوا کہ میں عظیم الشان ضیافت سے بھوکا ہی واپس آ گیا ۔البتہ کوئل کا ایک انڈا میں نے اس لیے نوش جان کر لیا کہ یہ ایک نئی چیز تھی اور اس کا شمار ڈیلی کیسی میں ہوتا ہے ۔سعدیہ نے یاد دلایا کہ ۱۹۷۵ء میں جب ہم ملیشیا گئے تھے تو پروفیسر نجیب العطاس صاحب کے ہاں کھانا کھایا تھا ۔ان کی اہلیہ نے کوئل کے انڈوں کا پلاؤ پکایا تھا ، اور ہم نے بڑی دلچسپی کے ساتھ کھایا تھا ۔

اس خور و نوش کا حاصل وہ تقریر ہے کہ جو صدر کم ال سنگ صاحب نے اس موقع پر کی ۔یہ بڑی معنی خیز تقریر ہے اور اس کی روح وہی ہے کہ جس کا اظہار ان کی پہلے دن کی تقریر میں ہوا تھا ۔

محفل رقص و سرود

یہ میرے بچپن کی بات ہے ، عمر شاید ۵ ۔ ۶ سال ہوگی ۔آپا کلو (محترمہ روشن آراء ۔ دختر مرزا بُلاقی بیگ) کے ہاں پہاڑ گنج دہلی میں کوئی تقریب تھی ۔جہاں تک مجھے اس وقت یاد آتا

ہے کہ کسی بچے کی مسلمانیاں تھیں۔اس موقع پر ان کے ہاں ایک محفلِ رقص و سرود برپا ہوئی تھی۔آپا کلو کے شوہر (نام یاد نہیں آ رہا ہے) ہمارے بہنوئی حبیب الرحمان صاحب کے بڑے دوست تھے ، اور ہمارے چھوٹے بہنوئی حافظ محمد یحیٰی صاحب سے بھی ان کی یاد اللہ تھی ۔میں ان دونوں بہنوئیوں کے ساتھ اس محفل میں شریک ہوا تھا ۔طوائف تھی اور گانا تھا ۔سازندے بڑے عجیب و غریب لباسوں میں تھے۔ لوگ ان طوائف کو پیسے رُپے بار بار دے رہے تھے۔میں بھائی حبیب الرحمٰن صاحب کے پاس بیٹھا تھا ۔ انہوں نے مجھے شاید ایک روپیہ دیا اور میں نے ہاتھ بڑھا کر یہ روپیہ طوائف کو دیا اور جب اس نے روپیہ ہاتھ میں لیا تو میں نے اس کا ہاتھ کھینچ لیا ! یہ حرکت بلاقصد و ارادہ ہوئی ، مگر اس نے محفل کو قہقہہ زار بنا دیا ، اور میں شرمندگی کے مارے گڑ گیا ۔ بچپن کا یہ واقعہ میرے ذہن میں آج بھی بڑا تازہ ہے اور اس کی شرمندگی اور خجالت کا وزن آج بھی وہی ہے کہ جو آج سے ۵۵-۵۶ سال قبل تھا ۔بابو شمبھوناتھ جی بڑے وضع دار انسان تھے۔شاید ہنوز بقیدِ حیات ہیں۔سالِ گزشتہ میں ان سے ملنے گیا ۔ اُسی دلی پرنٹنگ ورکس میں کہ جہاں رات دن چھاپنے کی مشینیں چلا کرتی تھیں بابو جی ایک کونے میں نحیف و نزار بیٹھے تھے اور سارا پریس مارکیٹ بن گیا تھا ۔دل بڑا دکھا تھا ان کو دیکھ کر!نہ جانے کیا حالات ہوئے کہ پریس بند ہوا اور بابو شمبھو ناتھ جی کا حال یہ ہوا ۔لالہ شام ناتھ ان کے قابل فرزند تھے کہ جو پارلیمان تک گئے اور وزیر مملکت تک بنے ۔مگر میرے دوست شام ناتھ سرطان سے جوان عمری میں مر گئے اور بابو شمبھو ناتھ جی کی کمر توڑ گئے۔ہر چند کہ باپ بیٹے کے تعلقات استوار نہ تھے ، مگر باپ بہر حال باپ ہوتا ہے ۔اس کے بعد حالات دگرگوں ہی رہے اور اب تو سب کاروبار ختم ہوا ۔اس پرنٹنگ پریس سے ہمدرد کا بڑا گہرا تعلق رہا ہے۔ہمدرد کے سارے کام میرے زمانے میں یہاں ہوتے رہے ہیں اور دوسرا لطیفی پریس تھا ۔ وہاں خان صاحب عبداللطیف صاحب مالک تھے اور مولانا کرامت عثمانی منیجر ۔یہ دونوں اللہ کو پیارے ہوئے۔

بابو شمبھو ناتھ جی صاحب کے ہاں جب بھی کوئی تقریب ہوتی اور خاص طور پر مونڈھن کی تقریب تو بڑی زور دار دعوت ہوا کرتی تھی ، اس دعوت میں دلّی کے شرفا و رؤسا جمع ہوتے تھے۔ بابو جی ٹیلیفون کرتے کہ آج چھن چھن بھی ہے۔میں اس محفلِ رقص و سرود میں شریک ہوا کرتا تھا مگر اس شرکت کی تعداد ۴۔ ۵ سے زیادہ نہیں ہے ۔ ظاہر ہے کہ مونڈھن کی تقریب کے لیے اتنے بچے کہاں پیدا ہوں گے کہ روز ان کے سرمونڈھنے کی تقریب ہوا کرے ۔ اس کے بعد زندگی کا نقشہ ہی بدل گیا اور محفل رقص و سرود کہاں اور میں کہاں ۔مگر آج تقریباتِ جشنِ پیدائشِ صدر کم ال سنگ کے موقع پر ایک محفل رقص و سرود برپا ہوئی ہے اور میں اور سعد یہ اس میں مدعو ہیں۔انکار ممکن نہیں اور شرکت ذہن و قلب پر بار ۔ بارے ہم میدانِ رقص و سرود میں پہنچ گئے۔ گائڈ نے رہنمائی دیدی تھی کہ کم از کم ڈیڑھ گھنٹہ باہر ہوا میں کھڑا ہونا ہے اور دل چاہے تو رقص کرنا ہے ، اس لیے کپڑے گرم ہوں تو مناسب۔میں نے اپنی پلاسٹک شیروانی زیب تن کی جس سے ہوا کا گزر جسم تک ہو ہی نہیں سکتا ! معلوم ہوا کہ اس محفلِ رقص و سرود میں ، جسے بازار رقص و سرود کہنا صحیح تر ہے یا شاید ہنگامۂ رقص و سرود صحیح تر لفظ ہو ، رہنمائے اعظم کم ال سنگ بھی شرکت فرمائیں گے ۔ہم جب پہنچے تو مہمانوں کے لیے مخصوص جگہیں پُر ہو چکی تھیں ۔بارے کھڑے ہونے کی جگہ مل ہی گئی ۔بعد میں پتہ چلا کہ وزارت صحت نے میرے اور سعدیہ کے لیے دو نشستیں محفوظ کی ہوئی تھیں۔مگر ہمارے گائڈ اور مترجم کو اس کی اطلاع نہ ہوئی اور ہم نے اس ہنگامۂ رست و خیز کو ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ ہوائے سرد کے جھونکوں میں آسمان کے نیچے کھڑے ہو کر دیکھا ۔ سامنے ایک بڑا میدان تھا اور اس میدان میں ہزارہا مرد و عورت جمع تھے۔اس میدان کو اور اس میدان کے تین طرف عمارات کو اور اس میدان سے اوپر آسمان کو روشنیوں ، قمقموں بلونوں اور غباروں سے آراستہ و مزین کر دیا گیا تھا ۔روشنی ایسی کہ جیسے سورج اپنی پوری تمازتوں کے ساتھ عالم تاب ہو۔ مرد و عورت ایسے لباسوں میں کہ زرق برق! ساز و آہنگ سے فضا

معمور - درمیان میں ایک گول اسٹیج ہے اور اس کے چاروں طرف جوان لڑکیاں دائیں بائیں اس انداز سے رقصاں کہ معلوم ہو کہ اسٹیج پورا کا پورا گردش کر رہا ہے اسٹیج کی چھت پر سازندے جمع ہیں کہ جن کے دھنوں پر یہ سارا عالم رقصاں ہے - تعریف و تعارف کا ہنگامہ تھا کہ شور برپا ہوا - یہ شور علامت تھا کہ صدر کم ال سنگ آ رہے ہیں اور جب وہ سامنے سے بالکنی پر آ گئے تو پورے میدان میں ڈھائی تین لاکھ مرد و عورت جیسے پاگل ہو گئے ہوں - ان کے ہاتھوں میں رنگ برنگ پھول تھے اور وہ اچھل اچھل کر اور تالیاں بجا بجا کر اپنے عظیم قائد کا استقبال کر رہے ہیں - یہ منظرِ استقبال ناقابل فراموش ہے - میں اس کے کیف و سرور کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا - میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کوریائے شمالی کے لوگ ، مرد و عورت اور بچے اپنے گریٹ لیڈر سے اس درجہ والہانہ محبت کرتے ہیں ! گریٹ لیڈر کی آمد کے بعد پروگرام شروع ہوا - رقص و سرود کے پروگرام کے آٹھ حصے تھے - مجھے مطبوعہ جو پروگرام ملا تھا اس کا ترجمہ کچھ یوں ہے :

فتوحات قائد پر ترانۂ مسرّت و شادمانی

حصۂ اوّل : برادرانِ وطن کی قسمت کے شانہ بشانہ

منظر ۱ : ہماری منزل مقصود کیا ہے

منظر ۲ : قائد کا سفرِ طولانی آزادئ وطن کے لیے

حصۂ دوم : جوچیے تحریک کا نُقطۂ آغاز

منظر ۱ : امپیریلسٹ اتحاد کو پارہ پارہ کر دو - علم بلند کرو

منظر ۲ : عظمتوں کے ستاروں پر کمندیں پھینکو

ستارۂ کوریا

کامریڈ کا ترانۂ بلند

حصۂ سوم : جاپان کے خلاف جنگ کو منزل فتح تک لے جانا

منظر ۱ : جاپان کے خلاف گوریلا طاقت کی بنیاد ڈالنا
منظر ۲ : آزادی کا سورج طلوع ہوتا ہے
منظر ۳ : ہم آپ کی اطاعتِ کامل کرتے ہیں
منظر ۴ : ہم اپنے عسکری رہنما کے ساتھ ہزار در ہزار میل چلیں گے
منظر ۵ : جنرل کم ال سنگ کو ۳۰ ملیون عوام سلام کرتے ہیں

حصۂ چہارم : جنگ کے شعلوں سے گزر کر نئے کوریا کی تعمیر

منظر ۱ : جمہوریت کی بہار
ینگساندو
موسم بہار میں کھیتی باڑی کا گانا
ماہِ مئی کی فتح و نصرت
منظر ۲ : جمہوریۂ عوام کے زیر سایہ
منظر ۳ : امریکی استعمار پر لعنت ہزار بار
محاذ کو جانے والی سڑک
مارشل کم ال سنگ ہمارا سپہ سالارِ اعلا

حصۂ پنجم : کوریا کو چولیما ملک میں بدل ڈالنا

منظر ۱ : میلے کے اوپر
منظر ۲ : چولیما کی پرواز
منظر ۳ : عصمتوں کی دیویاں ریشمی پھریروں کے ساتھ

حصۂ ششم : سوشلزم کی بلندیوں کی جانب

منظر ۱ : بہبودِ عوام کے لیے غیر مختتم سفر
منظر ۲ : زراعتِ بے کراں
منظر ۳ : علم کی روشنیاں

منظر ۲ : کوریا ایک ہے!

حصۂ ہفتم : تحریکِ جُوچے کی آفتابی روشنی میں

منظر ۱ : ہم اس راہ پر ہمیشہ چلتے رہیں گے۔

منظر ۲ : درخشاں عوام کے لیے جنت

اختتام : عمرِ دراز اور صحتِ بےانداز ہمارے قائد کے لیے۔

میں نے اپنی زندگی میں ایسی نرالی، ایسی پُر مقصد اور ایسی نتیجہ خیز محفلِ رقص سرود کبھی نہ دیکھی تھی۔ اس میں کم از کم تین لاکھ افرادِ وطن شریک تھے اور اس رقص میں غیر ملکی مہمانانِ گرامی بھی بالآخر شریک ہوئے اور یہ ہنگامۂ دل فریب اور شورِ جاں فزا کوئی دو گھنٹے جاری رہا، اور جب اختتام پر گریٹ لیڈر پھر اٹھ کر سامنے آئے تو ساری خلقت پر ایسا لگا کہ پاگل پن کا دورہ پڑ گیا ہو۔ تا حدِ نگاہ زمین انسانوں سے پٹی تھی اور اختتام پر ایسا لگتا تھا کہ زرق برق زمین اچھل کود رہی ہے۔ آسمان پر گولے پھٹ رہے تھے اور ان سے رنگ برنگ پھول جھڑ رہے تھے۔ یہ اظہارِ وفا کا اور اظہارِ محبت کا منظر ۱۵ منٹ جاری رہا۔

اور جب قائد کم ال سنگ چلے گئے تو سارا عالم یک لختخاموش ہو گیا۔ ایک شخص اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ سب سے پہلے ہزارہا مہمانانِ بیرونی باہر آئے، جن کے لیے ہزارہا موٹریں ترتیب کے ساتھ باہر کھڑی تھیں۔ کیا مجال کہ کوئی ایک موٹر کار بےقاعدہ روانہ ہو سکے۔ منتظمہ ایک ایک قطار کو روانگی کی اجازت دے رہی تھی، ذرّہ برابر ٹریفک جام نہ ہوا۔ اور پھر لاکھوں انسان ترتیب سے باہر آئے اور اپنے گھروں کو سدھارے۔

ہم اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس جب پہنچے تو رات کے ساڑھے بارہ بجے تھے۔ مگر ریستوران کھلا تھا اور طالب علم میزبان بچیاں کھانا تیار کیے منتظر تھیں۔ کیا مجال کہ ان کی پیشانی پر ایک بھی بل آیا ہو۔ انتہائی شرافت اور محبت سے انھوں نے بھوکے مہمانوں کو کھانا کھلایا۔

۱۲ - اپریل ۱۹۸۲ ء

غنائے عوام در مدح قائد

آغاز : ہمارا قائد ، ایسا قائد کہ ہماری پانچ ہزار سالہ تاریخ نے ہمیں ایسا قائد نہیں دیا !

حصۂ اول : جُوچیے تحریک و دور کا افتتاح

حصۂ دوم : آزادئ وطن کی جدوجہد کو فتح و نصرت کی منزل تک پہنچانا

حصۂ سوم : بوبنائے جوچیے پارٹی اور حکومت کی بنا ڈالنا

حصۂ چہارم: جوچیے کی جنت کہ جس کی بنا ہمارے قائد نے ڈالی

منظر ۱ : ہمارا باپ مارشل کم ال سنگ ہے اور ہمارا گھر آغوشِ پارٹی ہے

منظر ۲ : جوچیے تحریک و فکر کے زیر سایہ صنعتی پیش رفت

منظر ۳ : ہر سال زبردست زراعتی پیداوار

منظر ۴ : ایک ملک تعلیم سے آراستہ ،ایک سر زمین دولتِ علم سے سرشار

منظر ۵ : جوچیے آرٹ اور معراجِ فن

منظر ۶ : ایک ایسا وطن کہ جہاں ہر ایک خوش حال ہے -

حصۂ پنجم : مہربان روشنئ آفتاب ساؤتھ کوریا اور دوسرے ممالک میں بسنے والے کوریاؤں تک

حصۂ ششم : ہمارا عَلَمِ آزادی بلند رہے

حصۂ ہفتم : ہم تحریکِ جُوچیے کو پارٹی کی قیادت میں پائے تکمیل کو پہنچائیں گے

اختتام : ہم اپنے قائد کے ہمیشہ دوش بدوش زندہ رہیں گے -

یہ اُس پروگرام کا تحریری عکس ہے کہ جس نے کم ال سنگ اسٹیڈیم

میں آج جامۂ عمل پہنا ہے۔ عرصہ ہوا کہ ایشین گیمز کی ایک ٹیم آئی جس کی قیادت کویت کے ذمہ تھی۔اس نے پیونگ یانگ اسٹیڈیم کا معائنہ کیا اور رائے قائم کی کہ ایشین گیمز کے لیے یہ اسٹیڈیم موزوں نہیں ہے۔فیصلہ ہوا کہ اس پرانے اسٹیڈیم کی جگہ کسی تاخیر کے بغیر ایک نیا اسٹیڈیم تعمیر کیا جائے۔مارشل کم ال سنگ کا یہ فیصلہ ہر فرد و ملّت نے بسر و چشم قبول کیا اور چند ماہ میں پرانے کی جگہ نیا اسٹیڈیم تیار ہوگیا۔نئے اسٹیڈیم کی تعمیر زیادہ تر طالب علموں نے کی ہے۔میرا ترجمان کم ال سنگ یونیورسٹی کا طالب علم ہے۔اس کا سب سے زیادہ قابل فخر کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اس نئے اسٹیڈیم کی تعمیر میں حصہ لیا ہے۔اسے وہ بڑے فخر کے ساتھ بیان کرتا ہے!

نیا اسٹیڈیم تعمیر کا بڑا اچھا نمونہ ہے۔اس میں تقریباً ایک لاکھ افراد کی گنجائش ہے یا شاید ذرا کم ہے۔مگر اس کا خاصّہ یہ ہے کہ یہ ڈھکا ہوا ہے۔یعنی چاروں طرف ایلومینم کے سائبان سے سائے کا انتظام کیا گیا ہے تاکہ بیٹھنے والوں پر دھوپ اور بارش نہ پڑے۔رنگ برنگ کی پلاسٹک کی نشستیں لگائی گئی ہیں۔روشنی کا بھر پور انتظام ہے۔لاؤڈ اسپیکروں کا پورا بند و بست ہے۔غرض دنیا کے جس بہترین اسٹیڈیم کا تصور کیا جا سکتا ہے وہ یہاں موجود ہے۔ میرا سب سے بڑا اور اہم مطالعہ یہ ہے کہ کوریا کے لوگوں میں اتحاد، تنظیم اور یقین محکم کی کیا شان ہے۔جہاں تک اتحاد کا تعلق ہے پوری قوم متحد الفکر اور متحد العمل ہے۔ یہاں نو صوبے ہیں اور صوبائی مناقشت کا کوئی وجود نہیں ہے۔ یقین محکم کا جہاں تک تعلق ہے پوری قوم کو اور قوم کے ہر فرد کو ہر عورت کو، ہر مرد کو اور ہر بچے کو صدر کم ال سنگ اور پارٹی پر یقین محکم ہے۔وہ رات دن اور شب و روز کے ہر لمحے کم ال سنگ کو اپنا باپ کہتے ہیں اور ہمہ وقت خود آغوشِ پارٹی میں جگہ پاتے ہیں۔ کم ال سنگ پر ان کا یقین اس درجہ محکم ہے کہ ان کو اس راہ سے ہٹایا ہی نہیں جا سکتا۔اور رہا تنظیم کا مسئلہ، اس کے بارے میں اپنے قیام کے تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ تنظیم پر اس پوری قوم کو اعتماد کامل ہے۔

آج کے اجتماع کو مثال کے طور لینا چاہیے۔اس اجتماع میں ایک

لاکھ تو دیکھنے والے ہیں۔ان میں غیر ملکی مہمانانِ گرامی بھی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کو ایک مرسیڈیز کار دی گئی ہے ۔ مہمانوں کی تعداد مجموعی طور پر ایک ہزار سے کم نہیں ہے اور اسی تعداد میں موٹریں ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ تمام ایک ہزار نئی مرسیڈیز جرمنی سے منگوائی گئی ہیں۔اور اسی تقریب(۷۰ سالہ جشن پیدائش) کے لیے درآمد کی گئی ہیں ۔آج کے اس اجتماع میں ۲۰ ہزار طالب علموں نے حصہ لیا ہے ، اس قدر عظیم اجتماع کے باوجود کوئی ہنگامہ ہے نہ فساد ، انتہائی اطمینان سے ایک لاکھ دیکھنے والے اور ۲۰ ہزار طالب علم یہاں سما گئے ہیں اور جب پروگرام ختم ہوا تو یہ تمام کے تمام لوگ واپس چلے گئےاور ذرّہ برابر ٹرافک جام نہ ہوا۔ایک ہزار موٹریں ، سینکڑوں بسیں ، منی بسیں سب ترتیب و تنظیم کے ساتھ واپس ہو گئیں ۔

جب آج کے اس پروگرام کے لیے صدر کم ال سنگ تشریف لائےتو ۱۲۰ ہزار لوگوں نے تالیوں اور نعروں سے ان کا والہانہ استقبال کیا۔ اس استقبال میں تصنع تھا نہ بناوٹ ۔اس اجتماع کا ہر فرد جانتا ہے کہ صدر کم ال سنگ نے آزادیٔ وطن کے لیے کس قدر قربانیاں دی ہیں اور کس طرح غلام قوم کی نہ صرف آزادی کی دولت کا پورا سامان کردیا ہے بلکہ کم ال سنگ نے قوم کے ہر فرد کو اتحاد ، یقینِ محکم اور تنظیم کی اعلا ترین صلاحیتوں سے مالا مال کر دیا ہےاور ہر دشمن کے خلاف پوری قوم کو صف آرا کر دیا ہے ۔

وہ قوم کہ جو جہالت کی تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی تھی علم و عمل کی روشنی بن کر صفحۂ ارض پر ابھری ہے ۔کم ال سنگ نے کوریائے شمالی کے ہر فرد کو آشنائے خودی کر دیا ہے ۔

آج کا پروگرام جن راہوں پر مرتب کیا گیا تھا پوری تنظیم کے ساتھ ساٹھ ہزار طلبہ نے اسے پیش کیا۔ ہر پروگرام میں تنظیم ، عظمت و جاذبیت تھی اور لوگوں نے بے ساختہ داد دی ہے ۔یہ پروگرام رقص و سرود ، جسمانی کرتب کے مظاہر ، مادرِ وطن سے محبت ،کم ال سنگ باپ سے والہانہ الفت ، تعمیر خودی ، ترقی زراعت و صنعت وغیرہ شعبہ ہائے زندگی میں کوریا کی پیش رفت کا ایک کام یا باظہار تھا ۔

میں نے دنیا بھر میں ایسے مظاہر بہت دیکھے ہیں مگر ایسا منظم، دل چسپ، پُر مقصد اور نتیجہ خیز پروگرام آج سے قبل کبھی نہیں دیکھا تھا۔

عرصۂ دراز کے بعد صدرِ اسلامی جمہوریۂ پاکستان جنرل محمد ضیاءالحق صاحب کی دعوت پر ۱۴ / اگست ۱۹۸۱ء کو ملّت پاکستان نے جشن آزادی شرح صدر کے ساتھ منایا تھا، اور میں نے اس میں والہانہ پن بدرجۂ کمال محسوس کیا۔ مگر اس میں تنظیم کا ایسا شدید فقدان تھا کہ راہیں مسدود ہوگئیں، ٹرافک جام ہو گئے۔ امیروں کے گھروں پر کوئی جھنڈا نہ تھا، غریبوں نے دو دو جھنڈے اڑائے اور پھر یہ جھنڈے گھروں پر عرصے تک لگے رہے۔ حالانکہ تقاضائے تنظیم یہ تھا کہ عام گھروں سے دوسرے دن ان جھنڈوں کو اتار دیا جاتا۔ یہ ایک دن کا ہنگامہ ہو کر ختم ہوگیا اور اس کو بعد میں سہارا دینے والا کوئی پروگرام نہ تھا۔ اس دن میں واحد شخص تھا جس نے عالی مرتبت صدر مملکت سے گزارش کی تھی کہ اس والہانہ جذبے کی بدرجۂ انتہا قدر کیجیے۔ پاکستان سے محبت ہر سینے میں موجود ہے۔ آپ نے بڑے خلوص سے سازِ دل کو چھیڑا ہے اور یہ کہ دل کے تار ہل گئے ہیں۔ اس لرزش کو اور اس سوز و گداز کو قائم و دائم بنانے کا انتظام ضروری ہے۔ یہ کافی نہیں ہے کہ آپ اس والہانہ شیفتگی کو اپنے حق میں سو فیصد سمجھ لیں اور اس کے مطالب کو نظر انداز کر دیں۔ مگر ایسا نہ ہو سکا اور افرادِ ملّت کے جذباتِ خلوص و انس کو خلوص و انس کی زبان میں جواب نہیں مل سکا، اور یہ جذبہ سرد ہوگیا۔ میری رائے میں یہ توقع قائم نہیں کی جا سکتی کہ اس سال ۱۴ / اگست میں پاکستان کے لوگ آوازِ خلوص پر بہ خلوص لبیک کہیں گے الّا یہ کہ اقتدار کے زیرنگیں ہر طاقت اور خزانۂ پاکستان اس مہم پر صرف کر کے ایک دن کا جلوہ پھر ہو جائے۔

آج کے پروگرام میں احترام قائد، تعمیر وطن، محبت انسان، فکر جوان، ولولۂ تازہ اور عزم نو کا بھرپُور مظاہرہ ہوا۔ اس تمام مظاہرے کو حیرت انگیز اثر انگیزی اس پس منظر نے دی کہ جو ہر خیال و فکر کے ساتھ بدل جاتا تھا اور اقوال زرین کا آئینہ دار

بن جاتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ۷۔۸ ہزار بچے یہ منظر کشی کر رہے
تھے۔ ان کے ہاتھوں میں پلے کارڈ تھے اور ۷۔۸ ہزار پلے کارڈ
اس ترتیب و تنظیم کے ساتھ بدل جاتے تھے کہ ایک نیا منظر پیدا
ہو جاتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ کم از کم ۲۰۔۲۵ مناظر پیدا ہوئے
اور بدلے اور ہر منظر نے تعمیر کوریا کا مظاہرہ کیا اور اقوال قائد کا
درس دیا۔ اس منظر کشی میں ایک بار کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ اس
قسم کے انتظامات چین و روس میں بھی ہیں اور بھٹو صاحب
نے بھی غالباً چین کی مدد سے پاکستان میں اس کی اچھی طرح
ڈال دی تھی مگر ان کے دور کے ختم ہونے کے بعد تربیت جوانان
کا سارا پروگرام ختم کر دیا گیا ہے۔ مگر آج کوریا میں اس منظر کشی
کو جس منزل پر پہنچا دیا گیا ہے وہ قابلِ تعریف و توصیف ہے۔
کوریائے شمالی کے دستور کی شق نمبر ۵۴ کی رُو سے یہاں مذہبی
آزادی حاصل ہے۔ مگر اس وقت تو مجھے کوریا میں سوائے "دینِ
کم ال سنگ" کے کوئی دوسرا مذہب دکھائی نہیں دیا ہے اور
مذہبی آزادی کا فائدہ اٹھانے والے یہاں نہیں ہیں۔ مجھے اس
قدر معلوم ہے کہ سفارت خانۂ پاکستان میں جمعہ کی نماز کا بند وبست
ہے، مگر میں اس سے بھی واقف ہوں کہ پاکستان کا خصوصی وفد
جمعہ کی نماز کے لیے سفارت پاکستان میں نہیں گیا۔ میرے پاس وہاں
چلے جانے کی کوئی صورت نہ تھی اور نہ مجھے جمعہ کی رات تک یہ
علم تھا کہ نماز جمعہ کا انتظام ہے۔ سفارت پاکستان کے ناظم الامور
شب و روز پاکستان کے سرکاری وفد کی تعظیم و تکریم میں مصروف ہیں۔
ان کو جمعہ سے فی الحال کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر وہ فرصت پاتے تو
مجھے اطلاع کر سکتے تھے اور میں سفارت پاکستان پہنچ جاتا۔
جنوبی کوریا میں مسلمان موجود ہیں اور وہاں ایک مسجد بھی
ہے، سیول میں۔ جنوبی کوریا میں مذہبی آزادی نسبتاً زیادہ ہوگی۔
وہاں امریکی استعمار و استبداد کا بازار گرم ہے اور امریکی مفاد میں
یہ ہے کہ ہر قسم کی آزادیاں دے اور جنوبی کوریا کا مزاج اس درجہ
"عاشقانہ" بنا دے کہ اس کا ذہن شمال کی طرف جا ہی نہ سکے۔
بارے اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس آ کر میں نے ظہر کی نماز اطمینان سے
ادا کر لی۔ آج شام کو کوئی پروگرام نہیں ہے۔ آج کے پروگرام کے ساتھ
تقریبات یوم پیدائش اختتام کو پہنچ گئی ہیں۔

دائرۂ طب و صحت، دائرۂ تعلیم و تربیت

۱۷ - اپریل ۱۹۸۲ء

تین دن کم ال سنگ برتھ ڈے تقریبات کے بعد آج سے میں نے اپنے مطالعاتی دورے کا آغاز کر دیا ہے - میں نے غور کر کے خود کو صرف دو دائروں میں رکھنے کا فیصلہ کیا ہے :

(الف) دائرۂ طب و صحت

(ب) دائرۂ تعلیم و تربیت

وزارتِ صحت شمالی کوریا کے پروٹو کول کو میں نے اپنی دل چسپی کے یہ حدود بتا دیے ہیں اور وہ اپنے انتظام کو ان دوائر سے ہم آہنگ کر لیں گے -

کراس ہسپتال

صبح سوا دس بجے جب میں سعدیہ کے ساتھ یہاں پہنچا تو پروفیسر لی جو سیوم نے ہسپتال کے بڑے دروازے پر ہمارا استقبال کیا جس میں خلوص کی چاشنی تھی اور محبت کی خوش بو - کانفرنس روم میں بڑی سادگی تھی جس سے دل بڑا خوش ہوا - کراس ہسپتال کی تعمیر میں ریڈ کراس کا تعاون شامل رہا ہے - پروفیسر سیوم نے بڑی تفصیل کے ساتھ مجھے کراس ہسپتال کے طریق عمل کے بارے میں بتایا - یہ ہسپتال تعمیر ہوا ، مگر دوران جنگ کوریا اس کو تہہ و بالا کر دیا گیا پھر از سر نو اس کو قائم کیا گیا تاکہ شمالی کوریا کو درپیش مسائلِ صحت کو حل کیا جا سکے - صدر کم ال سنگ نے جگہ کا انتخاب خود کیا اور اسی جگہ یہ قدیم ہسپتال پوری جدت طرازیوں کے ساتھ برسرِ عمل ہے - اس ہسپتال میں اس وقت ایک ہزار سات سو بستر ہیں - دو ہزار کارکن کام کر رہے ہیں جن میں چھے سو ڈاکٹر ہیں - یہ کراس ہسپتال ڈاکٹروں کی اعلا تعلیم کا مرکز بھی ہے اور اس میں طبّی تحقیق کے مراکز بھی قائم ہیں - عمارت گو قدیم ہے مگر یہاں صفائی ستھرائی قابل تعریف ہے -

درحقیقت ۱۷ سو بیڈس کے اس ہسپتال میں تمام اہم شعبے قائم ہیں کہ جو پوسٹ گریجویٹ تعلیم طب کے لیے اہم ضرورت کی حیثیت رکھتے ہیں۔میرے لیے واقعی یہ ممکن نہ تھا کہ میں اس ہسپتال کو از اوّل تا آخر دیکھتا اس لیے میں نے امراضِ جگر کا شعبہ دیکھنے کا فیصلہ کیا اور آخر میں طب مشرقی کے شعبے کو تفصیل کے ساتھ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔اس کے علاوہ چلتے چلاتے راہ میں جو شعبے پڑ جائیں ان پر ایک بس اچٹتی ہوئی نگاہ !

امراضِ جگر کے شعبے میں کافی مریض ہیں ، وہاں موجود ڈاکٹروں سے میں نے احتیاط کے ساتھ تبادلۂ خیال کیا مگر زبان کی دقت کی وجہ سے میں یہ معلوم نہ کر سکا کہ وہ یرقان کے علاج میں جدید اور مشرقی طب کا علاج کیا کرتے ہیں اور کیا دوائیں دیتے ہیں۔ اس وقت یہاں یرقان کا کوئی مریض تھا بھی نہیں۔ البتہ صفرِکبدی اور سرطانِ جگر کے مریض یہاں تھے اور ان کا علاج یہ اسٹیرائڈز سے کر رہے تھے۔

میں ہسپتال کے مختلف شعبوں سے گزرا۔شعبۂ امراضِ چشم میں میں نے زیادہ دل چسپی لی اس لیے کہ پاکستان میں یہی ایک شعبۂ طب و صحت ہے کہ جس سے زیادہ دل چسپی نہیں لی جاتی ہے۔شعبۂ امراضِ جگر کی طرح میں نے شعبۂ امراضِ چشم میں بھی یہ دیکھا کہ تشخیصی آلاتِ جدیدہ اس کثرت سے میسر ہیں کہ ہم پاکستان میں تو ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے،اور بڑی دل چسپ حقیقت یہ ہے کہ ان آلات کو پورے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ آلات شوق میں منگوا لیے اور نمائش کے طور پر ان کو لگا دیا۔

کر اس ہسپتال کے معائنہ کے آخر میں میں نے پوری دل چسپی کے ساتھ شعبۂ طبِ مشرقی کو تفصیل کے ساتھ دیکھا۔آؤٹ ڈور میں بکثرت مریض اور انڈور میں بھی میں نے کوئی خالی بیڈ نہیں دیکھا۔ میں نے دواؤں کا جائزہ لیا کہ جو زیادہ تر مفردات پر مشتمل ہیں۔ ان میں سے اکثر جڑی بوٹیوں کو پہچانتا ہوں اور بہت سی بوٹیاں ایسی ہیں کہ جو فقط کوریا میں پیدا ہوتی ہیں۔ایک قابلِ توجہ

چیز یہ ہے کہ طبِ مغربی اور طبِ مشرقی میں یہاں امتیاز نہیں ہے، دونوں کو مساوی مقام حاصل ہے اور مریض کے مزاج و پسند کا احترام کیا جاتا ہے، اور معالجے میں اس کو حسب خواہش اور حسب ضرورت سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں۔ شعبۂ طبِ مشرقی میں تشخیصی آلات وافر تعداد میں مہیا کیے گئے ہیں اور امتحاناتِ خون وغیرہ کی لیبوریٹریاں بھی موجود ہیں۔

ہر شعبے کی طرح یہاں بھی اقوالِ صدر کم ال سنگ کو اہمیت حاصل ہے۔ طب مشرقی کے بارے میں صدر کم ال سنگ کے واضح احکامات ہیں کہ اس کو پوری اہمیت دی جائے اور تحقیقاتِ جدیدہ سے اس طب کو جدید طب کے مساوی کرنے کی جدوجہد کی جائے۔ صدرِ اسلامی جُمہوریہ پاکستان نے بھی ایسے ہی واضح احکامات دیے ہیں مگر ان میں سے کسی ایک پر آج تک عمل نہیں ہو سکا ہے۔ کم ال سنگ کے احکامات پر فکر و روح کے ساتھ عمل ہوتا ہے۔

تبدیلئ مکان

ہم سرکاری مہمان کی حیثیت سے یہاں اسٹیٹ گسٹ ہاؤس میں ٹھہرائے گئے ہیں، مگر اب ہمارے تمام کے تمام پروگرام شہر سے متعلق ہیں۔ شہر سے گیسٹ ہاؤس کا راستہ ۴۵ منٹ کا ہے۔ اگر ہم روزانہ صبح گئے، دن کو واپس آئے اور سہ پہر کو پھر گئے اور رات کو واپس ائے تو روزانہ تین گھنٹے سفر کے لیے درکار ہیں۔ یہ صحیح بات نہیں ہے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ یا تو ہم سفیرِ پاکستان کے مکان چلے جائیں کہ جو ہنوز خالی ہے یا پھر ہمارا انتظام کسی ہوٹل میں کر دیا جائے۔

اطلاع ملی ہے کہ ہمارا انتظام ہوٹل میں کرا دیا گیا ہے۔ ہوٹل کا نام ہے پتنگ یانگ ہوٹل۔ وزارتِ صحت نے اس کی اجازت نہیں دی ہے کہ ہم سفیرِ پاکستان کے ہاں جائیں۔ وہ ہمیں حکومت کوریا کا مہمان رکھنا چاہتے ہیں۔

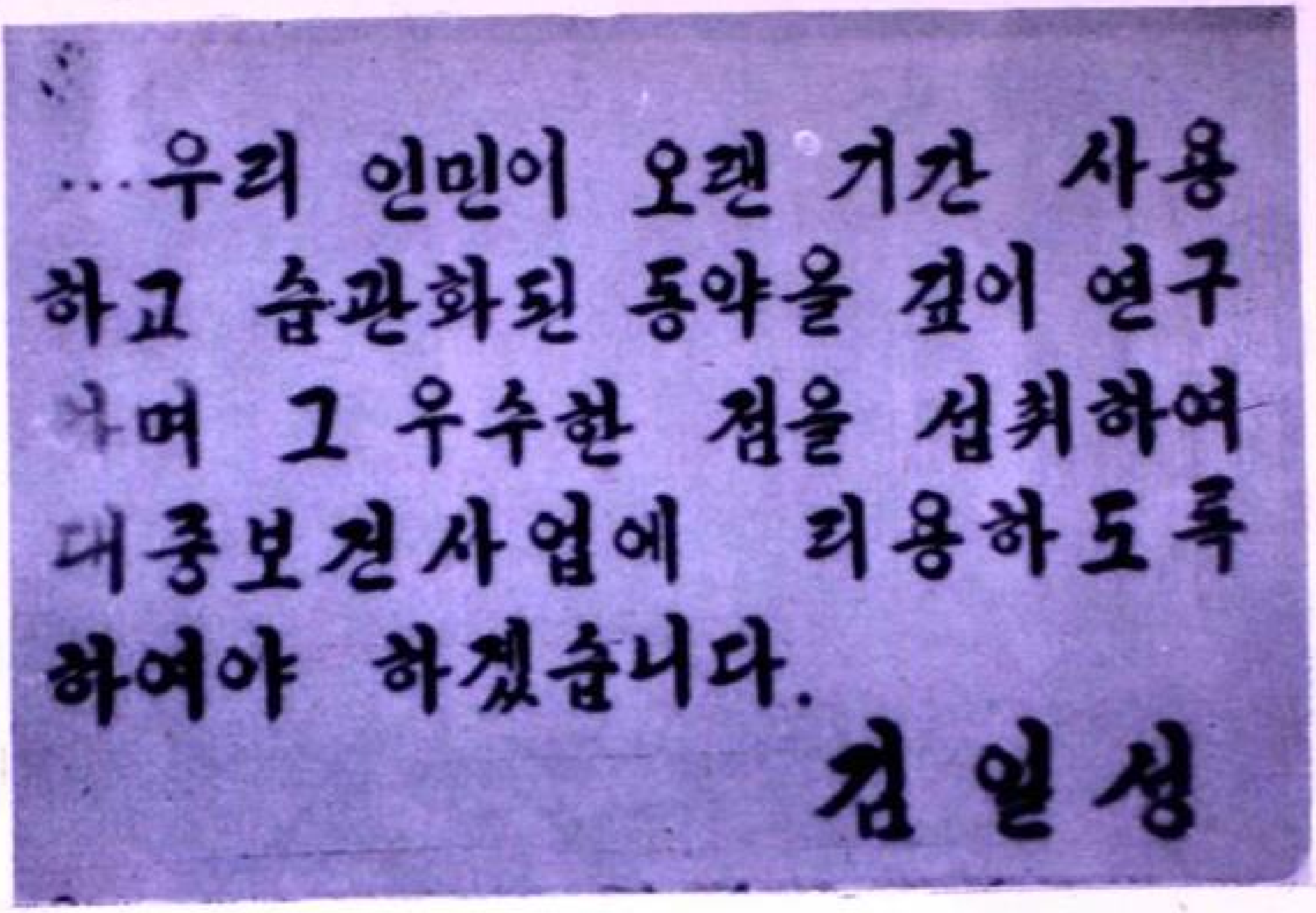
چانگ وانگ ہیلتھ کمپلیکس

میں نے چاہا تھا کہ میں ایک مرکز دیکھ لوں کہ جہاں ہیلتھ سروسز کا نظام چلتا ہے یا ہیلتھ کیئر سسٹم کی بنیاد جہاں ہو۔ مگر سہ پہر ہم جو ہیلتھ کمپلیکس دیکھنے گئے وہ تو عجیب وغریب شے نکلا۔ یہ تو ایک ہیلتھ کلب ہے۔ اس میں غسل کے علاج کے بے اندازہ کمرے ہیں اور سونا باتھ کے مراکز ہیں اور سویمنگ پُول ہیں۔ مالش وغیرہ کے شعبے ہیں، بال کٹوانے کے لیے شاندار سیلون ہیں وغیرہ وغیرہ۔ گویا وہ چیز نہیں کہ جو میرا مقصود تھی مگر ایک ایسی چیز دیکھی کہ جس کا تصور تک نہ تھا۔

ایسی شاندار عمارت اور ایسا بے نظیر اندازِ تعمیر اور ایسا نفیس وجدید ساز و سامان میں نے پہلے کبھی دیکھا نہ سنا۔ اس ہیلتھ کلب کو بھی ان کوریاؤں نے عظیم بنا دیا ہے۔ گریٹ لیڈر ان کی پسندیدہ اصطلاح ہے۔ اس کی وجہ سے ان کے ہاں ہر چیز گریٹ ہی ہے۔ یہاں سویمنگ پُول بین الاقوامی سائز کا ہے اور اس میں مقابلے دیکھنے کے لیے چھے ہزار لوگوں کے بیٹھنے کی گنجائش ہے۔ زنانہ و مردانہ باربر شاپ کا سازو سامان کیا بتاؤں، میں نے کبھی ایسا سامان دیکھا تھا اور نہ اس کا تصور کیا تھا!

آئس اسکیٹنگ رنک

عظیم الشان عمارتوں کے درمیان ایک عظیم تر اور خوب صورت عمارت اس طرح ایستادہ ہے کہ جیسے ناشپاتی کو الٹا کر کے رکھ دیا گیا ہو! معلوم ہوا کہ یہ آئس اسکیٹنگ رنک ہے۔ یعنی برف پر پہیوں کو پہن کر دوڑنا یا رقص کرنا۔ یاد آتا ہے کہ دہلی میں شاید ۱۹۲۶ میں ایسا ایک امریکی یا برطانوی کھیلوں کا طائفہ آیا تھا اور ان کے کارناموں میں ایک آئس اسکیٹنگ رنک بھی تھا۔ یہ رنک انہوں نے دلی میں قائم کیا تھا اور برف جما کر اس پر رقص کا مظاہرہ کیا تھا۔ ہم زبردستی استاذیٔ محترم حضرت مولانا قاضی سجاد حسین صاحب کو وہاں لے گئے تھے۔ کیا معلوم تھا کہ یہاں باغ و بہار



"طبِ مشرقی ہمارا معروف طریقِ علاج ہے جس سے اہلِ کوریا زمانۂ قدیم سے مستفید ہوتے رہے ہیں۔ اس طریقِ علاج میں تحقیق کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے اور اس کا صحت کے ساتھ استعمال کرنا چاہیے"۔ کم اِل سنگ

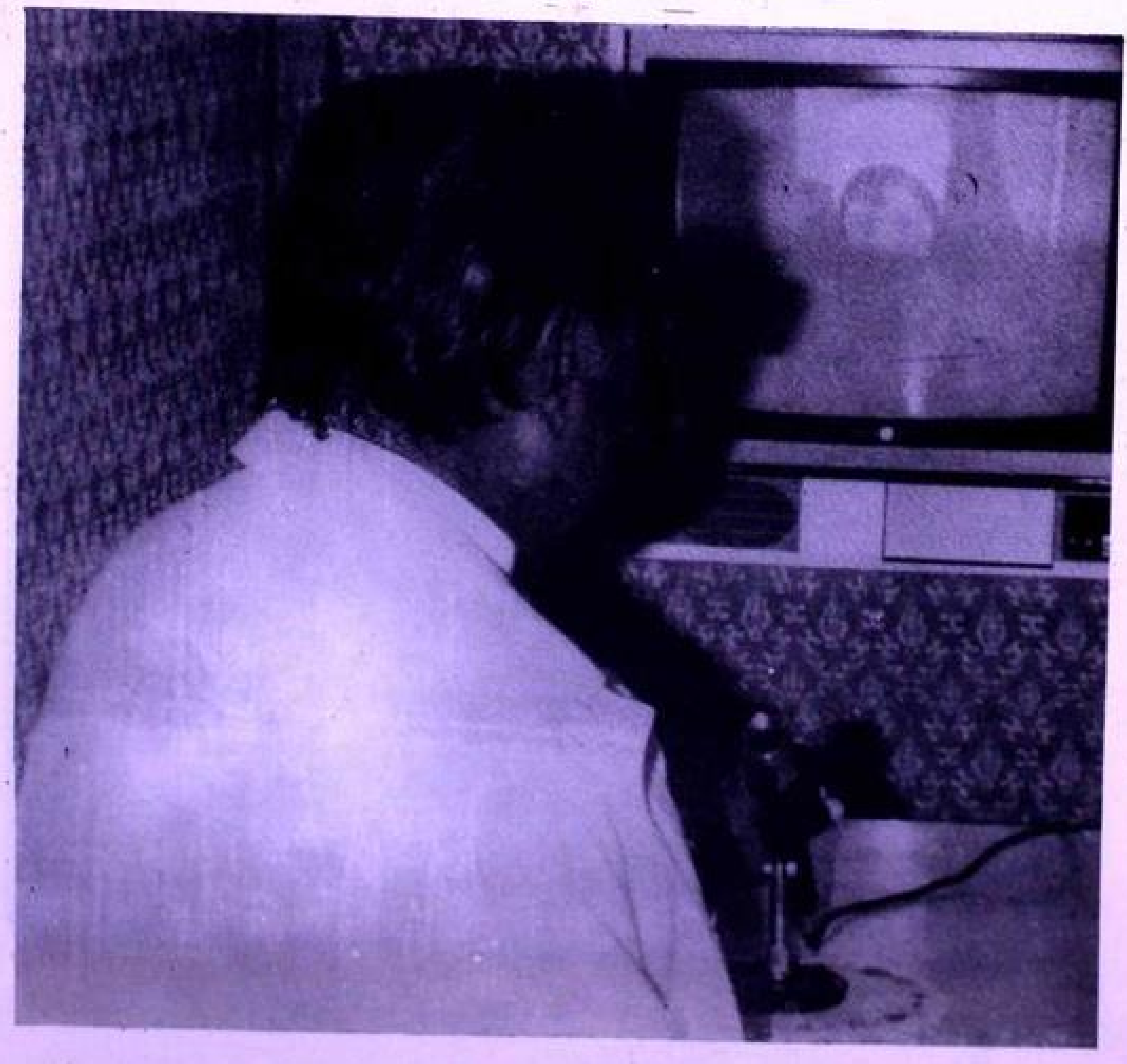


وزیرِ صحت شمالی کوریا ہز ایکسی لنسی ڈاکٹر پاک میونگ بن



مصنف، مادام کم ینگ شک کے ساتھ

ٹیلے وژن پر نرس اور زچّہ سے مصنف کی گفت گو





طبِ مشرقی کی دواسازی کا شعبہ میٹرنٹی ہسپتال میں

شعبۂ طبِ مشرق کے لیے باثالوجی امتحانات کی سہولتیں

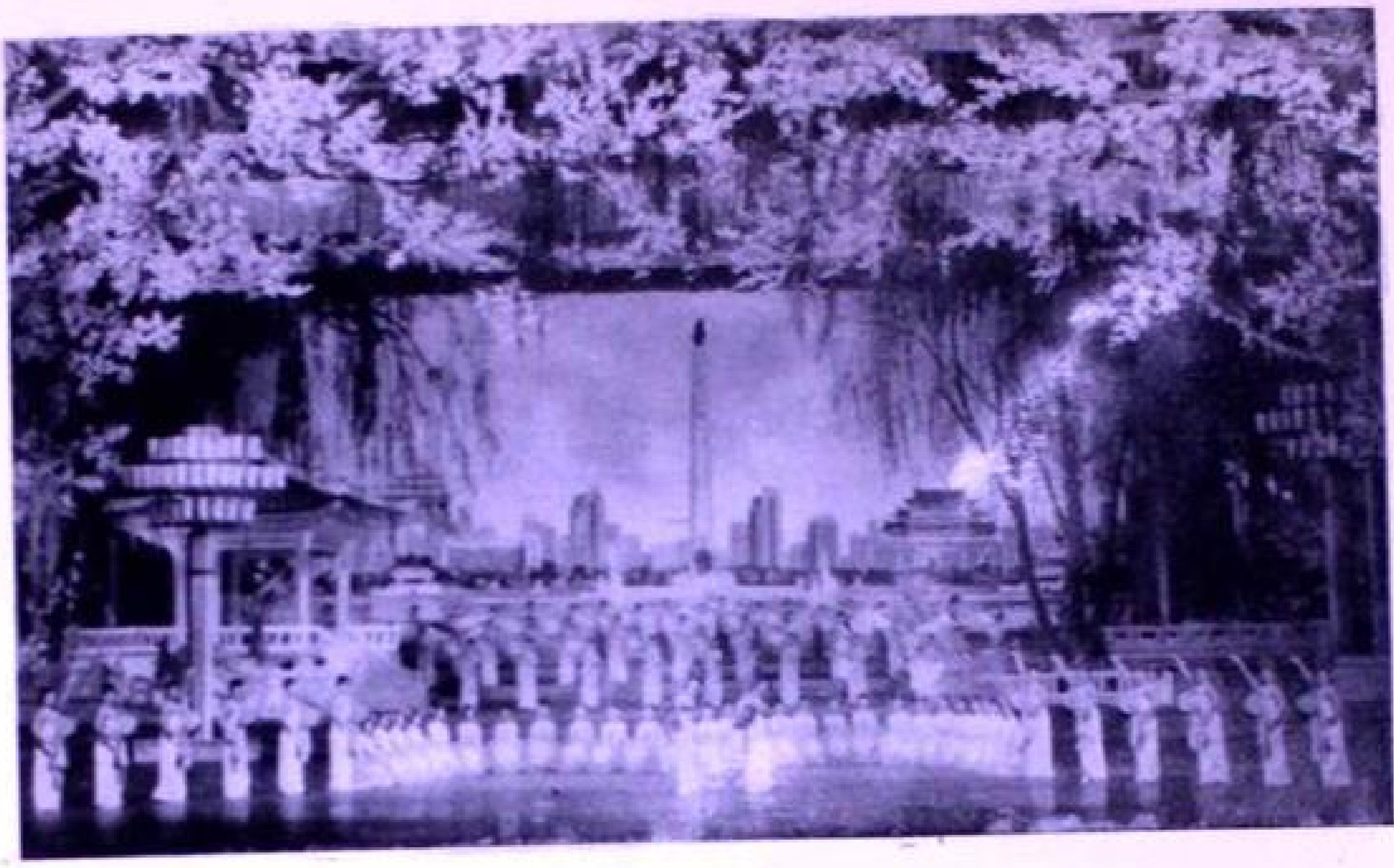




توسِ فتح ونصرت جو یادگار ہے اس مقام کی کہ جہاں سے آزادیٔ کوریا کی جد وجہد کا آغاز ہوا تھا۔

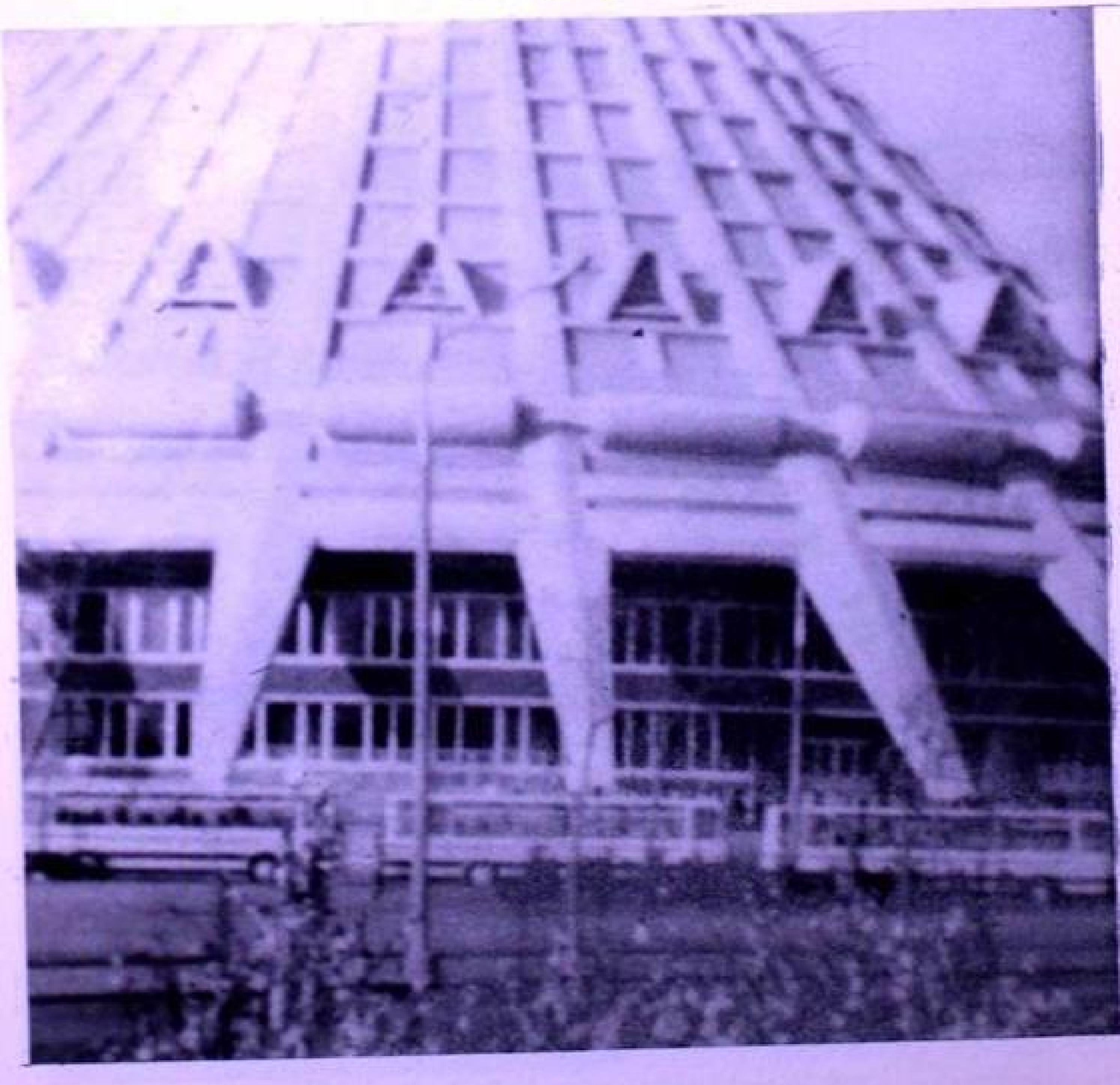
جوچے مینار۔ فکری و سیاسی آزادی کے لیے ایک درسِ دائمی

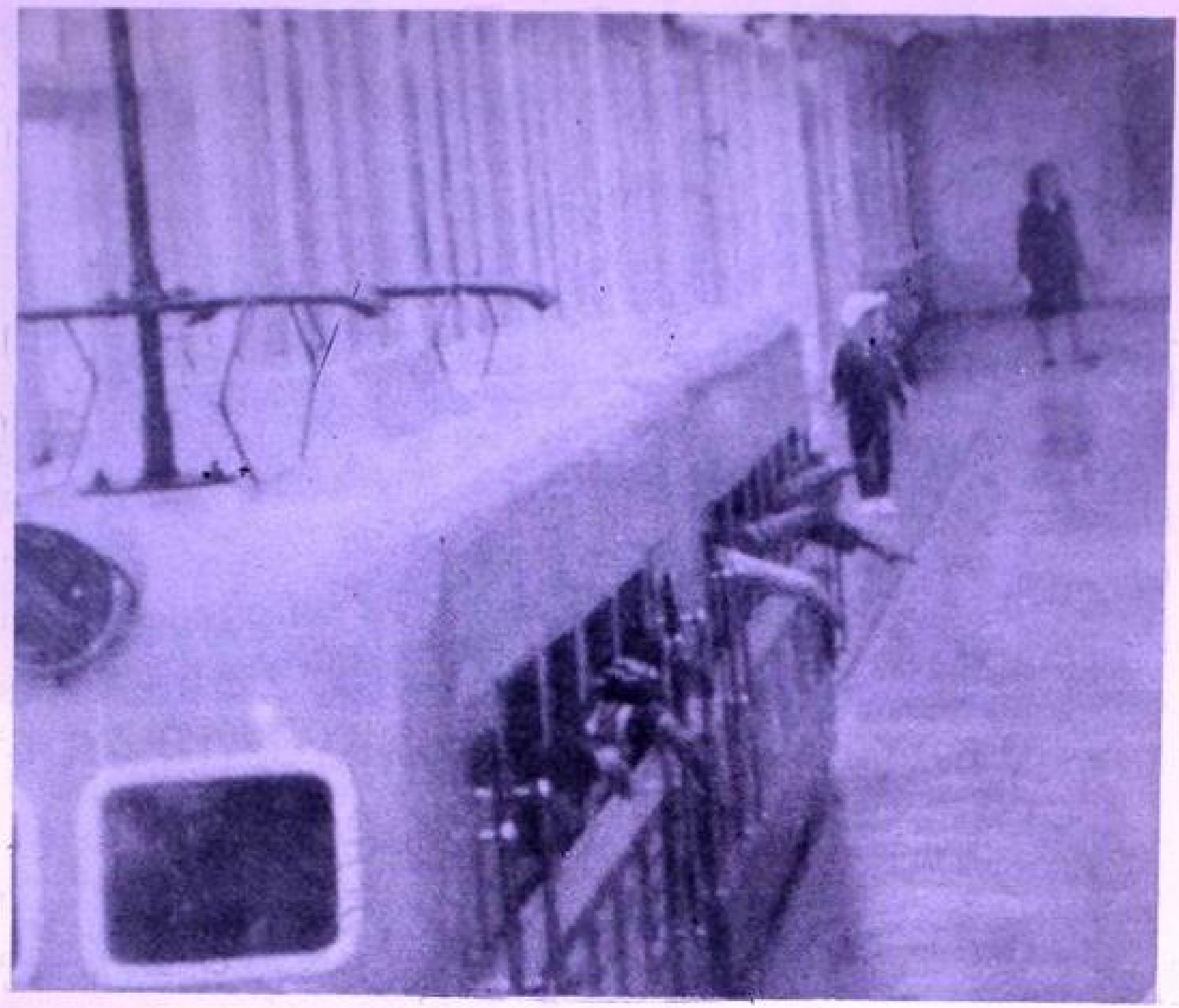




غنائے عوام در مدح قائد

آئس اسکیٹنگ رِنگ





ریل کا سفر

باسکٹ بال





رولر کوسٹر۔ گولائی میں مسافر سر نیچے پیر اوپر

انواع و اقسام کے کھیلوں کی دل چسپیاں



مصنف۔ نشانہ بازی





مصنف جامعہ کم اِل سنگ کے کمپیوٹر ڈویژن میں

مصنّف نیشنل لائبریری میں





مصنّف اور سعدیہ حاسن پرائمری اسکول میں

مصنّف پیونگ یانگ میٹرو (زمین دوز ریلوے) کے اسٹیشن پر





کم ال سنگ اسٹیڈیم میں ساٹھ ہزار بچوں کا مظاہرہ قائدِ عظیم و جمال حبِ وطن

سنوفر ، سعدیہ راشد ، مادام کوانسل (گائڈ) ، مترجم



لڑکیاں ہوں گی کہ جو برف پر خاص قسم کے جوتے پہن کر دوڑیں گی اور مظاہرۂ رقص کریں گی۔ مولانا صاحب اور یہ رقص! وہ اپنی اس "حرکت" اور شرکت پر انتہا درجہ خجالت محسوس کرتے رہے۔ بے چین ہو ہو کر فرماتے رہے: "میاں سعید! لوگ میرے بارے میں کیا کہیں گے، تم نے تو آج لٹیا ہی میری ڈبو دی ہے —" اس کے باوجود فرمایا" — ہاں ایک بات ہے، زندگی کا بڑا دلچسپ تجربہ ہوا ہے! حیرت ہے کہ یہ تتلیاں پیروں پر پہیے لگا کر برف پر کیسے ناچتی ہیں! اچھا ہوا یہ تجربہ ہو گیا!"

سعد یہ اور میں اندر گئے تو بڑی عریض و طویل عمارت، بڑی حسین و جمیل، آرائش بے مثل، رونق ایسی کہ باید و شاید۔ ایک عرصہ ہوا جناب محترم اصطفےٰ خان صاحب کا شہرہ تھا کہ وہ یا تو ملتے ہیں مدینہ منورہ میں یا ان کو پیرس میں دیکھا جاتا ہے۔ ہندستان جب آتے وہ مصوری پہاڑ ضرور جاتے جہاں اسکیٹنگ رنک تھا اور اصطفےٰ خان صاحب اپنی بزرگی و عظمت کے ساتھ اسکیٹنگ میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ وہ دو فیٹ قطر کی میز پر دائرے میں اسکیٹنگ کر سکتے تھے! آج برف پر نہایت کم عمر بچوں اور بچیوں کے دُھن پر رقص کے کمالات نے ہمیں اور دوسرے حاضرین کو محظوظ کیا۔ ان کی رفتار و رقص کو دیکھ کر واقعی حیرت ہوئی اور بے اختیار داد دی۔ ٹیلے وژن والے اور پریس کے لوگ اب مسلسل میرے ساتھ ہیں۔ انہوں نے ہماری دیدِ رقص کی فلم تیار کر لی اور بعد میں رات اسے ٹیلے وژن پر دکھا دیا۔

آئس ہاکی ایک اور دلچسپ پروگرام تھا۔ اسی آئس رنک پر ہاکی کا میچ ہوا۔ بڑا ہی خطرناک ہے۔ کھیلنے والے بُری طرح گرتے ہیں مگر وہ اپنے جسم کے ارد گرد اس طرح پیڈ وغیرہ باندھتے ہیں کہ گرنے پر چوٹ نہیں لگتی۔ میں نے بڑی دلچسپی کے ساتھ اس کھیل کو دیکھا۔

اظہارِ ناپسند

آج ہمیں اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس چھوڑ کر ہوٹل آنا تھا۔ پروگرام

طے کیا کہ ہم ساڑھے آٹھ بجے کھانے پر آئیں گے اور پھر ۹ بجے روانہ ہو جائیں گے - میری گائڈ اور ترجمان دونوں غائب ہو گئے اور مجھے موٹر میں ایک گھنٹہ ان کا انتظار کرنا پڑا - مجھے یہ بات ناگوار ہوئی اور میں نے ترجمان سے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا ، بے چارہ طالب علم ہے ، کپکپا گیا - میں نے اس کو تاآمد ہوٹل اسی حال میں رکھا ، مگر ہوٹل آکر میں نے اسے گلے لگا لیا اور پیار سے سمجھا دیا کہ ہمیں پروگرام کا صحیح علم صحیح وقت پر ہونا چاہیے - شارٹ نوٹس پر میں اب کبھی تیار نہیں ہوں گا - کے آئی ایم نے میرے مزاج کو سمجھ لیا ہے -

ہوٹل پتنگنگ

یہاں ہر چیز بڑی بنانے کا رواج ہے - اب اس ہوٹل میں داخل ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی شاہی محل میں داخل ہو رہے ہیں - چھتیں ہیں کہ آسمان سے باتیں کر رہی ہیں - مجھے کمرہ ۱۸۷ دیا گیا - میں نے جب اس کمرے کا جائزہ لیا تو میرا تو دل دہل گیا - اتنے بڑے کمرے ہیں کہ وحشت ہوتی ہے - ایک بیڈ روم ، ایک مطالعے کا کمرہ ، ایک گول کمرہ (سٹنگ روم) ایک ڈائننگ روم ، ایک کچن ، ایک گیلری اور باتھ روم اتنا بڑا ہے کہ اس میں دو پلنگ سما جائیں !

میں نے اصرار کیا کہ میری ضرورت سے یہ کمرہ بہت بڑا ہے اور یہ کہ مجھے اس میں تکلیف ہوگی - مجھے دوسرا چھوٹا کمرہ دید یجیے - مگر یہ لوگ کسی طرح مان کر نہیں دیے - بالآخر میں نے اسے قبول کر لیا اور سعدیہ کو اپنے ساتھ کر لیا اور ان کا کمرہ چھوڑ دیا -

۱۸ - اپریل ۱۹۸۴ء - اتوار

مانگ یونگ دائی
صدر کم ال سنگ کا آبائی گھر
کوریائی عوام کا روحانی مولد

دارالحکومت پیونگ یانگ سے جانب جنوب مغرب بارہ کلو میٹر

کے فاصلے پر مانگ یانگ دائی واقع ہے۔ صدر کم ال سنگ یہیں ایک غریب کسان گھرانے میں پیدا ہوئے اور یہیں انھوں نے اپنا بچپن گزارا۔ یہ گھرانہ عسرت و تنگ دستی کے باوجود کئی نسلوں سے ایک انقلابی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اسی لیے کوریا کے عوام اس گھر کو کوریائی انقلاب کا گہوارہ اور اپنا رُوحانی مولد قرار دیتے ہیں۔ میں نے مقررہ رہنما خاتون کی زبانی بڑی توجہ سے اس مناسبت کی توجیہ سُنی اور تصور کی آنکھ سے ماضی کی جھلک دیکھی۔

مانگ یونگ دائی کی اس جائے انقلاب پر میرے لیے خصوصیت کے ساتھ مامور ایک ذمہ دار کارکن اور ایک گائڈ نے بڑی گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا اور ہمیں صدر کم ال سنگ کا وہ آبائی گھر جس کی چھت گھاس پھونس کے چھپّر کی ہے تمام تفصیلات بیان کرتے ہوئے دکھایا۔ یہاں کی ہر شے کو اصل حالت میں محفوظ کر لیا گیا ہے۔ اس موقع پر میں نے خود اپنا کیمرہ استعمال کیا۔ اس کے علاوہ یہاں سرکاری کیمرہ مین اور ٹیلے وژن کے نمائندگان بھی موجود و مستعد تھے۔ بہ ایں ہمہ میرے ساتھ خصوصیت یہ بھی برتی گئی کہ میری موٹر کار کے ساتھ ذرائع ابلاغ کے نمائندگان بھی چلتے تھے اور میرے تاثرات رکارڈ کرتے تھے۔ سعدیہ اور میں نے یہاں جنم بھومی پر کافی وقت گزارا اور بڑی دلچسپی کے ساتھ ہر چیز کو دیکھا۔ اس کے بعد ہم مانگ یونگ پہاڑی پر چڑھ گئے۔ اسی پہاڑی پر اپنی سر زمین کے نظاروں سے سرشار ہوتے ہوئے صدر اپنے والدِ بزرگوار سے حب الوطنی کا درس لیا کرتے ہوں گے۔

ہم نے آخر میں مانگ یونگ دائی کے انقلابی عجائب گھر کا بھی معائنہ کیا جہاں صدر کے اُن اہل خاندان کی تاریخی جد وجہد کا پتہ ملتا ہے جنھوں نے تن من دھن سے کوریائی انقلاب کی جنگ لڑی تھی۔

آج اتوار ہے اور ہم نے یہ دیکھا کہ اسکول کے طلبہ و طالبات اپنے اساتذہ کے ساتھ بہ تعداد کثیر یہاں موجود ہیں۔ عجائب گھر میں داخلے سے پہلے ان کو بذریعۂ لیکچرز حالات بتائے جاتے ہیں اور پھر جب وہ عجائب گھر کو دیکھتے ہیں تو ہر چیز ان کے

ذہن نشین ہو جاتی ہے ۔

اہل کوریا کے نزدیک مانگ یونگ دائی میں گھاس کے چھپر کا یہ گھر تمام مقامات سے زیادہ قابل قدر اور لائق احترام ہے اور ہم جیسے مہمان بھی اس مقام کو ایسا ہی احترام دیتے ہیں۔ مانگ یونگ دائی ایک نظر افروز مقام ہے جسے اپنے حسین پہاڑوں اور صاف و شفاف پانی پر بجا فخر ہے۔ اسی خوبی کی بنا پر پرانے وقتوں میں پیونگ یانگ کے جاگیرداروں نے اس جگہ کا انتخاب اپنے آباواجداد کو دفنانے کے لیے کیا تھا۔ صدر کے پردادا سو سال قبل نامساعد حالات سے تنگ آ کر خاندان سمیت نقل مکانی کر کے یہاں مانگ یونگ دائی میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ ایک جھونپڑے میں رہائش اختیار کی اور ایک جاگیردار کی خاندانی قبروں کی دیکھ بھال کرنے لگے ۔ یہ خاندان نسل در نسل اسی کٹیا میں مقیم رہا جس کی چھت بہت نیچی اور گھاس پھونس کی بنی ہوئی تھی ۔ اسی کٹیا میں ۱۰/ اپریل ۱۹۱۲ء کو صدر کم ال سنگ پیدا ہوئے ۔ صدر کا یہ آبائی گھر رہائشی کوٹھڑیوں ، گایوں کے باڑے اور ایک صحن پر مشتمل ہے۔ یہاں وہ سارا سامان جوں کا توں محفوظ کر دیا گیا ہے جسے اس خاندان کی تین نسلیں استعمال کرتی رہی ہیں ۔ مثلاً پائپ ، ایش ٹرے ، چھڑی ، لکھنے کا نیچا سا ڈیسک ، پتھر کا قلمدان ، کتابوں کی الماری ، باورچی خانے کے برتن ، کھیتی باڑی کا سامان ، ایک چٹائی جو صدر کے دادا کے زیر استعمال رہی ، کھڈی ، چرخہ اور مرتبان وغیرہ ، ہر شے غربت و فلاکت کا منھ بولتا نمونہ ہے۔ مرتبان بد رنگ ہو چکے ہیں۔ ایک بے ڈول و بد ہئیت مرتبان ہر کسی کی توجہ کا مرکز بنتا ہے ۔ یہ نقص والا مرتبان صدر کی دادی نے اس لیے خرید لیا تھا کہ اچھے مرتبان اس کی استطاعت سے باہر تھے اور یہ بہت سستا مل گیا تھا۔ دادی نے وہ وقت یاد کر کے بہ حسرت و یاس کہا ، " اس مرتبان کو کوئی ہاتھ تک لگانا پسند نہیں کرتا تھا ۔ جب میں نے اسے خرید لیا تو لوگ میری پسند پر ٹھٹھا مار کر ہنس پڑے اور میں اپنی کم مائیگی پر آنسو پی کر رہ گئی ۔"

صدر کے چچا نے اپنی یادداشت یوں بیان کی ، "ہمارا کنبہ

کھیتی باڑی کرتا تھا مگر خون پسینہ ایک کر دینے کے باوجود ہم اکثر بھوکے رہتے تھے - مجھے یاد ہے کہ جب میں بہت چھوٹا تھا اور ہمارے گھر مہمان آ جاتے تو دادی پریشان ہو جاتی تھیں کہ انہیں کہاں سے کھلائیں گی -"

ایسی کٹھن زندگی پر مستزاد جاپانی پولیس کا تشدد اور مسلح دستوں کا ظلم و ستم بھی سہنا پڑتا تھا - ان حالات میں صدر کے اجداد یہ آس لگائے ہوئے تھے کہ ان کے بیٹوں اور بہو نے جو اپنی زندگی وطن عزیز کی آزادی کے لیے وقف کر چکے ہیں ان کے صدقے میں اور ان کا پوتا جو دل میں آزادی کی تڑپ اور سینے میں سلگتی آرزوئیں لیے کوہ پیک دوسان کے صحراؤں میں جارحیت کی سرکوبی میں مصروف ہے اس کے طفیل یقیناً وطن میں آزادی کا سورج طلوع ہو کر رہے گا - صرف یہی ایک تمنائے عروج تھی جسے اس خاندان نے نسلاً بعد نسل شمع آرزو بنا کر سینوں میں جلائے رکھا اور بالآخر سحر کا اجالا دیکھنے میں کامیاب ہوئے -

صدر کم ال سنگ نے عزم صمیم کر لیا تھا کہ جب تک کوریا آزاد نہیں ہوجاتا وہ غلام ملک میں واپس اپنے گھر ہرگز نہیں جائیں گے - صرف تیرہ برس کی عمر میں انہوں نے مانگ یونگ دائی کو خیر باد کہا اور شاہراہِ انقلاب پر گامزن ہو گئے - پھر بیس سال کی طویل غریب الوطنی کے بعد اپنے عہد کے مطابق کوریا کو آزادی دلا کر ہی واپس گھر لوٹے -

لہذا یہ حقیقت بلا تامل تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ آج کوریا میں جو درخشاں خوشحالی نظر آتی ہے وہ اسی گھاس پھونس کی کٹیا کی مرہونِ منت ہے - اور یہی وجہ ہے کہ کوریائی عوام کے نزدیک جو وقعت اور قدر و منزلت اس آبائی گھر کو حاصل ہے وہ کسی اور عالیشان سے عالی شان جگہ کی بھی نہیں ہو سکتی - وہ بجا طور پر اسے اپنا روحانی مولد قرار دیتے ہیں -

قومی آزادی کی قسم
جو مانگ یونگ پہاڑی پر کھائی گئی

اس آبائی گھر کے عقب میں ایک چھدرے جنگل کی پہاڑی ہے۔ یہاں قدم رکھتے ہی جھینگروں کی سریلی آواز ایسے سنائی دیتی ہے جیسے وہ ہماری آمد پر خوش ہو کر خیر مقدمی نغمہ الاپ رہے ہوں۔ پہاڑی کی چوٹی پر کھیل کا میدان ہے۔ یہاں کھڑے ہو کر ارد گرد نظر ڈالیں تو حسین مناظر کی بوقلمونی کا عجب سحر انگیز سماں نظر آتا ہے۔ دریائے تائے ڈونگ گینگ فراز کوہ سے پیچ و خم کھاتا نشیب کی طرف رواں دکھائی دیتا ہے۔ دریا کے ساتھ ساتھ ریل کی پٹری چلی گئی ہے۔ دریا کے بالائی حصے کی طرف پیونگ یانگ شہر اور جدید کارخانوں کا دُور تک پھیلا ہوا سلسلہ نظر آتا ہے۔ ان سے بھی آگے بہت دور جہاں یہ دریا مغربی سمندر میں جا گرتا ہے دریا کے دہانے پر آباد نامپو کا شہر بھی دھندلا دکھائی دیتا ہے۔ ایک طرف درختوں کی شاخوں میں سے مانگ یونگ دائی کے نو تعمیر شدہ انقلابی اسکول کی جھلک نظر نواز ہوتی ہے۔ یہ چشم طائر کی مانند دلفریب و خوشنما ارضی نظارے دکھاتی ہے اور اسی صفت کی بنا پر اسے مانگ یونگ دائی پہاڑی (یعنی سب کچھ دیکھنے والی پہاڑی) کا نام دیا گیا ہے۔

اپنے وطن کے ان حسین و جمیل مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ہی صدر کے والد نے ان کے قلب میں وطن سے محبت کی روح پھونکی ہوگی۔ اور ان کے ذہن میں وطن کی آزادی کے لیے چی ون کے نظریے (یعنی جواں عزم) کا بیج بویا ہوگا۔ انہوں نے وطن سے محروم قوم کے جاں سوز درد و کرب کو محسوس کیا ہوگا۔ اپنے دادا کی یاد آئی ہوگی جنہوں نے امریکی جارحیت کو کچلنے کے لیے جواں مردی سے لڑتے ہوئے جان دے دی تھی۔

صدر کم ال سنگ نے مانگ یونگ دائی میں اپنا بچپن آزادی کے تصورات و خیالات میں گم رہ کر گزارا۔ صدر کے لیے مانگ یونگ دائی معنوی لحاظ سے پورے ملک کی ایک علامت تھا۔ وہ جاپان کے خلاف

مسلح جدوجہد کے دنوں میں اکثر گوریلوں سے مانگ یونگ دائی کا ذکر کیا کرتے -اور بڑے جوش و جذبہ سے بتایا کرتے کہ کوریا کا آزاد ہو جانا مقدر ہو چکا ہے اور اس کا مستقبل بے حد درخشاں ہے۔ ملک سے بے پناہ محبت کے جذبے سے سرشار اور اپنے محبوب مانگ یونگ دائی پہنچنے کی آرزو میں بے چین صدر کم ال سنگ نے ایک غیر ملکی سرزمین پر کوریائی عوام کی آزادی اور ملک کو غلامی سے نجات دلانے کی خاطر جاپان کے خلاف ایک بہادرانہ مسلح جدوجہد کا آغاز کیا اور ایک پیہم جواں جذبۂ جنگ کا مظاہرہ کیا۔ ہاں واقعی یہ مانگ یونگ دائی پہاڑی ہی تھی جہاں ان میں ایسی روح پروان چڑھی کہ انہوں نے جرات و فراست سے کام لے کر اپنے آباو اجداد کی عظیم آرزوؤں کو شرمندۂ تکمیل کر دکھایا۔

مانگ یونگ دائی کا انقلابی عجائب گھر
جو کامران انقلابی خاندان کی تاریخ سے روشناس کراتا ہے

۱۹۷۰ء میں صدر کم ال سنگ کی اٹھاونویں سالگرہ کی تقریب کے موقع پر ان کے آبائی گھر کے قریب مانگ یونگ دائی انقلابی عجائب گھر قائم کیا گیا تھا۔ایک چٹان کے آغوش میں واقع یہ عجائب گھر صرف ایک منزلہ عمارت ہے جس میں چھے کمرے ہیں۔یہاں کوریائی عوام کو اس انقلابی خاندان کی روایات ، کارہائے نمایاں اور اوصاف کے بارے میں معلومات فراہم ہوتی ہیں جس نے اپنا تن من دھن سب کچھ وطن کی آزادی کے لیے وقف کر دیا تھا۔

پہلے کمرے میں صدر اور ان کے والد کے پلاسٹر کے بڑے بڑے مجسمے ایستادہ ہیں۔ایک قد آور تصویر میں ان کے والد بیٹھے اور ان کے پیچھے صدر کھڑے ہیں۔ یہ تصویر کشی یاد دلاتی ہے کہ باپ نے بیٹے کو تلقین کی تھی چاہیے نسلیں اس جدوجہد میں گزر جائیں لیکن انجام کار وطن کو آزادی دلا کر ہی دم لینا ہے۔ دوسرے کمرے میں مانگ یونگ دائی کا موڈل رکھا ہوا ہے جہاں صدر کا بچپن گزرا تھا۔

اس کمرے اور دوسرے کمروں میں تصویروں اور دیگر ذرائع سے

صدر کے خاندان کی تاریخ بیان ہوتی ہے۔اس کا آغاز ان کے پردادا کم انگ یو کی مجاہدانہ تاریخ جدوجہد سے ہوتا ہے جنہوں نے امریکی قزاقوں کا بحری جہاز جنرل شرمن جو ۱۸۶۶ء میں دریائے تائے ڈونگ گینگ کے راستے کوریا پر چڑھائی کرنے آیا تھا جلا ڈالا تھا۔

صدر کے داد اکم بوہیون نے اپنے بیٹوں اور پوتوں کو انقلاب کی راہ پر روانہ کر دیا تھا تاکہ وہ دشمن کے خلاف آخری دم تک جنگ لڑتے رہیں اور خود کھیتی باڑی میں مصروف رہے، حتیٰ کہ ۱۹۵۵ء میں بعمر چوراسی سال انتقال کیا۔ان کی دادی لی یواک میں جنہیں جاپانی زبردستی اٹھا کر شمالی کوریا اور منچوریا کے علاقوں میں لے گئے اور سولہ مہینوں تک اس خیال سے انہیں قید وبند کی صعوبتوں میں مبتلا رکھا کہ اس طرح کم ال سنگ خود کو دشمنوں کے سامنے پیش کر دیں گے، مگر دادی نے تمام مصائب و مظالم کا بڑی جی داری سے مقابلہ کیا اور انہیں نفرت سے للکار کر کہا، "تم کمینے کتے ہو۔ہڈی کے لالچ میں اپنے ملک اور عوام سے غداری کر رہے ہو۔دولت کی ہوس نے تمہیں اندھا کر دیا ہے۔یاد رکھو آزادی بیچ کر تم کبھی بھی باعزت زندگی بسر نہیں کر سکتے"۔آزادی کے بعد انہوں نے اپنے شوہر کم بوہیون کے ساتھ مل کر مانگ یونگ دائی میں شاندار کام انجام دیے اور ۱۹۵۵ء میں جب ان کی عمر تراسی برس تھی وہ اس دار فانی سے کوچ کر گئیں۔

صدر کے والد کم ہیونگ جک ایک استاد تھے، ایک انقلابی جنگجو جنہوں نے اپنی ساری زندگی کوریا کی خود مختاری، آزادی اور غلامی سے نجات حاصل کرنے کی جدوجہد کے لیے وقف کر رکھی تھی۔وہ تحریکِ قومی آزادی کے رہنما تھے۔انہوں نے کوریائی قومی انجمن تشکیل دی جو جاپانیوں کے خلاف ایک زیر زمین تنظیم تھی۔چی ون (یعنی جواں عزم) کی ایک فکر بھی مرتب کی جو دور رس نتائج پر مبنی قومی آزادی کی حامل تھی۔انہوں نے بے شمار نظمیں لکھیں اور مزدور طبقے کی تعلیم و تربیت کے لیے شدومد سے کوشاں رہے۔

ان کی ایک نظم ہے:

"کامریڈ! کیا تم واقف ہو

صنوبر کے اس سوسبز درخت سے جو نام سان کی پہاڑی پر
تنہا کھڑا ہے ؟
شدید پالے اور برف کے سخت تھپیڑے
اسے ٹھٹھرا کر بے جان کر دیتے ہیں
مگر زندگی لوٹ آتی ہے
جب بہار دوبارہ آتی ہے
اور اپنے ساتھ گرم دھوپ لاتی ہے "

ایک اور نظم یوں ہے

" اے میرے ہموطنو ! بے گھر ہو کر تم ایسے بے ٹھکانہ ہو
جیسے سمندر پر اڑتی ہوئی گرد
تم ادھر اُدھر سرگرداں ہو
لیکن اپنی کھوئی ہوئی سرزمین کے لیے رونا مت
وہ دن دور نہیں ہے
جب ہم اپنا وطن دوبارہ حاصل کر لیں گے "

میرا محتاط مطالعہ اس طرف رہنمائی کرتا ہے کہ انقلاب کوریا میں شعرا نے نہایت اہم حصہ لیا ہے۔خود کم ال سنگ کا مزاج شاعرانہ ہے اور وہ اپنے جذبات کے اظہار کے لیے بعض اوقات شعر کو ذریعہ بناتے ہیں۔ یہاں میرا خیال شعرائے پاکستان کی جانب منتقل ہوا اور میں نے محسوس کیا کہ ۱۹۶۵ء کی ہند و پاک جنگ میں اگر شعرا اپنے فکر و آہنگ سے کام نہ لیتے تو کامیابی بعید رہ جاتی۔میں اب بھی یہ رائے رکھتا ہوں کہ ہمارے شعرائے کرام عظمتوں سے سرشار ہیں اور رفعتوں سے آشنا کرنا ان کا مقام ہے۔پاکستان آج جن سخت حالات کی گرفت میں ہے ان سے سلامتی کے ساتھ اسے نکالنے میں اور ایک فکری انقلاب برپا کرنے میں ہمارے شاعر یقیناً موثر کردار ادا کر سکتے ہیں۔ہمیں ان کی عزت کرنی چاہیے اور ان کے مقام کو بلند کرنے اور رکھنے کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔

تاہم جاپانی پولیس کے جبروتشدد اور جسمانی اذیت کے باعث کم ہیونگ جک کے اعصاب بے حد متاثر ہوئے۔ان کے زخموں میں جراثیم

پڑ گئے،علالت نے شدت اختیار کر لی، آخر ۱۹۲۶ء میں کہ جب ان کی عمر ابھی صرف بتیس برس تھی عین جوانی میں راہی ملکِ عدم ہوگئے۔ کہا جاتا ہے کہ مرتے وقت ان کی زبان پر یہ الفاظ تھے:

" میں اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھے بغیر اس دنیا سے کوچ کر رہا ہوں ۔مگر مجھے تم پر بھروسا ہے ۔ایک لمحہ کے لیے بھی یہ مت بھولنا کہ تم اپنے ملک اور اپنے عوام کے سپوت ہو ۔خواہ تمہاری ہڈیوں کا سرمہ بنا دیا جائے ، تمہارے جسم کے پُرزے پُرزے اڑا دیے جائیں مگر ہمت نہ ہارنا ۔اپنا ملک واپس لے کر ہی رہنا ۔"

صدر کی والدہ کانگ بان سوک ایک انقلابی کی شریک حیات تھیں۔ اسی مادر کوریا نے صدر کو جنم دیا اور پھر تربیت دی ۔ وہ ایسی دانشور تھیں کہ اپنی فہم و فراست سے کام لے کر " انجمن نسواں " کی بنیاد ڈالی تاکہ وہ آزادیٔ کوریا کی جنگ میں جاپانیوں کےخلاف حصہ لے سکیں ۔

آزادی کے لیے ان کے دل میں جتنی تڑپ تھی اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ ایک بار وہ شدید بیمار پڑ گئیں ۔بچنے کی آس باقی نہ رہی ۔کم ال سنگ کو ماں کی اس جان لیوا بیماری کا علم ہوا تو وہ بیقرار ہو کر دوڑا ہوا ماں کے قدموں میں پہنچ گیا ۔ مگر ماں نے خوش ہونے کے بجائے اسے دیکھ کر سخت تنبیہ کے انداز میں یوں فہمائش کی:

" اگر کوئی آدمی جو اپنے ملک کو دشمنوں سے واپس لینے کی مہم پر گیا ہوا ہو اور اسے گھر کا خیال ستائے تو وہ اپنے عظیم مقاصد میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتا ۔"

یہ اپنے بیٹے سے ان کی آخری ملاقات ثابت ہوئی۔انھوں نے ساری زندگی دکھوں میں بسر کی تھی ۔ ۱۹۳۲ء میں زندگی کی آخری سختی بھی سہ کر چالیس سال کی عمر میں اس دارالمحن سے رخصت ہوگئیں ۔

مرنے سے صرف چند لمحہ پہلے انھوں نے اپنی ہمسایہ خاتون سے کہا :

"میرے مرنے کے بعد میرا لال سونگ جو (مارشل کا بچپن میں پیار کا نام) آئے تو اس کا اسی طرح استقبال کرنا جیسا میں کیا کرتی تھی ۔ اسے اس وقت تک میری قبر پر مت جانے دینا جب تک کوریا جاپانی سامراجیوں کے تسلط میں ہے ۔ وہ آزادی حاصل کرنے کے بعد ہی میری قبر پر آ سکتا ہے ۔ یہاں مجھے یقین ہے کہ میرا سونگ جو آدمی ہے راستے میں ہمت ہارنے والا نہیں ہے ۔"

یہ تھے وہ عظیم والدین جنھوں نے اپنے بیٹے سے بے پناہ پیار کے ساتھ ساتھ اس کی ایسی نگہداشت اور تربیت کی کہ اس کے دل میں اپنی آبائی جگہ سے وہ محبت ، وہ شدید جذبۂ قومی حریت اور جارحین کے خلاف سخت نفرت پیدا ہوئی جس نے عملی اظہار کے لیے کم ال سنگ جیسے بطل جلیل کا روپ اختیار کیا ۔

انقلابی عجائب گھر میں کم ال سنگ کے چچا کم ہیونگ گون ، ان کے چھوٹے بھائی کم چول جو اور خاندان کے دوسرے ان افراد کی یادگاریں بھی رکھی ہوئی ہیں جو انقلابی جدوجہد میں عمر بھر حصہ لیتے رہے ۔

ایک دن اوائل اکتوبر ۱۹۲۵ء میں جب انہیں اپنی جائے پیدائش مانگ یونگ دائی کو خیرباد کہے پورے پچیس سال ہو چکے تھے کانگ سن اسٹیل پلانٹ دیکھنے کے لیے جاتے ہوئے ان کا گزر اپنے گاؤں کی طرف سے ہوا جہاں ان کے آباواجداد رہا کرتے تھے اور جن کی یاد ایک لمحے کے لیے بھی ان کے دل سے فراموش نہیں ہوئی تھی ۔ اس موقع پر مانگ یونگ دائی کو جانے والی سڑک کے تراہے پر ایک یادگار تعمیر کردی گئی ہے جس پر یہ عبارت کندہ ہے :

کانگ سن کو جاتے ہوئے
برف باری کے طوفانوں میں ہزارہا میل کی مسافت پاپیادہ
طے کرتے ہوئے

یا گھنے جنگلوں کی تکلیف دہ طویل راتوں میں پڑاؤ کے
دوران جنرل کم ال سنگ ، قوم کے ہیرو

جو اس وقت اپنی سرزمین پر سورج بن کر چمکے جب وہاں

جبر کے گھر ے بادلوں کی تاریکی چھائی تھی
وطن کے گوشے گوشے پر آزادی کی روشن کرنیں نچھاور کردیں
اور اپنا ہر سانس وطن عزیز کی یاد میں لیا
ہر لمحہ آرزو رہی کہ اپنے حسین و خوبصورت آبائی گاؤں
مانگ یونگ دائی جا پہنچیں
سڑک کا یہ تراہا یاد دلاتا ہے
یہ سڑک تاریخ میں سنگ میل ہے
جنرل کم ال سنگ ، بے مثال محب وطن
جنہوں نے پندرہ سالوں تک بے جگری سے خوں آشام لڑائیاں
لڑیں
اپنے وطن کو نجات دلانے کے پختہ عزم کی خاطر
انہوں نے یہاں ایک دن اپنی کار روکی
وہ کانگ سن مزدوروں کو دیکھنے جا رہے تھے
ملک کا مستقبل ان کے ذہن میں تھا
" وہ رہا مانگ یونگ دائی ، یہ بڑی نفیس جگہ ہے
یہ میری جنم بھومی ہے جسے میں آج بیس سال بعد نظر
بھر کر دیکھ رہا ہوں
اگر آپ وہاں جائیں تو آپ کی ملاقات میرے آباواجداد
سے ہوگی
میری نیک تمنائیں ان تک پہنچا دینا
اور انہیں بتا دینا کہ اب ملک آزاد ہو چکا ہے
میں بہت جلد گھر لوٹ آؤں گا ۔"
یہی وہ مقام ہے جہاں سے انہوں نے اپنے مجاہدانہ سفر
کا آغاز کیا تھا
اس عزم صمیم کے ساتھ کہ وطن واپس نہیں آئیں گے
جب تک کوریا خود مختاری حاصل نہیں کر لیتا
اب وہ بڑی شان و شکوہ سے واپس آئے ہیں
بہار آزادی کو اپنے جلو میں لیے ہوئے
انہیں اپنی ذات سے زیادہ عوام کا خیال تھا

جنرل نے ہماری پارٹی کی بنیاد رکھی ، کوریائی انقلاب کا
جنرل اسٹاف ترتیب دیا
اور مراجعت کے بعد عوام کے سامنے پہلی بار تقریر کی۔ان
کا جذبۂ بلند
اور قلبی گرم جوشی
ہمیشہ ہمیشہ ہمارے ذہنوں میں تازہ رہے گی
اور ہمارے بعد آنے والی نسلوں میں منتقل ہوتی رہے گی

صدر کم ال سنگ نے ۱۰/ اکتوبر ۱۹۲۵ء میں کوریا کی مزدور پارٹی کی بنیاد رکھی اور ۱۴ ۔اکتوبر ۱۹۲۵ء کو پیونگ یانگ کے شہریوں سے اپنی فاتحانہ مراجعت کے بعد پہلی بار خطاب کیا۔ اسی شام وہ مانگ یونگ دائی گئے جہاں ان کے آباواجداد ان کے لیے چشم براہ تھے۔ان سب نے مل کر جشنِ مسرت منایا۔ایک اخبار کے رپورٹر نے اس منظر کی تصویر لی اور اسے اس عنوان کے تحت شائع کیا:

"ایک گل پاش انقلابی خاندان"

انداز فکر

آج مجھے لاہور اور کراچی کے قومی عجائب گھر شدت کے ساتھ یاد آئے ، اور اس کے ساتھ جناب محترم ممتاز حسن مرحوم بے حد یاد آئے کہ ان کی کوششوں سے پاکستان میں عجائب گھر کا تصور پروان چڑھا۔اگر ہم اپنے عجائب گھروں میں جدوجہد آزادی کے عنوان پر تعصبات سے ماورا ہو کر اضافات کریں تو برصغیر کے مسلمانوں میں ایسی لاتعداد مثالیں موجود ہیں کہ جن کی نمائش مانگ یونگ دائی کے عجائب گھر میں ہوئی ہے۔

بی اماں آج آنکھوں کے سامنے آگئیں۔ جنھوں نے اپنے بیٹوں محمد علی اور شوکت علی کو آزادیٔ وطن پر قربان کر دیا ۔ مولانا جوہر کی بچی کی علالت شدید اور مولانا کے تاثرات یہ :

امتحاں سخت سہی ، پر دلِ مومن ہی وہ کیا
جو ہر اک حال میں امید سے معمور نہیں!

ہے دعا اور دوا فرض ولے حکم خدا
ٹل سکے ، یہ کسی بندے کا بھی مقدور نہیں

ہم کو تقدیر الٰہی سے نہ شکوہ نہ گلہ
اہل تسلیم و رضا کا تو یہ دستور نہیں

تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اس کو
نہیں منظور ، تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

تیری قدرت سے خدایا تیری رحمت نہیں کم
آمنہ بھی جو شفا پائے تو کچھ دور نہیں

حسرت موہانی جب قید و بند کی صعوبتیں جھیل رہے تھے ان کی اہلیہ نے پیغام دیا کہ خبردار ہمت نہ ہارنا ۔ آزادئ وطن کے لیے جان دیدو ۔ گھر کی اور ہماری فکر چھوڑ دو ۔ مولانا محمد علی نے لندن میں اعلان کیا تھا کہ میں غلام ملک واپس نہیں جاؤں گا ، بلکہ آزاد ملک میں مرنا پسند کروں گا یا تو آزادی دو یا قبر کے لیے یہی دو گز زمین دیدو ۔ اور پھر وہ قول کے پکّے تھے ۔ جان دیدی اور ارض مقدس میں دفن ہو گئے ، لاش بھی ہندستان نہ آئی ۔

ہماری تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے ۔ ہمیں چاہیے کہ ہم غور و فکر سے کام لیں اور اپنے ماضی کو اپنے حال سے منسلک کریں اور نسلِ نو کو ان ایثار اور ایسی قربانیوں سے آگاہ کرنے کا فریضہ انجام دیں ۔ پیونگ یانگ کے ہر اہم کونے پر تاریخ کوریا اور جنگِ آزادی کے ہیروؤں کے اقوال پتھروں پر کندہ کیے ہوئے ہیں اور قدم قدم پر باشندگان کو ان کے تاریخی واقعات یاد دلاتے ہیں ۔ نسلِ جواں کو تعمیرِ مستقبل کے لیے اسی طرح تیار کیا جا سکتا ہے ۔

فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کی پاکستان کے لیے خدمات شک و شبہ سے بالاتر ہیں ۔ انھوں نے پاکستان کو مقام صنعت دیا ہے اور معاشی خوش حالی کے وہ ذمہ دار ہیں ۔ فیلڈ مارشل ہی ہیں کہ انھوں نے اسلام آباد ایک نیا شہر پاکستان کو دیا ۔ ایسی عظیم

شخصیت کو بے درد سیاست دانوں کی فکرِ کج پر قربان نہیں کرنا چاہیے۔ اسلام آباد میں فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کی یادگار قائم کرنی چاہیے اور انداز فکر یہ بھی ہونا چاہیے کہ اگر ہم نے اپنے ہیروؤں کو سیاست و تعصبات کی قربان گاہ پر قربان کر دیا تو ہماری تاریخ کوری رہ جائے گی اور ہمارا نصاب تعلیم ہیروؤں کے بیان سے خالی ہو جائے گا ۔

سید مودودی عظیم انسان تھے اور فکرِ اسلامی میں ان کا مرتبۂ بلند فراموش نہیں کیا جانا چاہیے۔ ان کی جماعت اسلامی کی سیاست سے صرفِ نظر کر کے ان کو اس حیثیت سے پیش کرنا چاہیے کہ پاکستان میں وہ انقلابِ اسلامی کے پیش رو ہیں اور ان کے اقوال کو ہماری تعلیم و تربیت کا جزو ہونا چاہیے ۔

تاریخ کوریا کا مرکزی عجائب گھر
عوامی جد و جہد کی داستان

تاریخ کوریا پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے قبل میں نے یہ ضروری خیال کیا کہ مجھے پیونگ یانگ میں واقع کورین "سنٹرل ہسٹری میوزیم" پر ایک گہری نگاہ ڈال لینی چاہیے۔ چنانچہ میں نے اپنے پروگرام میں اسے اہمیت کے ساتھ شریک کیا ، اور ایک سہ پہر ہم یہاں پہنچ گئے۔

تاریخ کوریا کے اس عجائب گھر کی ڈائریکٹر محترمہ کم سن سک ہیں۔ ان سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ وہ انگریزی زبان برائے نام، مگر جرمن زبان اس قدر جانتی ہیں کہ کام چلا سکیں ۔عجائب گھر کے ابتدائی تعارف کے بعد اس کی سیر کا آغاز ہوا۔ سمجھ دار رہنما خواتین کے علاوہ ایک اور محترمہ بھی ہمارے ساتھ رہیں ، گو یہ سیر و سفر خاصا تھکا دینے والا تھا مگر میں ان کی ہمت کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔

اب میں " کوریا کہانی " کے قارئین کو اپنے ساتھ اس تاریخی مرکزی عجائب گھر کی سیر کرائے دیتا ہوں۔ اس کے بعد کوریا پر جو حصۂ تاریخ میں نے مرتب کیا ہے۔ اس کا مطالعہ واقعی دل چسپ ہو

جائے گا۔

یہ کوریا کی عوامی تاریخ کے ان حقائق کی ایک سرگزشت ہے جن کا پیونگ یانگ کے مختلف حصوں کی سیر کرتے ہوئے مجھ پر انکشاف ہوا۔

یہ عجائب گھر یکم دسمبر ۱۹۴۵ء کو کوریا کی آزادی کے فوراً بعد نمائش کے لیے کھولا گیا تھا اور آج تک کسی تعطل کے بغیر یہاں آکر دیکھنے والوں کا سلسلہ جاری ہے۔

تائے سونگ سان پہاڑی قلعہ کو گوریو عہد کے کھنڈرات میں پھیلا ہوا ہے۔ جب اس کے نواح میں کھدائی کر کے نوادرات برآمد کیے جا رہے تھے ایک روز صدر کم ال سنگ کام کا جائزہ لینے وہاں جا پہنچے۔ انہوں نے کہا، "میرے علم میں لایا گیا ہے کہ آپ نے کھدائی کے دوران بہت سی نادر اشیا برآمد کی ہیں۔ اب آپ کو یہ بھی چاہیے کہ انہیں اچھی طرح محفوظ کر لیں۔" ان کی اس ہدایت نے کھدائی کے وسیع منصوبے کی رفتار اور تیز کر دی۔ بلکہ ان تاریخی باقیات کی بھی مناسب مرمت کر کے انہیں نئی دریافتوں کے ساتھ ہی رکھ دیا گیا جنہیں جنگ کے زمانے میں سامراجیوں نے تاخت و تاراج کر دیا تھا۔ حال ہی میں اس عجائب گھر کو پیونگ یانگ شہر سے سمیٹ کر دریائے تائے ڈونگ گانگ کے خوبصورت کنارے پر دوبارہ بڑے سلیقے سے آراستہ کیا گیا ہے۔ اب اس کی گیلریوں میں مجموعی طور پر نوّے ہزار اشیا رکھی ہوئی ہیں۔ اس ذیل میں بڑی دلچسپ چیز یہ ہے کہ جمہوریہ میں عجائب گھر صرف یادگاروں کو محفوظ رکھنے ہی کا کام نہیں دیتے بلکہ یہ باقاعدہ عوامی اداروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہاں سے درحقیقت، نوجوان نسل کو جن میں طلبہ اور اسکولوں کے بچے بھی شامل ہیں وطن سے محبت کا درس اور حریّت اور خودی کی تعلیم بھی ملتی ہے۔ ہم جب یہاں داخل ہوئے تو ہم نے عجائب گھر میں ایک ابتدائی اسکول کے بچوں کو دیکھا جو موسم گرما کی تعطیلات میں اپنے اساتذہ کے ساتھ عجائب گھر کی سیر کرنے آئے تھے۔ یہ بچے بڑی توجہ اور دلچسپی سے ہر چیز دیکھ دیکھ کر اس کے بارے میں معلومات حاصل کر رہے تھے اور ان کے معلمین، جو اکثریت میں خواتین ہیں، ان کو بڑی توجہ سے بتا سمجھا

رہی تھیں ۔

ان عجائب گھروں میں ثقافتی ورثہ کی حفاظت کے سلسلے میں طریق کار کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہاں نہ صرف نوادرات کا بغور معائنہ کیا جاتا اور ان کے اثریاتی ، معتقداتی اور دستاویزی مواد کی قدامت ثابت کرنے کے لیے انہیں سائنسی بنیادوں پر پرکھا جاتا ہے بلکہ بہت دوڑ دھوپ کر کے ان سے متعلق مستند تحاقیق اکٹھی کی جاتی ہیں تاکہ ان نوادرات کو اصل حالت میں برقرار رکھا جا سکے ۔

مرکزی تاریخ کے عجائب گھر میں جو نوادرات اور اشیا نمائش کے لیے رکھی ہوئی ہیں وہ کوریائی عوام کی اس جہد مسلسل اور تخلیقی عمل پیہم کی طویل تاریخ بیان کرتی ہیں جس کا سلسلہ چھے سے چار لاکھ سال قبل قدیم پیلیولتھک عہد (Palaeolithic Age) تک جاتا ہے ۔

یہاں آکر اور پیارے بچوں کو دیکھ کر میرا ذہن بلا اختیار کراچی کے قومی عجائب گھر کی طرف منتقل ہو گیا ۔ محترمی جناب ڈاکٹر این ۔ اے ۔ بلوچ صاحب (مستعفی وائس چانسلر اسلامک یونیورسٹی) اور جناب محترم و ڈاکٹر ایس ۔ ایم ۔ زماں صاحب (جوائنٹ سکریٹری وزارت تعلیم) سے تبادلۂ خیال ہو رہا تھا ۔ قومی عجائب گھر کا مہمان خانہ تھا ۔ ذکر آیا کہ قومی عجائب گھر سے زیادہ سے زیادہ فائدہ کیسے اٹھایا جائے ۔ میں نے مشورہ دیا کہ کراچی کی درس گاہوں کے طلبہ و طالبات کو زیادہ سے زیادہ یہاں لاکر ان کو تاریخ پاکستان سے آگاہ کیا جانا مناسب ہوگا ۔ میں نے بلاتامل ذمہ داری قبول کر لی اور ہمدرد فاؤنڈیشن کئی سال تک ہر جمعرات کو صبح سے دوپہر تک کے لیے سو سوا سو بچوں کو یہاں اپنی نگرانی میں بلاتا رہا اور ان کو قومی عجائب گھر کی سیر کراتا رہا اور سیر کے آخر میں ذہنی مقابلے کرائے جاتے اور بچوں کو انعامات دیے جاتے اور پھر ہمدرد کی نگرانی میں ان کو ہمدرد بسوں میں ان کی درس گاہوں میں واپس چھوڑ دیا جاتا ۔ ہزارہا بچے آتے رہے اور قومی عجائب گھر سے استفادہ کرتے رہے ۔ حادثہ یہ پیش آیا کہ قومی عجائب گھر کی انتظامیہ میں تبدیلیاں ہوئیں ۔ نئی انتظامیہ کو یہ ادا پسند نہ آئی اور سلسلۂ تعلیم بذریعہ عجائب گھر بند ہو گیا ۔

کومون مورو کے آثار اور ضلع سانگ ون میں تاریخی مقام پیونگ یانگ کے بے شمار دو سو سے نوادر قدیم عہد کی گیلری میں محفوظ کیے گئے ہیں جو ثابت کرتے ہیں کہ کوریاؤں کے آباواجداد قدیم پیلیولتھک عہد میں بھی کوریا میں بود و باش رکھتے تھے۔ آغاز تاریخ انسانی، بعد از حجری دور اور دھات کے زمانے تک میں ان کا سراغ ملتا ہے۔ ان نوادر سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے آلاتِ دستکاری کو بہتر بنایا، پیداواری قوتوں کو فروغ دیا اور معاشرے میں محنت کو عزت کا مقام بخشا کہ تمام امارتوں اور مسرتوں کا سوچشمہ محنت ہی ہے۔

جو گیلری قدیم زمانے کے لیے وقف ہے اس میں تانبے لوہے کی مصنوعات اور سونے چاندی اور نیلم کی مرصع کاری کے نمونوں کی نمائش کی گئی ہے۔ کوریائی قدیم ریاستوں کو چوسن، پویو اور چن گک میں ایسے طاقتور معاشرے جو غلاموں سے کام لیتے تھے آٹھویں ساتویں صدی قبل مسیح میں موجود تھے۔ ان کی منفرد ثقافتی نشانیاں بھی عجائب گھر میں ملتی ہیں۔ اس زمانے کے زرعی اور حربی و ضربی آلات دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ قدیم کوریائی حیرت انگیز حد تک فنی مہارت کے قائل تھے۔

عہدِ متوسط کی گیلری ان نوادر اور اشیا پر مشتمل ہے کہ جو ان کو گویوریوں کی جدوجہد اور تاریخ و ثقافت کی یاد دلاتی ہیں جو پہلی صدی قبل مسیح سے تقریباً آٹھ سو سال تک ایشیا میں پھلے پھولے۔ انہی کوگویوریوں کے عہد میں دنیا میں سب سے پہلے پیتل کے حروفِ چھپائی ایجاد ہوئے جو ۱۲۳۲ء تک مستعمل رہے۔ انہی کے زمانے میں فن کُوزہ گری اپنے عروج پر پہنچا۔ ایسے نوادر اور بے شمار دیگر اشیا بھی ہیں جن کا تعلق لی شاہی خاندان سے ہے۔ ان میں پیمانۂ بارش "Hunminjongum" دنیا میں سب سے پرانی ایجاد ہے۔ موجودہ زمانے میں رائج چھپائی کے حروف کا پہلا نمونہ بھی ۱۲۲۲ء میں انہی نے ایجاد کیا تھا۔ کوبک (کچھوے کی شکل کا) بحری جہاز دنیا کا سب سے پہلا اسلحہ بردار جہاز تھا۔ اس جہاز نے حب وطن کی جنگ میں جاپانی بحری بیڑے کو شکست دی تھی۔ اس کی ایجاد لی خاندان کے پہلے نصف عہد

کا سب سے عظیم تاریخی کارنامہ ہے ، سولھویں صدی کے آخر میں ٹویوٹومی ہائید یوشی نے کوریا پر حملہ کر کے جنگ چھیڑ دی تھی جس کے مقابلے کے لیے یہ جہاز تیار کیا گیا تھا۔

یہاں میں ضمناً چند نوادر کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں،کیوں کہ میں ان سے خاصا متاثر ہوا۔

۱- کوگوریو کے منفرد طرز کے مقبروں میں ایک آناک مقبرہ نمبر۳ ہے (جو چوتھی صدی کے لگ بھگ تعمیر ہوا)-اس کا اندرونی حصہ قابلِ دید ہے-یہ اس دور کی محلاتی زندگی کی بھرپور عکاسی کرتا ہے-اس کی دیواریں منقش ہیں جن پر شبیہیں اور تصویریں بنی ہیں-ان تصاویر میں باورچی خانے ، اصطبل ، تعزیتی جلوس،فوجوں کی یلغار اور جنگ کے مناظر پیش کرتے وقت چھوٹی چھوٹی جزئیات تک کا خیال رکھا گیا ہے اور منظر کشی میں وہی چابکدستی ، فنی مہارت اور پختہ کاری ملحوظ رکھی گئی ہے جو کوریائی مصوری کی روایتی خصوصیت ہے-شکار کے مناظر تو ختگوری مقبرہ(پانچویں صدی) میں نظر آتے ہیں-جن مناظر میں مرد اور عورتیں دکھائی گئی ہیں وہاں وہ نمایاں طور پر مردانہ و زنانہ ملبوسات کی آئینہ داری کرتے ہیں-ساتویں صدی کے سنسارنی مقبرے کی اندرونی چار دیواری پر نیلے اژدہا ، سفید شیر ، سرخ ققنس ،سست رفتار ناگ کی تصویریں نقش کی گئی ہیں۔ انہیں دیکھنے سے پہلی ہی نظر میں اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ ان دیواری نقاشیوں کی نقل مانند اصل ہیں جو جاپان میں تاکمات شوزو کے مقبرہ میں کی گئی ہیں۔

۲- دھات کے بنے ہوئے چھاپے کے حروف بارھویں صدی میں یعنی گٹن برگ کے سکے کے ٹائپ سے دو سو سال پہلے انہوں نے ایجاد کر لیے تھے-اس سے پہلے چھپائی کے لیے لکڑی کے ٹھپے استعمال ہوتے تھے- یہ ایجاد ایسا اہم واقعہ تھا کہ جس نے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔

اس وقت کی یہ حد درجہ ترقی یافتہ فنی مہارت جاپان میں پہنچی اور سولھویں صدی کے بعد وہاں کے فنِ طباعت پر گہرا اثر مرتب کیا۔

۳ ـ کوریا کا فنِ کُوزہ گری بھی درجۂ کمال کو پہنچا ہوا تھا ۔ اس زمانے کے برتن مکمل تناسب کا شاہکار ہونے کے علاوہ متنوع اورحسین و جمیل صورتوں کے حامل ہیں ۔ شوخ رنگوں میں نازک اور نفیس نقاشی ان کا طرۂ امتیاز ہے ۔ انہیں پکائے جانے سے پہلے ان پر سفید یا سوخ چونے سے پچی کاری اور شیشے جڑنے کا شاندار کام کیا جاتا تھا ۔ اس فن میں انہوں نے یدِ طُولٰی حاصل کیا ۔ یہ ان کا مادۂ ایجاد و اختراع اور فنکارانہ مہارت ہی تھی جس نے اس فن میں جاپانیوں کی رہنمائی کا فریضہ ادا کر کے وہاں بھی کوزہ گری کو کمال تک پہنچایا ۔

جدید دور کی گیلری ان نوادرات اور اشیا کے لیے وقف ہے جن کا تعلق کوریائی عوام کی جاپانی سامراج اور دیگر حملہ آوروں کے خلاف مدافعانہ جدوجہد سے ہے ۔ اس کے ساتھ ہی یہاں انیسویں صدی کے نصف آخر سے لے کر ۱۹۱۹ء تک کے دور (یعنی جب کوریا میں بورژوائی قوم پرستوں کی تحریک اپنے انجام کو پہنچی) عکاسی بھی کی گئی ہے ۔ انہیں دیکھنے سے جاگیردار حکمرانوں کے رہن سہن کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے ۔

اس گیلری میں وہ اشیا بھی رکھی ہوئی ہیں جن کا تعلق صدر کم ال سنگ کے والد کم ہیونگ جک کی انقلابی سوگرمیوں سے رہا ہے ۔ صدر کے والد وہ عظیم مفکر تھے جنھوں نے اپنی بصیرت سے کام لے کر قوم پرستوں کی تحریک کو ترقی پسندی کے رُخ پر ڈالا تھا ۔

تاریخ کوریا کے عجائب گھر کا معائنہ کرتے ہوئے دو باتیں قابل توجہ ہیں :

۱ ـ پہلے مرحلہ پر میں نے شدت سے محسوس کیا کہ کوریا کی تقسیم کا المیہ عجائب گھر کے منتظمین کی نگاہ میں کوئی انوکھی بات نہیں تھی ۔ یہ تاثر کیوریٹر کے اس بیان سے ملا جب اس نے کہا ، " ایسی مصدقہ اشیا کا حصول جن کا تعلق جنوبی کوریا اور وہاں کے پیکچے اور سلّا عہد سے رہا ہو ہماری دسترس سے باہر تھا ۔ چناں چہ ہم نے اس سلسلے میں جنوبی حصہ سے تعاون کی درخواست کی لیکن انہوں نے اسے مسترد کر دیا ۔ کتنے دکھ کی بات ہے کہ انہوں نے

ادبی علمی تبادلے کی درخواست کو بھی ٹھکرا دیا۔"

دوسری بات جس نے توجہ مبذول کی وہ ٹورٹائیز شپ (سست رفتار بحری جہاز) کی ایجاد تھی جو سولھویں صدی میں ہوئی۔ فی الحقیقت کوریا ٹویوٹومی ہائید یوشی کے حملوں سے تاراج اور جاپان کے مظالم کا نشانہ بنتا رہتا تھا۔ اس جہاز کی ایجاد میں کوریاؤں کا وہ جذبۂ جدوجہد کارفرما تھا جس کا مظاہرہ وہ ہائید یوشی کی جارحیت اور ہوسِ ملک گیری کو روکنے کے لیے کر رہے تھے۔

سست رفتار بحری جہاز (ٹورٹائزشپ) دنیا کا سب سے پہلا اسلحہ بردار بحری جہاز تھا جس کی تخلیق اس جذبۂ جدوجہد کی علامت ہے جس سے کوریائی سوشار رہتے تھے۔ جنول نے جارحیت کو کبھی برداشت نہیں کیا تھا۔ جذبہ کی اس علامت نے میرے دل میں ہلچل مچا دی۔

۱۹ - اپریل ۱۹۸۲ء - پیر

اب جسم و ذہن میں توازن قائم ہو گیا ہے - صبح حسب معمول ۴ بجے آنکھ کھلنے لگی ہے - نمازِ فجر ادا کر کے میں اپنی میز پر بیٹھ گیا ہوں - اس ہوٹل کے کمرے میں سب سے کارآمد چیز یہ دفتر ہے کہ جو اس میں قائم ہے اور یہ میز ہے کہ جو ہر اعتبار سے اچھی ہے - تحریر و مطالعہ کا پورا انتظام ہے -

ارادہ تو نہ تھا کہ میں کوریا کے بارے میں اپنی ڈائری اس خیال سے لکھوں گا کہ یہ کوریا پر ایک سفر نامے کی صورت اختیار کر لے مگر خیال آیا کہ ایسا نہ کرنا کوتاہی ہوگی - لہذا میں نے فیصلہ کر ہی لیا ہے کہ اچھی بُری جیسی بھی ہوں یادداشتیں لکھ لینی چاہیں اور اگر فرصت میسر ہو جائے تو " کوریا کہانی " کے نام سے ایک سفر نامہ تیار کر دینا چاہیے -

صفحۂ ارض پر کوریا وہ علاقہ ہے کہ جہاں سیر و سفر کے لیے لوگ کم آتے ہیں - پاکستانیوں نے اس سے کوئی دلچسپی نہیں لی ہے ، حال آں کہ تاریخی اعتبار سے ، اور اپنی فطری رعنائیوں اور اپنے حسن و جمال کے لحاظ سے یہ واقعی دلچسپ خطۂ زمین ہے - جو طبیعتیں آغوشِ فطرت میں جانے کے لیے بے چین ہوتی ہیں اور ہنگامہ ہائے زندگی اور شور و شر سے پریشان ہو کر متلاشئ سکون ہوتی ہیں ان کے لیے یہ سر زمین عافیت و سکون کا پورا ماحول پیش کرتی ہے - اور ہاں وہ لوگ کہ آزاد ہیں مگر آزادی کے مفہوم سے نا آشنا ، انسان ہیں مگر انسانیت کے ناقدرداں اور ذہن رسا رکھتے ہیں مگر اس سے کام نہیں لیتے ، ہاتھ پیر رکھتے ہیں لیکن خیر و عمل کے لیے یہ حرکت میں نہیں آتے ، دل رکھتے ہیں مگر کسی کے غم و درد میں وہ بے چین نہیں ہوتا ، دماغ رکھتے ہیں مگر وہ فکر و نظر سے عاری ، ایسے لوگوں کو جیسے ہم پاکستانی کہ سراپا

عبرت ہیں ، یہاں آ کر جشن آزادی کا مفہوم سمجھنا چاہیے۔

ہم ۲۷ رمضان المبارک کو پاکستان کا جشن آزادی نہیں مناتے حال آں کہ دنیائے اسلام کے لیے یہ متبرک ترین دن ہے اور مقدس ترین یوم کہ اس تاریخ کو عالمِ انسانی کو دستورِ حیات عطا ہوا۔ نزولِ قرآن ہوا کہ کرۂ ارض کا ہر متنفس اپنے نظریۂ حیات کا سامان کرے۔ اسی مقدس تاریخ کو پاکستان اللہ تعالیٰ کی فیّاضیوں کا نمونہ بن کر منصّۂ شہود پر جلوہ گر ہوا تھا۔ وجودِ پاکستان کی اس سے زیادہ مبارک و متبرک ساعت دوسری کوئی نہیں ہو سکتی۔ پاکستان کہ جہاں صاحبانِ اقتدار نے غلغلۂ اسلام بلند کر رکھا ہے ، نعرۂ اسلام نے ہر طبلِ گوش کو لرزاں کر رکھا ہے اور آوازۂ اسلام سے بام و در لرزاں ہیں وہاں ہم شد ومد کے ساتھ ۱۴ اگست عیسوی کو یوم آزادی منانے پر اصرار کرتے ہیں اور حقیقت کے ادراک کے باوجود دنیوی مصالح کی ہماری فکر و نظر پر شدید گرفت ہے۔

۱۴ اگست عیسوی کو ہم یومِ آزادی جس انداز سے مناتے ہیں اس پر ایک دن میں کروڑوں رُپے صَرف ہو جاتے ہیں اور ہم نے یہ فرض کر لیا ہے کہ گدھا گاڑی تک پر پاکستان کا جھنڈا لہرا کر ہم جشنِ آزادی کا حقیقی مفہوم پورا کر لیتے ہیں۔ عیدِ آزادی کا ہم نے افراد ملّت کو جو مفہوم دیا ہے اس کی حیثیت ہلّہ گلّہ سے زیادہ نہیں ہے، جس سے اقتدار کو مؤقّتی استحکام تو ضرور ملتا ہے مگر اس پروگرام کو جو " ماہرینِ نفسیات" مرتب کرتے ہیں ان کو عید اور جشن کے درمیان فرق کا کوئی ادراک نہیں ہے۔ عید میں مسرت کے ساتھ تعمیر کا مفہوم شریک ہے ، اور جشن ایک ہنگامۂ وقتی ہے کہ جس سے تعمیر اذہان ممکن نہیں۔

پاکستان میں ہم جس نظریاتی کشمکش میں مبتلا ہیں اور ذہنی انتشار اور فکری اختلاف کی جس گرفت میں ہم ہیں اس کے تقاضے یکسر مختلف ہیں۔ ان تقاضوں کو عمارات پر جھنڈے اڑانے سے پورا نہیں کیا جا سکتا۔ فکر و ذہن کی تعمیر صرف جدوجہد ہی سے ممکن ہو سکتی ہے۔ اگر ہم اپنے یومِ آزادی پر افرادِ ملّت کو تعمیر پر نہیں لگا سکتے تو ہم نے اپنے فرائض ادا کرنے میں کوتاہی

برتی ہے اور کروڑہا روپیہ صرف کر کے قوم کو اُسی جشن میں مبتلا کر دیا کہ جس میں وہ پہلے ہی مبتلا ہے اور دادِ عیش دے رہی ہے اور اپنی فکری اور سیاسی آزادیوں سے لاپروا اور یکسر غافل ہوچکی ہے۔ عیش و نشاط پر افراد و ملّت کو لگا دینا کون سا مشکل کام ہے۔ پاکستان میں ہر اقتدار نے یہی طور طریق اختیار کر کے دادِ عیش دی ہے۔

اگر ہمارا جشن آزادی عید آزادی کے معانی و مفاہیم رکھے تو یہی وہ دن ہوتا ہے اور ساعتِ نیک کہ جب ملّت کو اس کی کوتاہیوں سے آگاہ کیا جاتا ہے اور غلطیوں کی نشان دہی کی جاتی ہے، اور تعمیر کا راستہ متعین کر کے اسے آمادۂ عمل کیا جاتا ہے۔ ہم دنیا بھر کے مقروض ہیں اور کاسۂ گدائی ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ اگر ہمارا یومِ آزادی کا پروگرام اس قرض کی سیاست سے ہم کو آگاہ نہیں کرتا اور اُمدادوں کی لعنت سے ہم کو واقف کرانے سے عاجز ہے اور قناعت اور سادگی اختیار کرنے کی دعوت دینے کے بجائے لہوولعب کا بازار گرم کرتا ہے تو ہم نے بدیہی طور پر اس سے وقتی طور پر لوگوں کو مسائل کی سنگینی سے ہٹا کر سیاسی اقتدار و استحکام کا سامان کیا ہے اور تعمیر سے صریحاً غفلت برتی ہے۔

شمالی کوریا میں لہو و لعب نہیں ہے ، درسِ تعمیر کا سامان ہے۔ تعمیر کا ماحول ہے۔ اور ہر انسان عظیم کوریا کی دُھن میں لگا ہوا ہے۔ وہ دونوں کوریاؤں کو ایک کردینے کے درپے ہیں اور ہم مشرقی اور مغربی پاکستان کو جدا کرنے پر ہراساں ہیں اور نہ شرمندہ !

پیونگ یانگ میٹرنیٹی ہسپتال

"ـــــ ہمارے طرزِ حیات میں عوام سے زیادہ قیمتی کوئی دوسری شے نہیں ہے۔ لہذا ہمیں اپنا نظامِ صحت اس انداز سے مرتب کرنا چاہیے اور اس طرح اُسے ترقی دینی چاہیے کہ ہم انسانوں کی زندگیوں کا تحفظ کر سکیں اور اپنے کارکنان کو صحت مندی سے ہم کنار کر سکیں ـــــ"

شمالی کوریا میں میدان طب وصحت میں پیش رفت اس روشنی میں ہو رہی ہے۔ صدر کم ال سنگ کے ایسے اقوال متعدد ہیں اور یہ اقوال برائے

اقوال نہیں ہیں بلکہ یہ اقوال اس لیے ہیں کہ ان کو بہر حال اور بہر صورت جامۂ عمل پہنایا جائے گا۔ شمالی کوریا میں اس وقت عورتوں کو مردوں کے برابر اور بعض حالات میں مردوں سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ قوم کا نصف ہونے کی حیثیت سے شمالی کوریا کی تعمیر میں خواتین کو پوری طرح کام کا موقع دیا جا رہا ہے۔ بلکہ احترام سے صرف نظر کر کے ان سے زبردستی بھی کام لیا جا رہا ہے۔ خواتین ہر شعبۂ زندگی میں کام کر رہی ہیں، کھیتوں میں وہ اپنی جانیں چھڑک رہی ہیں، سڑکوں پر وہ مشینوں سے جھاڑو دے رہی ہیں، شہروں میں انہوں نے کاروبار زندگی سنبھال رکھا ہے، بچوں کی نگہداشت کا فریضہ بھی وہ انجام دے رہی ہیں اور ان کے لیے اعلا مناصب کی ایک راہ بھی مسدود نہیں ہے۔ ایک طرف ان پر سختیاں ہیں تو دوسری طرف ان کے لیے آسانیاں بھی ہیں۔ اس کی ایک مثال پیونگ یانگ میٹرنیٹی ہسپتال ہے جسے آج میں نے سعدیہ کی معیت میں جا کر دیکھا ہے۔ وہ عورت کہ جو کھیت میں ہلکان ہو رہی ہے اور سڑکوں پر جھاڑو دے کر اپنی روزی پیدا کر رہی ہے وہ اس پیونگ یانگ میٹرنٹی ہسپتال میں داخلے اور بلامعاوضہ علاج کا پورا استحقاق بھی رکھتی ہے۔

گزشتہ دنوں میں نے اس ہسپتال کو دُور سے بارہا دیکھا تھا اور مجھے یہ عمارت پسند تھی۔ آج جب میں یہاں آیا تو حیران ہوا کہ اس درجہ نفیس ہسپتال بھی ہو سکتا ہے! باہر دیکھا کہ درجنوں فوارے لگے ہوئے ہیں اور ان میں سے صاف شفاف پانی کھیل رہا ہے۔ عقبِ آب میں خوب صورت بچوں کے سنگ مرمر کے حسین مجسمے ہیں۔ کئی مجسمے ماں اور بچے کی محبت کی عکاسی کر رہے اور سنگ تراشی کا اعلا نمونہ پیش کر رہے ہیں۔ بڑی دلچسپ چیز یہ کہ ان مجسموں کے سایوں میں اپنی ماؤں کے آغوش میں بچے کھلکھلا رہے ہیں اور مائیں بے قرارِ محبت ہو کر ان کو اپنے سینوں سے لگا رہی ہیں۔ میں اس حسین اور محبت سے پُر ماحول میں جذب ہو گیا اور مجھے یہ خیال ہی نہ رہا کہ ہسپتال کے دروازے پر عملۂ ہسپتال میرا منتظر ہے۔ میں احتیاط سے آگے بڑھا، اور پُر جوش استقبال کا جواب پورے خلوص سے میں نے دیا۔ اس استقبالیہ ٹیم میں ماڈرن ڈاکٹر بھی تھے اور طبِ مشرقی کوریائی کے حاملین بھی۔

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا ، اور ان کو بتایا کہ میں اس ہسپتال میں قدیم و جدید دونوں انتظامات دیکھنا چاہوں گا ، اس لیے میرے ساتھ دونوں طبوں کے حاملین ہو گئے -

ہسپتال کے داخلے والے ہال میں زمین پر موزیک کے پھول بنے ہوئے ہیں - معلوم ہوا کہ اُن پھولوں کا انتخاب ہوا ہے کہ جو کوریائی خواتین کو پسند ہیں - عورتوں کے ہسپتال میں یہ اندازِ زیبائش قابلِ تعریف ہے - اس فرش کی تعمیر میں بڑی نفاست ملتی ہے ، ایسا لگتا ہے کہ واقعی پھول زمین پر بکھرے ہوئے ہیں اور چلتے وقت قدم بے اختیار ان پھولوں کو بچاتے ہیں !

چوں کہ مجھے اس ہسپتال میں مریضوں کو دیکھنا ہے اور زچہ و بچہ کے انتظامات کو دیکھنا ہے اس لیے اس ہسپتال کے مخصوص کپڑے فراہم کو دیے گئے اور جوتے اتار کر مخصوص چپلیں پہنادی گئیں - یہ احتیاط بڑی اہم ہے کہ باہر کے جراثیم اندر نہ پہنچ جائیں اور مریضوں کے لیے وجۂ خطر بن جائیں -

ٹیلے وژن پر ملاقات

اس ہسپتال میں نیچے کی منزل میں ایک ٹیلے وژن سسٹم ہے کہ جہاں بیٹھ کر مریضوں سے ملاقاتی ان کو دیکھ بھی سکتے ہیں اور ان سے باتیں بھی کر سکتے ہیں - میرے لیے یہ بڑی دلچسپ چیز تھی ! اس سے قبل میں نے یہ انتظام دنیا کے کسی ہسپتال میں نہیں دیکھا تھا - میں نے بڑی دلچسپی اور توجہ کے ساتھ اس انتظام کا جائزہ لیا - پہلے میں نے نرس سے بات کی اور پھر ایک زچہ سے باتیں کیں - میں اسے اور وہ مجھے دیکھ رہے تھے اور ہم باتیں کر رہے تھے - میرا مترجم رکم میری مدد کر رہا تھا :

آپ کے ہاں بچہ کب پیدا ہوا ہے ؟
چار دن ہو گئے ہیں -
کوئی تکلیف تو نہیں ہے - بچہ خیریت سے ہے ؟
ہاں ، سب خیریت ہے - بچہ لڑکا ہے اور خوب اچھا ہے -

بچے کا کیا نام رکھا ہے تم نے ؟

اس سوال پر زچہ بڑے زور سے ہنسی - میں بھی ہنسا اور خوب ہنسا -

ضرور تم نے بچے کا نام رکم رکھا ہوگا !

پیونگ یانگ میٹرنٹی ہسپتال میں ایک ہزار بستر ہیں اورمجموعی طور پر اس میں دو ہزار کمرے ہیں - درجنوں ڈلیوری رُومز اور اپریشن تھیٹرز ہیں اور متعدد لیبوریٹیاں ہیں اور دوا سازی اور ڈسپنسریوں کے مراکز ہیں - میں نے بڑی تفصیل کے ساتھ اس کا معائنہ کیا - واقعہ یہ ہے کہ میں نے یہاں جو سازو سامان دیکھا ہے اورجو آلات دیکھے ہیں وہ حیران کن ہیں - شرم و ندامت کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس اہتمام و انصرام کا ہم پاکستان میں دور دور تصور نہیں کر سکتے - اس ہسپتال میں جدید ترین آلات جن کا دنیا میں وجود ہے موجود ہیں - لیبر روم کئی ہیں اور ان کی تنصیبات محیرالعقول ہیں - پھر بچوں کی دیکھ بھال کے کمروں کو پورے اطمینان سے دیکھا اور وہاں ننھے منے پیاروں کو دیکھا - کیا بتاؤں یہاں نرسیں کس محبت والفت سے بچوں کی دیکھ بھال کر رہی تھیں - ڈاکٹر تھے کہ فرائضِ منصبی سے آشنا اور جذبۂ خدمت سے سرشار! ایک جگہ دیکھا کہ باہر ایک گیلری میں کئی ٹیلی وژن رکھے ہیں اور ان میں ایک کمرۂ اپریشن میں کیے جا رہے اپریشن کو دکھایا جا رہا ہے اور طلبہ و طالبات بڑے انہماک سے اس اپریشن کو دیکھ رہے ہیں - میں اور سعد یہ بھی کافی دیر کے لیے یہاں رک گئے -

اس میٹرنٹی ہسپتال میں امیر و غریب کا کوئی تصور نہیں ہے - یہاں یہ طبقاتی کشمکش موجود نہیں ہے - میں نے متعدد وارڈوں میں جاکر انتظامات ہی کو نہیں بلکہ میں نے یہاں باتھ روم تک دیکھے اور بڑی حیرت سے دیکھے کہ یہاں وہ آسانیاں مریضوں کے لیے میسر تھیں کہ جو بڑے بڑے ہوٹلوں ہی میں دیکھی جا سکتی ہیں - ہر مریض نرس سے بات کرنے کے لیے اپنے بستر پر "واکی ٹاکی" رکھتی ہے - اس ہسپتال میں مریضوں یا زچاؤں سے ملنے والوں کے آنے کی اجازت نہیں ہے - ملاقات صرف ٹیلی وژن پر کی جا سکتی ہے اور اس کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں -

اس ہسپتال کی ہر منزل پر جگہ جگہ اقوالِ کم ال سنگ بڑے اہتمام و احترام کے ساتھ کندہ ہیں۔میں نے مترجم سے ان اقوال میں سے چند کا ترجمہ کرایا اور سنا۔ان سب میں احترام انسان اور خدمت خلق کا درس ہے اور کارکنان کو آمادۂ خدمت رہنے کی تلقین ہے۔یہاں بعض اقوال سیاسی نوعیت کے بھی ہیں مگر ان کو تعمیر کے درس کی تعریف میں لایا جا سکتا ہے۔

طبِ مشرقی

اس الٹرا ماڈرن ہسپتال میں طبِ مشرقی کوریائی کے انتظامات دیکھ کر میں وَرطۂ حیرت میں پڑ گیا! یہاں خالصاً طبّی علاج کیا جاتا ہے مگر حسب ضرورت دونوں علاج ملا کر بھی کیے جا سکتے ہیں۔ اس شعبے سے متعلق دوا سازی کا پورا نظام موجود ہے کہ جس میں جدید ترین مشینری لگی ہوئی ہے اور طبّی دوائیں بالکل جدید انداز پر ہسپتال میں داخل مریضوں کے لیے تیار ہو رہی ہیں۔

"— مریض کی صحت اولین ضرورت ہے۔اس کے لیے طب کوریائی سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے اور اس طب کو طب جدید کے برابر کا مقام دینا چاہیے اور اس ورثۂ وطنی سے مریضوں کی شِفا کا سامان کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کرنی چاہیے —"

صدر کم ال سنگ کا یہ قول بڑے وقیع انداز میں ایک دیوار پر مزین ہے۔اس شعبۂ طب کو تشخیص کے لیے جدید آلات کی تمام سہولتیں میسر ہیں۔ پیتھالوجیکل لیبورٹریاں ہیں ، ایکسرے پلانٹس ہیں ، اکوپنکچر کے جدید ترین آلات ہیں اور سب کچھ وہ ہے کہ جو طب جدید کے لیے دیا گیا ہے۔یہ اندازِ فکر نہایت اہم ہے ،اور اس کے لیے میں جناب کم ال سنگ کی اصابتِ رائے کا قائل ہو گیا ہوں۔ وہ ہر میدان میں رہنمائی دیتے ملتے ہیں۔ اس ہسپتال کی تعمیر میں انھوں نے ذاتی دلچسپی لی ہے۔وہ خود متعدد کمروں میں گئے ہیں جن پر ان کی آمد کی اہمیت کے علامتی بورڈ آویزاں ہیں اور مریض ان کمروں میں رہنے میں بڑا فخر محسوس کرتے ہیں۔

طب مشرقی کے لیے اس قدر و منزلت کو دیکھ کر میرا دل باغ باغ ہوگیا ہے۔ طب و طبیب کو یہاں جو عزت و تکریم حاصل ہے اور فنی تعصب جس طرح ناپید ہے وہ ہزار تحسین و آفرین کا مستحق ہے۔ اس فکر بلند نے صدر کم ال سنگ کے لیے میرے دل میں عزت مزید پیدا کر دی ہے۔

مختلف شعبے

میں نے وہ شعبے بھی دیکھے کہ جہاں ایسی خواتین داخل ہیں جن کے بچے ہونے والے ہیں اور ان کے امتحاناتِ ضروری ہو رہے ہیں۔ پھر وہ شعبے دیکھے کہ جہاں زچہ خواتین ہیں۔ ان پر توجہ اعلا پیمانے پر ہو رہی ہے۔ وہ شعبے دیکھے جہاں سینکڑوں بچے نرسوں کی نگرانی میں حفاظت سے ہیں۔ اور وہ شعبہ بھی دیکھا کہ جہاں قبل از وقت پیدا شدہ بچے رکھے گئے ہیں۔ ان بچوں کی حفاظت و پرداخت کا اعلا ترین انتظام ہے۔

موازنہ

میں نہیں چاہتا کہ اس ہسپتال کا پاکستان کے ہسپتالوں اور میٹرنٹی ہوموں سے کوئی موازنہ کروں۔ میں اپنے ملک کے ہسپتالوں کا حال جانتا ہوں اور یہاں جو غیر انسانی ماحول ہے اس سے بہ خوبی واقف ہوں۔ دراصل ہمارے ہاں کے یہ ہسپتال پیسہ کمانے کے مراکز ہیں۔ جب میں پیونگ یانگ کا یہ میٹرنٹی ہسپتال دیکھتا ہوں اور پاکستان کے میٹرنٹی ہسپتالوں کا حال دیکھتا ہوں تو میرا سر ندامت سے جھک جاتا ہے۔

مسئلے کا حل

پاکستان میں نظامِ طب کی بد حالی سے کون واقف نہیں ہے۔ اگر میں اصلاحِ حال کے لیے یہ نسخہ تجویز کروں کہ پاکستان میں خدمتِ طب و صحت (ہیلتھ سروسز) کو سرکاری تحویل میں لے لینا چاہیے تو ایک سوال یہ ہوگا کہ انتظامیہ کی دیانت و امانت کی کیا ضمانت ہے!

واقعہ یہ ہے کہ ہمیں ہر حال میں انقلابِ فکر کے لیے اپنے تعلیمی نظام کو بدلنا ہوگا اور اپنی تعلیم اور تنصیب میں احترام انسان کو مرکزیت دینی ہوگی اور تعلیم میں درسِ اخلاق کو بدرجۂ کمال اولیت دینی ہوگی۔ جب تک قلبِ انسانی میں دردِ انسانی کو محسوس کرنے کا سامان نہیں کیا جائے گا استواریٔ حالات کی توقع نہیں کی جا سکتی اور کوئی انسان اس نکتے کی اہمیت نہیں سمجھ سکتا کہ ایک انسان جو دولت کما رہا ہے اس میں ان کا حق ضرور ہے کہ جو نادار ہیں۔ اس نکتے کو سمجھانے کے لیے صاحبانِ اقتدار کو دیانت کی رفعتوں تک جانا ہوگا اور نظامِ حکومت کو دیانت و امانت کی عظمتوں سے آشنا ہونا ہوگا۔

پاکستان میں نظام طب و صحت انتہائی بدحالی اور بدعملی کا شکار ہے۔ شعبۂ صحت کے بقراط توانائیٔ فکر و نظر سے عاری ہیں اور ان کی باگ ڈور ملٹی نیشنل کارپوریشنوں کے ہاتھ میں نظر آ رہی ہے اور اس لیے پاکستان دواسازی میں اغیار کا دست نگر ہے۔ ہمارے ہاں منصوبہ ہائے صحت ہم تصنیف نہیں کرتے بلکہ باہر کے لوگ ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ بہ حیثیتِ مجموعی یہ نظامِ طب و صحت سازشوں کا شکار ہے جہاں صحت و عافیت کا گزر ممکن نہیں ہے۔

پاکستان میں نظامِ اسلام لانے کے لیے جو راہیں ہم نے اختیار کی ہیں وہ منزل تک پہنچانے والی نہیں ہیں۔ فلاحی مملکت کا خواب محض فکرِ بلند سے شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا، اس کے لیے دیانتِ عمل بھی درکار ہے۔ باتیں اور نعرے ہمارے درد کا مداوا نہیں ہو سکتے۔ صدر ضیاء الحق بلاشبہ نیک نیت ہیں اور پاکستان میں شریعتِ اسلامی دیانت داری کے ساتھ ان کی منزل مقصود ہو سکتا ہے۔ میں ان کی نیت پر کوئی شبہ نہیں کر سکتا کہ وہ دیانت و امانت کا مفہوم سمجھتے ہیں۔ مگر جس انداز سے وہ کام کرنے پر مجبور ہیں میری رائے میں ان کی کامیابی مشتبہ ہے۔ نفاذِ شریعتِ اسلامی میں صدر ضیاء الحق کی ناکامی پاکستان کا مسئلہ نہیں رہے گی بلکہ اس ناکامی کے اثرات عالمی سطح پر مترتب ہوں گے۔

طب کے میدان میں

میں طب کی بات یقین کے ساتھ کر سکتا ہوں کہ اس میدان میں صدر ضیاء الحق صاحب کی فکر میں کوئی کجی نہیں ہے بہ ایں ہمہ جہاں تک طب کے لیے مثبت پیش رفت کا تعلق ہے وہ نفی کی حیثیت رکھتی ہے۔ میں ان کا مشیر برائے طب ہوں، مگر گزشتہ تین سال سے زیادہ میں اس درجہ بے دست و پا رکھا گیا ہوں کہ میں طب کے لیے کوئی ایک کام بھی ایسا نہ کر سکا کہ جو ترقئ طب کی تعریف میں آتا ہو اور بالآخر مجھے خاموشی اختیار کرنی پڑی۔

اس کے برعکس کوریا میں طب مشرقی کا بول بالا ہے۔ یہاں صدر کم ال سنگ نے طب مشرقی کے لیے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اس میں ریسوچ کر کے اس کو ایک عصری سائنس کا درجہ دیا جائے گا اور یہ کہ شفائے امراض کا اس سے سامان، تو اس کے عملی مظاہر ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ اس پیونگ یانگ میٹرنٹی ہسپتال میں طب کو عمل کی حالت میں دیکھ کر مجھے رشک آیا اور اپنے ہاں قطعی بے عملی پر نوحہ خوانی کو بے اختیار دل چاہا۔

قابلِ تقلید

مجھے بتایا گیا کہ پیونگ یانگ میٹرنٹی ہسپتال جیسا تمام سنگ مرمر کا عظیم ہسپتال جس میں دو ہزار کمرے ہیں صرف چھے ماہ کی قلیل مدت میں تعمیر ہوا ہے، اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس انداز کے دنیا بھر میں جو ہسپتال ہیں ان میں اسے سرِفہرست ہی رکھا جا سکتا ہے۔ یہ اس قوم کا حال ہے کہ جس کی فعالیت کو تباہ کرنے میں جاپان اور امریکا نے پوری طاقت صَرف کر دی۔ اور آج یہی قوم سرِ افتخار بلند کر کے ہمیں دعوتِ فکر و عمل اور درسِ تقلید دے رہی ہے!

ری کلینک

شمالی کوریا میں ایک نظام یہ رائج ہے کہ دیہاتوں اور شہروں

کو علاقوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ان کی آبادی کے مطابق ان میں ہسپتال یا کلینکس قائم کیے گئے ہیں - وہ کلینک کہ جو تقریباً بیس ہزار آبادی کے لیے ہوتا ہے اسے "ری کلینک" کا نام دیا گیا ہے- آج پیونگ یانگ میٹرنٹی ہسپتال دیکھنے کے بعد ایک ری کلینک بھی دیکھا کہ جو ہمارے ہوٹل سے قریب تر ہے - بتایا گیا کہ شہر پیونگ یانگ میں ایسے کم و بیش ایک سو کلینک قائم ہیں - یہ آؤٹ ڈور مریضوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں اور ضرورت ہو تو ری کلینکوں سے مریض ہسپتالوں کو بھجوادیے جاتے ہیں-ہر "ری کلینک" جدید و قدیم دونوں طریقہ ہائے علاج پر قائم ہے اور مریض کو بھی نیز کلینک کو اختیار ہے کہ تشخیص کے مطابق جس قسم کا علاج چاہیے تجویز کر دے-ری کلینک جسے میں نے دیکھا ہے اس میں اس وقت تقریباً ۲۰ معالج کام کر رہے ہیں اور یہاں مریضوں کا اوسط ۶۰-۷۰ سے آگے نہیں بڑھتا - موسم کے اعتبار سے کمی بیشی کا امکان رہتا ہے- اگر یہ اعداد و شمار صحیح ہیں تو پھر اس پر غور کرنا چاہیے کہ شمالی کوریا میں مریض کم ہیں اور ڈاکٹر زیادہ ہیں :

مریضوں کے کم ہونے کا واضح امکان موجود ہے اس لیے کہ:

- یہاں کے لوگ ، مرد ہوں یا عورتیں نیز بچے ، جفاکشی کی زندگی گزارتے ہیں-عورتیں ہر جگہ کام کر رہی ہیں اور ان کو یہ مواقع حاصل نہیں ہیں کہ وہ گھروں میں بیٹھ کر آرام کی زندگی گزاریں- یہی حال مردوں کا ہے-اور بچوں کو جس انداز سے تعلیم و تربیت دی جا رہی ہے اس میں سخت ورزش اور سخت کوشی کا دخل ہو گیا ہے-
- یہاں غذاؤں میں ملاوٹ کا کوئی تصور موجود نہیں ہے-ریاست نے اپنے فرائض کا بدرجۂ کمال ادراک کیا ہے اور روٹی ، کپڑا ، مکان واقعتہً ہر ایک کو فراہم کر دیا ہے -
- دیانتِ قیادت نے یہاں ہر انسان کو تعمیری ذہن عطا کر دیا ہے ، اور منزل کا تعین کر دیا ہے-کوریا کو جاپان کی غلامی سے اور پھر امریکی استعمار سے جس طرح گزرنا پڑا ہے اور پھر ۱۹۴۵ء میں آزادی کا سورج یہاں طلوع ہوا ہے اس کے بعد

سے اب تک ۳۷ سال کے عرصے میں شمالی کوریا میں جو تعمیری پیش رفت ہوئی ہے اس پر حیرت کی جا سکتی ہے ۔ جنوبی کوریا کہ ہنوز امریکی استعمار کی گرفت میں ہے ترقی و تعمیرمیں بیش بیش ہے اور یہ اندازہ کر لینا اور باور کر لینا ممکن ہے کہ کوریا کے لوگ بہ حیثیتِ مجموعی جفاکش ہیں اور ذہین ہیں۔ اور اپنے نفع و نقصان کو سمجھنے کی ان میں پوری صلاحیت موجود ہے۔

ایسے افراد کو بیمار پڑنے کی فرصت کہاں مل سکتی ہے! وقوع امراض یہاں مقابلۃً کم ہے۔ اس کے برعکس تعلیم طب پورے تسلسل کے ساتھ جاری ہے اور معالجین اس قدر تعداد میں تیار ہو رہے ہیں کہ ان کی کھپت کا انتظام بھی ساتھ ہی کیا جا رہا ہے اور ہسپتالوں اور کلینکوں میں کہ جہاں ایک کی ضرورت ہے وہاں دو تین معالج ہیں۔ "ری کلینک" میں معالجین کی زیادتی کی وجہ سمجھ میں آ سکتی ہے۔

ہر "ری کلینک" میں دونوں علاج موجود ہیں، طب مشرقی اور طب مغربی۔ ان کے مابین کوئی اختلاف رائے موجود نہیں ہے۔ قائد کوریا کم ال سنگ نے تعصبات سے اذہان کو پاک کر دیا ہے اور مریض کی صحت کو اولین حیثیت دی ہے۔ یہاں کوئی فرد قائدِ کوریا کے انداز فکر کے خلاف کام نہیں کر سکتا۔ اس میں جبر بھی ہے اور اس میں محبت بھی ہے۔ جبر و محبت کا توازن یہاں کامیابیوں کی ضمانت ہے ۔ اور میری رائے یہ ہے کہ اگر قیادت دیانت دار ہو اور راہِ عمل سیدھی ہو اور اس میں کوئی غلطی نہ ہو تو پھر جبر اور محبت دونوں کا استعمال حسب حال کیا جانا چاہیے تاکہ استقامت کا مزاج پیدا ہو سکے ۔

شمالی کوریا میں نظام تعلیم وتربیت

آزادی کے فوراً بعد جمہوریہ میں جس امر پر فوری توجہ دی گئی وہ عوام کے لیے حصولِ تعلیم کو لازمی قرار دینے کا اہم مسئلہ تھا تاکہ ملک سے ناخواندگی کا مکمل خاتمہ ہو جائے اور آبادی کے عام

ثقافتی معیار کو بلند کیا جائے۔

جُمہوریہ میں بلا استثنا لازمی ابتدائی تعلیم کا آغاز ۱۹۵۲ میں ہوا ۔ پھر بلا استثنا لازمی ثانوی تعلیم سے ۱۹۵۸ء میں ، بلا استثنا نو سالہ فنی تعلیم سے ۱۹۶۷ء میں اور اس کے بعد بلا استثناء گیارہ سالہ لازمی تعلیم سے ۱۹۷۲ء میں متعارف کرایا گیا ۔

جمہوریہ میں بلا استثناء گیارہ سالہ لازمی تعلیم کنڈرگارٹن میں اسکول سے پہلے ایک سالہ کورس (پانچ سال تک کے بچوں کے لیے) چار سالہ پرائمری تعلیم اسکول کورس (بچوں کے گروپ بعمر ۶ سے ۱۰ سال تک) اور چھے سالہ سینئر مڈل اسکول کورس (بچوں کے گروپ بعمر ۱۰ سے ۱۶ سال تک) پر مشتمل ہے ۔

پہلے اس گیارہ سالہ لازمی تعلیم کو ۱۹۷۲ء میں شروع کر کے ۲۰ فیصد سالانہ کی شرح سے پانچ سالوں میں پورے ملک سے متعارف کرانے کا منصوبہ بنایا گیا تھا ۔ لیکن یہ مجوزہ وقت سے پہلے ہی ۱۹۷۵ء میں مکمل ہوگیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے تمام حصوں میں اضافی طور پر کنڈرگارٹنز ، پرائمری اور سینئر مڈل اسکولز بنا دیئے گئے ۔ یوں کنڈر گارٹنوں کی تعداد پانچ ہزار سے اوپر پہنچ گئی ۔ اور تعلیم پانے کی عمر کے تمام بچوں کے لیے گیارہ سالہ لازمی تعلیم ممکن بنانے کے لیے پرائمری اور سینئر مڈل اسکولوں میں جماعتوں کی تعداد چھیالیس ہزار ہو چکی تھی ۔

اس نئے نظام اور اسے عملی جامہ پہنانے کے نمایاں وصف یہ تھے:

۱۔ گیارہ سالہ لازمی تعلیم کا نظام اس انداز پر قائم کیا گیا ہے کہ اس کے تحت عام ثانوی تعلیم کی تکمیل کے لیے لگاتار گیارہ سال تک تعلیم دی جا سکتی ہے ۔

۲ ۔ بچوں کی دیکھ بھال اس وقت تک حکومت کی نگرانی میں ہوتی رہتی ہے جب تک وہ کام کرنے کی عمر کو (۱۶ سال) نہیں پہنچ جائے

۳ ۔ گیارہ سالہ لازمی تعلیم بلا استثناء ہے اور حکومت اس امر کی ضمانت دیتی ہے کہ تمام بچوں کو لازمی تعلیم دی جائے ۔ معذور بچوں کو بھی اس گیارہ سالہ لازمی تعلیم سے بہرہ ور کیا جاتا ہے ۔

۲۔ گیارہ سالہ لازمی تعلیم ، نرسری اسکولوں اور کنڈرگارٹنوں میں بچوں کی پرورش اور اعلا درجے کے خصوصی اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم دیے جانے اور تعلیم کے ساتھ کام سکھانے کا نظام سب بالکل مفت ہیں ۔ کہیں بھی کوئی فیس نہیں لی جاتی بلکہ حکومت اسکول کی وردیاں ، دیگر ضروری سامان اور وظائف بھی جاری کرتی ہے نیز طلبہ کے لیے اچھی رہائش کا بندوبست کرتی ہے ۔

تعلیم کے مقتضیات اور طریق تعلیم کی اہم خصوصیات یہ ہیں :۔

۱ ۔ تعلیم کا مقصد لوگوں کو ایسے علم سے آراستہ کرنا ہے کہ وہ ذہنی، اخلاقی اور جسمانی لحاظ سے جوچے طرز کے لوگ بن جائیں ۔

۲ ۔ تعلیم حقائق کی بنیادوں پر استوار کی جاتی ہے ۔ اور فرد کے اپنے ملک کے وسائل ، قدرتی مناظر اور آداب فن کے مطابق دی جاتی ہے ۔ بالفاظِ دیگر سائنسی اور فنّی تعلیم میں " جُوچے " کو نمایاں کیا جاتا ہے ۔

۳ ۔ اس امر کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے ، خاص طور پر ثانوی تعلیم میں اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ سائنس اور فنی صلاحیتوں میں ترقی ہو ۔ اس ضمن میں طلبہ کو پابند کیا جاتا ہے کہ وہ کم از کم ایک فنی مہارت ضرور حاصل کریں ۔

۴ ۔ لوگوں میں شعورِ زندگی اُجاگر کرنے کے لیے نظریہ اور عمل میں یگانگت ، اور تعلیم کی پیداواری محنت سے مطابقت کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے ۔

اس تعلیمی نظام کا مقصد عوام کو ہر فن مولا یا گُنوں کی پوٹلی بنانے کے بجائے انقلاب اور تعمیر کے عمل میں موثر کردار ادا کرنے کا اہل بنانا ہے لہذا سماجی سیاسی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے ۔

۵ ۔ تعلیم کے خود آموز طریقے جیسے کہ اشاراتی ، سوال جواب کی صورت اور موئی تعلیم کے وسائل اختیار کرنے پر زور دیا جاتا ہے ۔

۶ ۔ طلبہ کی شخصیت ، میلانِ طبع اور خود مختاری کے شعور کو

پروان چڑھانے کے لیے غیر معمولی نصابی سوگرمیوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے جو آرٹ اور جسمانی نشوونما اور کھیلوں سے ہم آہنگ ہوتی ہیں۔

۷۔ طلبہ کو اجتماعیت کی تعلیم دی جاتی ہے۔ تعلیم میں اس اجتماعی اصول کو کہ "ایک فرد سب کے لیے اور سب ایک فرد کے لیے ہیں" ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ بعض ذہین اور از خود ترقی کرنے والے بچوں پر زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی۔

ایک نرسری اسکول کا نقشہ

اس نظامِ تعلیم کے تحت عملی اقدامات کا کیا انداز ہے، اس کے لیے ایک تعلیم گاہ کا نقشہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں:

جمہوریہ کوریا میں نرسنگ اور تربیتِ اطفال کا قانون نافذ ہے جو ۱۹۷۶ء میں بنایا گیا تھا۔ اب اسی کے تحت بچوں کی نرسنگ اور تعلیم عمل میں آتی ہے۔ یہ قانون نرسنگ اور تربیت اطفال کے بنیادی اصول، احتیاج اور طریقے اور اس مقصد کے ضروری سامان اور سہولتوں پر وضاحت سے روشنی ڈالتا ہے۔

"بچے ملک کے مستقبل کے نمائندے ہیں۔ معاشرے کے متوقع معمار اور ہمارے انقلابی نصب العین کے امین ہیں۔ انہیں ہی انقلاب کو آگے بڑھانا ہے۔"

(جمہوریہ کے قانون نرسنگ و تربیت اطفال کی شق نمبر ۱)

"بچے چمنستانِ قوم کی کلیاں ہیں جنہیں کھل کر پھول بننا ہے۔"

(اسی قانون کی شق نمبر ۲۲)

یوں قومی تعلیم کے ضمن میں نرسنگ اور بچوں کی تربیت ایک اہم حصہ قرار پاتی ہے۔

اس سونگرم نرسری میں تمام سازو سامان اور خدم و حشم کی سہولیات اور تدریسی مواد مہیا کیا گیا ہے جو جمہوریہ کی اس

پالیسی کے بھی عین مطابق ہے جس کے تحت بچوں کا قوم کے "بادشاہوں" جیسا احترام کیا جاتا ہے۔

یہ اسکول آٹھ عمارتوں پر مشتمل ہے جن میں پانچ سو کمرے ہیں۔ ایک صحن ہے جس کی کل گنجائش ١٢٠٠ پیونگ ہے۔اس میں ڈیڑھ ہزار بچے سما جاتے ہیں۔

کامپلیکس کے ملازمین کے تمام بچوں کو یہاں داخلہ ملتا ہے۔ انہیں انتہائی چھوٹی عمر ہی سے انقلابی ثقافتی اور سائنسی تعلیم دی جانے لگتی ہے۔ان کی صحت و تندرستی کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔نرسنگ اور کلاسوں کے علاوہ یہاں کھیل کے کمرے، ایک تالاب، بیت الخلا اور غسل خانے ہیں۔

ہر جماعت میں ٢٦ بچے ہوتے ہیں جن کی دیکھ بھال ایک گورنس، ایک کنڈرگارٹر اور ایک نرس مشترکہ طور پر کرتی ہیں۔

اس نرسری اسکول میں خاص طور پر ایک ہسپتال قائم ہے جہاں پندرہ ڈاکٹر تعینات ہیں۔ان کا اولین فرض ہے کہ احتیاطی علاج کی پالیسی کو مد نظر رکھتے ہوئے بچوں کا طبی معائنہ اور مرض کی روک تھام کر کے ان کی صحت کی حفاظت کرتے رہیں۔

حکومت جس طرح بچوں کی صحت پر توجہ اور امراض سے تحفظ پر زور دیتی ہے اس نے ہم پر گہرا اثر مرتب کیا۔

اس نرسری میں بچوں کی روزمرہ زندگی سے متعلق ہر بات کا خیال رکھا گیا ہے اور ہر چیز مہیا کر دی گئی۔ان میں کھلونے، کھانے پینے کی دکانیں، حجام کی دکان اور حمام شامل ہیں۔

تعلیم دینے میں خود آموز طریق تدریس پر زیادہ انحصار کیا جاتا ہے۔بچوں کو چاق چوبند اور محنتی بنانے کے لیے عمل اور تجربے سے کام لیا جاتا ہے۔

بچوں کی نرسنگ اور تربیت کے دوران آرٹ کی تعلیم ایک اور امتیازی وصف پیدا کر دیتی ہے،کیوں کہ اس کے تحت انہیں گیت اور رقص اور قومی ساز بجانا سکھائے جاتے ہیں جس سے ان میں قومی فخر، شعورِ آزادی اور قوتِ تخلیق کے جذبات پروان چڑھتے ہیں۔

نرسری اسکول کی سربراہ نے ہمیں بتایا، "ہم قوم کے غنچوں کی انتہائی ذمہ داری سے آب یاری کر رہے ہیں۔" ان الفاظ سے اسلتذہ کی خود اعتمادی اور فخر مترشح ہوتا ہے۔

ایک پرائمری اسکول کا نقشہ

گیارہ سالہ لازمی تعلیم کے تحت یہ پرائمری اسکول چھے سے دس سال تک کی عمر کے بچوں کو چار سالہ تعلیم دیتے ہیں۔

ہم نے طلبہ کو اسکول میں غیر معمولی نصابی سوگرمیوں میں مصروف پایا حالاں کہ انہیں موسم گرما کی تعطیلات مل چکی تھیں۔ بچوں نے اسکول کے صدر دروازے پر قطار باندھ کر بڑے پر جوش استقبالیہ نعروں سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ ان کے چمکتے دمکتے چہروں اور پیار بھری نظروں سے خوش آمدید کا بھرپور خلوص جھلک رہا تھا۔

اسکول کی صدر معلمہ (ہیڈ مسٹرس) نے اسکول کی تعمیر، اس کی تاریخ اور اسکول چلانے کی امتیازی خصوصیات کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔

۱۹۷۲ء میں صدر کم ال سنگ اسکول سے متعلق واضح ہدایات دینے خود یہاں آئے تھے۔

فی الوقت اسکول میں نو سو طلبہ داخل ہیں۔ یہاں تیس کلاسیس ہیں اور ہر کلاس تیس طلبہ پر مشتمل ہے جنہیں پینتالیس اساتذہ پڑھاتے ہیں۔ فی جماعت طلبہ کی نفری اور اس کے مقابلے میں اساتذہ کی تعداد نے ہمارے لیے لمحۂ فکر یہ مہیا کر دیا. کیوں کہ ہمارے پاکستان میں حالات قطعی برعکس ہیں۔

اس پرائمری اسکول کے ایک کمرے میں تدریسی امداد کی پانچ سو ایسی اشیاء رکھی ہوئی ہیں جن میں ایک "مقصدی سبق کے لیے نصابی کتاب" بھی شامل ہے جو اساتذہ نے خود ذاتی غور و تفحص سے کام لے کر تیار کی ہے۔

طلبہ کو ذہین ولائق بنانے کا دارومدار اساتذہ کی پیہم کاوشوں پر ہوتا ہے۔ اس اسکول کے اساتذہ نے ان تھک محنت اور عرق ریزی

سے کام کر کے تدریسی امداد پر مبنی پچاس ہزار اشیائے صرف سال رواں میں تیار کی ہیں ۔اس فکری کاوش کو خود انحصاری کا جذبہ اور مشرقی تعلیم کا عملی نمونہ ہی قرار دیا جائے گا ۔

یہ تدریسی امدادی اشیاء نہ صرف خود آموز ، اشاراتی اور سوال جواب طریق تعلیم میں وسیع پیمانے پر استعمال ہوتی ہیں بلکہ طلبہ کا نام روشن کرنے میں بھی افادی کردار ادا کرتی ہیں ۔

انداز تعلیم و تربیت یہ ہے کہ طلبہ کی ایک ٹکڑی (برانچ) کو آئندہ ہفتے کے کسی کام کے منصوبے پر بحث مباحثہ کرنے کا موقع دیا جاتا ہے ۔اسی ٹکڑی کا ایک قابل و ہونہار نوجوان صدارت کے فرائض سر انجام دیتا ہے جب کہ بقیہ ارکان تنقید اور خوداحتسابی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں ۔اور بڑے مدلل انداز میں اپنی اپنی تجاویز پیش کرتے ہیں ۔

اسباق رواج کے مطابق صبح اور دوپہر کے اوقات میں دیے جاتے ہیں ۔غیر معمولی نصابی سرگرمیاں اختیار کرنے کی آزادی ہے جو وہ اپنی صلاحیتوں اور ذوق کے مطابق اپناتے ہیں ۔طلبہ از خود بھی موسیقی ، جسمانی نشوونما اور کھیلوں اور فنی مہارات میں اپنی پسند کے مطابق حصہ لیتے ہیں ۔

یہ عمدہ ثمرہ بھی اسی نظریہ اور رفاہی معلمی کے طریق کار کی منہ بولتی تصویر ہے جسے اس نہج پر بروئے کار لایا گیا ہے کہ بچے تعلیم پا کر عالم محض نہ بنیں نہ علم ان کے سینوں ہی میں بند رہ جائے بلکہ تعلیم انہیں ایک اچھا اور کام کا انسان بنائے ۔

ایک مڈل اسکول کا نقشہ

یہاں دس سے سولہ سال تک کی عمر کے ان بچوں کو چھ سالہ عام ثانوی تعلیم دی جاتی ہے جو پرائمری اسکول کا کورس ختم کر لیتے ہیں ۔

ثانوی تعلیم کا امتیازی وصف یہ ہے کہ یہ نظریہ کو عمل سے مربوط کرتی ہے یعنی رفاہی تعلیم کے نظریہ (Thesis on Socialist

Education) کی بنیاد پر طلبہ کو تعلیم کے ساتھ ساتھ پیداواری محنت سکھائی جاتی ہے۔ فنّی تعلیم پر خصوصیت سے توجہ دی جاتی ہے، اور تمام طلبہ کے لیے لازمی ہے کہ وہ بنیادی معلومات اور فنّی شد بد پیدا کرنے کے لیے کم از کم کسی ایک قسم کی فنّی مہارت سیکھیں۔ چوبیس مضامین پڑھائے جاتے ہیں جن میں مارشل کم ال سنگ کی انقلابی سرگرمیاں، کمیونسٹ اخلاقیات، مادری زبان، غیر ملکی زبان، فزکس، کیمسٹری، بایولوجی اور الیکٹریکل انجینئرنگ شامل ہیں۔ ان میں سے سولہ یا سترہ مضامین تمام درجوں کے لیے مشترک ہیں اور باقی اس درجے کی استعداد کے مطابق ہوتے ہیں۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ آرٹ اور جسمانی نشوونما کے مضامین سب کے لیے اہمیت رکھتے ہیں۔ نچلے درجوں کے طلبہ کو باہر لے جا کر معائنہ اور مشاہدہ کی بنیاد پر اسباق پڑھائے جاتے ہیں۔ اور تعلیم کو عملی تجربے سے مربوط کیا جاتا ہے جب کہ اعلاد رجوں کے طلبہ کو فیکٹریوں میں لے جا کر عملی تربیت کے ذریعہ سے پڑھایا جاتا ہے۔

جہاں تک تدریسی طریقۂ تعلیم کا تعلق ہے بنیادی توجہ یہاں بھی پرائمری اسکول کی طرح خود آموز مثلاً مکالماتی، اشاراتی، تجرباتی اور عملی طریقے پر دی جاتی ہے۔

سینئر مڈل اسکول میں حکومت کے مقررہ امتحانات بھی لیے جاتے ہیں جن میں دس نمبروں کا طریقہ رائج ہے۔ نو۔دس نمبر شاندار قابلیت، سات، آٹھ اچھی قابلیت، پانچ، چھے نمبر عام قابلیت اور چار یا اس سے کم نمبر گھٹیا قابلیت قرار پاتے ہیں۔

طلبہ کی فاضلانہ استعداد کو فروغ دینے کے لیے بنیادی توجہ اسباق میں باقاعدگی اور تسلسل پر دی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی غبی طلبہ کو ان کے ہم جماعت اور اساتذہ مکالماتی اور مخصوص رہنمائی کے ذریعہ سے مسلسل تعلیم دیتے رہتے ہیں اور یوں پھسڈی طلبہ بھی امتحان میں کامیاب ہونے کے قابل بن جاتے ہیں۔

مجھے بتایا گیا کہ اسکول میں تعلیم دینے کا مقصد صرف چند

خوبیاں پیدا کر دینا نہیں ہے بلکہ تمام طلبہ کی صلاحیتوں کو سراہا جاتا اور انہیں فاضلانہ لیاقت کا حامل بنایا جاتا ہے۔

سینئر مڈل اسکول کے فارغ التحصیل، کالجوں یا خصوصی نوعیت کے اعلا اسکولوں میں داخلہ لیتے ہیں۔معدودے چند ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی خواہش یا میلانِ طبع کے مطابق ملازمتیں حاصل کر لیتے ہیں -

چوں کہ فیکٹری طرز کے کالج اور فیکٹری طرز کے خصوصی اعلا اسکول کام کے مرکزوں سے وابستہ ہوتے ہیں اس لیے تعلیم کے ساتھ ساتھ کام کے اس نظام کی بدولت لوگ ساری زندگی کام کرتے رہتے ہیں اور علم بھی سیکھتے رہتے ہیں -

اس سوال کے جواب میں کہ جرائم پیشہ طلبہ نے جو ایک عوامی تکلیف دہ صورت پیدا کر دی ہے یہاں ایسے مسئلہ کے لیے کیا سوچا گیا ہے ،پورے وثوق کے ساتھ بتایا گیا کہ " اس اسکول میں ایک بھی جرم پیشہ یا خطاکار طالب علم نہیں ہے -بلکہ میرا خیال ہے پورے ملک میں کوئی جرم پیشہ نہیں ملے گا -اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں تعلیم " رفاہی تعلیم کے نظریے" کے مطابق دی جاتی ہے اور خاص طلبہ کی خامیوں ، کمزوریوں کا علاج باقاعدہ نظریاتی تعلیم اور سب کی مشترکہ مدد کے ذریعہ سے کر دیا جاتا ہے -یہاں فرد اور گروہ میں کوئی اختلافِ رائے نہیں پایا جاتا -دونوں کی ایک ہی منزل ہے - اسکول ، والدین اور مُعاشرہ باہم مل کر بچوں کی تعلیم کے لیے سعی وجہد کرتے ہیں -لہذا کوئی طالب علم گڑبڑ پھیلانے کا مرتکب نہیں ہوتا نہ بلا اجازت اسکول سے بھاگتا ہے بلکہ طلبہ اسکول کے اوقات کے بعد بھی کچھ اور دیر تک اسکول میں رہنا پسند کرتے ہیں -وہ اسکول کی زندگی میں لذت و آسودگی پاتے ہیں کیوں کہ یہاں ان کی دلچسپی کے انتہائی شاندار لوازمات موجود ہیں اور ان پر جبر کرنے کے بجائے ان کی ذات کا احترام کرتے ہوئے تعلیم دی جاتی ہے -"

یہ نتیجہ خیز صورتِ حال رفاہی تعلیم کی افادیت کے طفیل پیدا ہو سکتی ہے -

۱۵ ستمبر نرسری

میں نے اپنے پروگرام میں دو چیزوں کو پوری اہمیت کے ساتھ شریک کیا ہے: یعنی نظام طب و صحت کا مطالعہ اور نظام تعلیم بچگان کا مطالعہ - میرے مطالعے کے یہ پروگرام ساتھ ساتھ چل رہے ہیں - صبح میں نے ادارہ ہائے طب و صحت کا مطالعہ کیا ہے اور اصول تعلیم اور نظام تعلیم کا مطالعہ کرتے ہوئے اب شام کو میں ایک اور نرسری میں آگیا ہوں اور میں نے یہاں بچوں کے ساتھ کوئی ڈھائی گھنٹے صرف کیے ہیں -

نرسری پر جب ہماری موٹر پہنچی تو باہر دروازے پر نرسری کی منیجر / ڈائریکٹر محترمہ کم ینگ سُک استقبال کے لیے موجود تھیں اور ان کے ساتھ ۱۵ - ۱۲ بچے بچیاں (عمریں تین سال سے کم) — ان پیارے بچوں نے مخصوص انداز سے ہاتھ بلند کر کے اور ہلاکر ہمارا استقبال کیا - اس میں اچھلنا بھی شریک ہے - استقبال کا یہ انداز ایسا ہے کہ بچوں اور بڑوں میں مشترک ہے - میں اس کے مناظر کوریا آنے کے بعد سے یہاں آج تک دیکھ رہا ہوں - اندازِ استقبال کی تربیت بچپن ہی سے دی جارہی ہے اور ۱۹۴۵ء سے اب تک صدر کم ال سنگ کی قیادت میں کم از کم تین نسلیں بڑی ہو گئی ہیں اور جس شدت کے ساتھ کم ال سنگ کے اثرات اذہان پر ڈالے گئے ہیں اور پورے تسلسل کے ساتھ ایسا کیا گیا ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ کوئی ذہن و فکر "کم ال سنگ گرفت" سے باہر نہیں ہے -

بچوں کے پُرجوش استقبال کے بعد جب ہم ان کے قریب گئے تو بچے بچیاں دیوانہ وار ہم سے چمٹ گئے - ان کی آرزو تھی اور خواہش، اور اس میں ہر بچہ پیش پیش تھا، کہ ہم ان کو اپنی گودوں میں اٹھا لیں - میں نے بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ یہ معصوم بچے محبت کے بھوکے ہیں - ان کی مائیں کاموں میں اس طرح مصروف ہیں کہ وہ ان کو نرسری میں پیر کی صبح چھوڑ جاتی ہیں اور پھر جمعے کی شام کو انہیں لینے آتی ہیں - نرسری میں ان کی زندگی ایک نظام کے تحت چلتی ہے اور یہ نظام ہرچند کہ ہمہ قسم کی آسائش پر قائم ہے مگر ماں کی محبت کا اہم عنصر اس میں موجود

نہیں ہے اور یہ وہ سب سے بڑی محبت ہے کہ نرسوی اس کا کوئی بدل پیش نہیں کر سکتی۔ اس نظام کا منشا درحقیقت یہ ہے کہ بچہ ابتدائی زندگی سے فکر و عمل میں ازاد ہو جائے اور ماں باپ پر اس کا تکیہ نہ رہے۔ میرا مطالعہ اس باب میں ہنوز تشنہ ہے کہ اس فراق کے اثرات خاندانوں اور مجموعی طور پر سوسائٹی پر کیا مرتب ہو رہے ہیں۔ میرے ساتھ جو گائڈ صاحبہ ہیں ان کے دو بچے ہیں: ۶ سال اور ۱۰ سال کے مگر یہ گزشتہ سات دن سے میرے ساتھ شب و روز ہیں۔ ان کو لازماً میرے ساتھ رہنا ہے اور میرا مترجم کہ جو کم ال سنگ یونیورسٹی کا طالب علم ہے وہ رات دن میرے ساتھ ہے۔ جب سے سرزمین شمالی کوریا پر میں نے قدم رکھا ہے (۱۲/اپریل شب) یہ دونوں آج (۲۰/اپریل ۱۹۸۲ء) تک ایک گھنٹے بلکہ ایک لمحے کے لیے بھی الگ نہیں ہوئے ہیں۔ بہ الفاظِ دیگر ہمیں یہ آزادی "نصیب" نہیں ہے کہ ہم ان کی نظروں سے بچ کر نکل جائیں! اس خاتون کا شوہر ضرور کام پر ہوگا اور بچے نرسری اسکول میں ہوں گے اور ماں سے بچے اب اس وقت ملیں گے کہ جب ۲۳/اپریل ۱۹۸۲ء کی سہ پہر کو میں بیجنگ چلا جاؤں گا۔ یہ رجمنٹیشن کیا مسائل پیش کرتی ہے اس کا مطالعہ میں نہیں کر سکا ہوں۔ مگر تجربات یہ ہیں کہ ایک وقت آ کر رہتا ہے کہ لوگ اس اندازِ زندگی سے فرار کی راہ اختیار کرتے ہیں، اور اس فرار پر بندشیں بغاوت کی راہیں تیار کر دیتی ہیں۔ شمالی کوریا میں اب میں نے دیکھا ہے کہ کپڑے اچھے پہننے پر پابندی ختم کر دی گئی ہے۔ خواتین شاید "میک اپ" بھی کر لیتی ہیں۔ "ہیلتھ کلب" میں جو انتظامات ہیں وہ رجمنٹیشن سے فرار کا نتیجہ ہیں۔ جب چین میں یہ نظام تھا تو وہاں بھی بغاوت ہوئی تھی۔ وہاں کا ثقافتی انقلاب (کلچرل ریوولیوشن) درحقیقت قیادت سے بغاوت تھا جسے چیرمین ماؤزتنگ کی فراست نے حکومت کے حق میں کر دیا، اس لیے کہ خود چیرمین ماؤزتنگ اس بغاوت میں "شریک" ہو گئے اور انہوں نے بھی بغاوت والے بیجز خود اپنے یونیفارم پر آویزاں کر لیے اور اس طرح بغاوت کا رخ موڑ دینے میں وہ وقتی طور

کامیاب ہو گئے تھے۔ مگر مرنے کے بعد ان کو اس کا "خمیازہ" بھگتنا پڑا۔ اور چین میں قیادتِ نو نے ان کو فراموش کر دینے کے سارے انتظامات کر دیے ہیں اور اس کے ساتھ ہی چین میں فکر و نظر کی آزادی بحال کی جا رہی ہے۔ اب غور یہ کرنا ہے کہ کم ال سنگ صاحب اس ڈوری کو کس حد تک کھینچیں گے اور کب وہ اس میں ڈھیل ڈالیں گے۔

نرسری کا ایک تعلیمی پروگرام دیکھا کہ بچے سب سے پہلے صدر کم ال سنگ کی تصویر کے سامنے ادب و احترام سے رکوع کی حد تک جھکتے ہیں۔ پھر ان کو خاندان کم ال سنگ کے بارے میں بتایا جاتا ہے۔ نرسری کے اسباق میں صدر کم ال سنگ کے سامنے احتراماً جھکنا اور ان کی نیز ان کے خاندان کی جدوجہد آزادی کا درس لینا اور دینا اولین اہمیت کا حامل ہے۔ نرسری کی تمام تعلیم اسی انداز پر ہے۔ بایں ہمہ بچوں کے کھیل کود اور ان کے لیے آسائشوں کی افراط ہے۔ اس نرسری میں حسب ذیل انتظامات ہیں:

- قومی نغموں کو اہمیت حاصل ہے۔ پیانو یا دوسرے سازوں کی تانوں پر بچے ان کو گاتے ہیں اور رقص بھی کرتے ہیں۔ یہ وہی تعلیم ہے کہ جس کا مظاہرہ بڑوں نے پرسوں کم ال سنگ اسٹیڈیم میں کیا۔ وہاں ساٹھ ہزار طالب علموں کا ہر مظاہرہ نرسری تعلیم کا عکسِ جواں تھا۔

- تعلیم نرسری میں بس گنتی کی حد تک ہے۔ یہاں تو آگے تعلیم کے لیے بچوں کو تربیت کا سامان اولین اہمیت رکھتا ہے۔ اور تربیت کا نقطۂ آغاز احترامِ قائد ہے۔

- اس نرسری میں ایک بار خود قائدِ کوریا آئے اور وہ ایک کھٹولے کو پکڑ کر کھڑے ہو گئے۔ اب وہ کھٹولا اہم ہو گیا ہے، اور اس پر ڈیکوریشن ہو گیا ہے۔ نرسری میں جو بچہ زیادہ نمایاں کام کرتا ہے اسے یہ کھٹولا سونے کے لیے ملتا ہے۔

- سونے کے انتظامات خوب ہیں۔ دو منزلہ کھٹولے ہیں۔ یہ وہی انداز ہے کہ جو افواج کے رہنے کا ہوتا ہے۔

• ان بچوں کے لیے غسل خانے ہیں - ان کے سائز کے کموڈ ہیں۔ پھر ان کے کھانے کے کمرے (ڈائننگ ہال) ہیں جہاں چھوٹی چھوٹی میزیں اور کرسیاں ہیں۔

• اس نرسری میں بچوں کے لیے سویمنگ پول بھی ہیں جن کے پانی کا درجہ حرارت موسم کے مطابق کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔

• ایک بڑا ہال ہے کہ جہاں بچوں کے لیے موٹریں اور سائکلیں ہیں اور اسی قسم کے دوسرے سامان ہیں۔

• ایک بڑا ہال انڈور گیمز کھیلنے کے لیے ہے۔ اس میں والی بال وغیرہ کے انتظامات بھی ہیں۔ یہاں ایک ریل گاڑی کے دو ڈبے بھی ہیں جس میں بچے سوار ہو کر ہال کے ایک سرے سے دوسرے تک جا سکتے ہیں۔

• پانچ منزلہ نرسری کے صحن میں کھیلنے کودنے کے وسیع انتظامات ہیں - بچوں کے لیے جھولے ہیں - میری گو راؤنڈ وغیرہ

• بیس بستروں کا ایک مکمل ہسپتال بھی ہے جہاں علالت کی صورت میں بچے داخل ہو سکتے ہیں۔

• ایک میٹنگ ہال ہے کہ جہاں بچے ڈرامے اسٹیج کر سکتے ہیں۔ آج ہمارے لیے ایک خصوصی مظاہرہ ہوا جو زیادہ تر رقص و سرود پر مشتمل تھا۔

میں اور سعد یہ جہاں جہاں گئے اور جس جس کمرے میں گئے ہر جگہ ہی بچے ہم سے چمٹ گئے - وہ واقعی محبت کے بھوکے تھے۔ ہم نے باری باری جتنوں کو گود میں لے سکتے تھے ان کو گودوں میں لیا - پیار کیا - محفل رقص و سرود برپا کر کے تمام بچے ہم پر دوڑ پڑے اور ان کا دل یہی چاہتا تھا کہ ہم ان سے جدا نہ ہوں۔

حاسن پرائمری اسکول

تین بجے سہ پہر ہیونگ یانگ حاسن نام کے ایک اور پرائمری

اسکول پہنچ گئے - یہاں حسین و جمیل بچے دو رویہ قطاروں میں کھڑے تھے اور انہوں نے ہمارا پُرجوش استقبال کیا - اس استقبال و اکرام نے مجھے بڑا ہی متاثر کیا ہے - اندر داخل ہوئے تو ڈھول باجے سے دوسرے چھوٹے چھوٹے بچوں نے ہمیں خوش آمدید کہا اور کئی بچیاں تو ہم سے چمٹ چمٹ گئیں - اس پُر محبت ماحول میں ہم ڈھائی گھنٹے اس اسکول میں رہے -

شمالی کوریا میں ہر تعلیم کا نقطہ آغاز بہر صورت عظیم قائد کوریا جناب کم ال سنگ کی شخصیت اور ان کی اور ان کے خاندان کی جدوجہد آزادی کا بیان ہے - اور پھر غیرملکی استعمار کے خلاف جنگ وجہد کی فہم نظامِ تعلیم کا نقطۂ فکر ہے - آزادی کی قدروقیمت کا درس تعلیم کی جانُ ہے اور تعمیرِ وطن اور خدمتِ عوام اور کارکن کا احترام تعلیم کا جوہر ہے - کوریاً میں تمام تعلیم لازمی ہےاور بلاقیمت ہے - غالباً ایسا کوئی قانون نہیں ہے کہ اگر کوئی بچہ اسکول نہ جائے تو والدین قابلِ مواخذہ ہوں ، لیکن حقیقت یہ ہے کہ کوئی ماں باپ ایسے نہیں ہیں کہ جو بچے کو تعلیم سے محروم رکھیں - تعلیم کے لیے جو ماحول کوریا میں موجود ہے وہ ہر بچے کو خود میں جذب کر لینے کی پوری طاقت و صلاحیت رکھتا ہے - یہاں یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ والدین اپنے بچوں کو لیے لیے در در پھریں اور درس گاہوں میں ان کی تعلیم کے لیے جگہ نہ ہو - کوریا میں ایسا نہیں ہو سکتا - یہاں کوئی بچہ گلیوں میں گِلّی ڈنڈا کھیلتا اور سڑکوں پر آوارہ پھرتا اور گھروں میں بے مقصد پڑا نہیں مل سکتا - ایسا یہاں ممکن نہیں ہے کہ غریب بچے تعلیم سے محروم رکھے جائیں اور امیروں کی اولاد اسکولوں میں جا کر زیورِ تعلیم سے آراستہ ہو — یہ نو آزاد شمالی کوریا ہے - یہ پاکستان نہیں ہےکہ جہاں دو تہائی سے زیادہ بچے تعلیم سے محروم رکھے جاتے ہیں اور ۳۲ سال کے بعد آج بھی تعلیم ۱۵ فیصد سے آگے نہ بڑھ سکی اور ۸۵ فیصد لوگ ان پڑھ ہیں اور جاہل ہیں - عوامِ پاکستان کو اس الم ناک حالتِ جہل میں رکھنے پر کسی حکومت کا دل آج تک نہیں دُکھا ہے اور پاکستان کا کوئی وزیرِ تعلیم شرم کے مارے ڈوب کو نہیں مرا ہے - ۱۹۴۵ء میں کوریا جب آزاد ہوا تو تناسبِ تعلیم ۲۱ فیصد

تھا اور آج ۳۷ سال کے بعد یہاں سو فیصد لوگ پڑھے لکھے ہیں ، اور جہالت و جہل کا کوئی تصور کوریا میں موجود نہیں ہے - یہ انقلاب عظیم ہے اور اس انقلاب کے بانی کلیتہً کم ال سنگ ہیں ، تعلیم کے میدان میں جن کی ولولہ انگیز قیادت کو سلام کرنے کو بے اختیار دل چاہتا ہے -

کوریا کے دستور کا آرٹیکل نمبر ۵۹ ہر شہری کو تعلیم کی ضمانت دیتا ہے :

Citizens have the right to education. The right is guaranteed by the advanced educational system, free compulsory education and other educational measures of the State for the people.

دستور کی اس شق پر اس وقت کوریا میں تمام و کمال عمل ہو رہا ہے - جس کوریا میں آزادی کے وقت ایک تعلیم گاہ نہ تھی وہاں آج ہزارہا اسکول ، سینکڑوں کالج اور درجن سے زیادہ یونیورسٹیاں موجود ہیں -

حاسن پرائمری اسکول میں تعلیم کے لیے ہر سہولت میسر ہے - نہایت صاف ستھرا ماحول ہے - اس میں تقریباً آٹھ سو بچے پڑھ رہے ہیں - یہ وہ بچے ہیں کہ جن کے گھر اسی علاقے میں ہیں - وہ قطار اندر قطار پیدل چل کر بڑی آسانی سے اسکول میں آتے جاتے ہیں - ٹرانسپورٹ کا کوئی مسئلہ نہیں ہے - ہر آبادی میں اس کے لیے جگہ مخصوص اور مقرر ہے - وہاں اسکول ہی بن سکتا ہے ، وہاں کسی وزیر یا امیر یا کسی صاحب بہادر کا بنگلہ تعمیر نہیں ہو سکتا - اسکول کے لیے جو جگہ مختص ہے آبادی کے بعد وہاں لازماً اسکول تعمیر ہوگا اور ایسا ہو رہا ہے -

آٹھ سو بچوں کے لیے کم از کم تیس تربیت یافتہ خواتین ٹیچرز ہیں اور وہ سب کی سب اسی علاقے میں رہتی ہیں - کلاس روم کشادہ ہیں اور کسی کلاس میں ۳۳ سے زیادہ بچے نہیں ہیں -

اس اسکول میں ہر اسکول کی طرح انڈور گیمز بھی ہیں اور کھیل کے لیے کھلے میدان بھی موجود ہیں۔ اس اسکول کی اپنی لائبریری ہے جہاں سے بچوں کے لیے لائبریری اصول کے مطابق کتابیں اشوع ہوتی ہیں۔ رقص و موسیقی کی تعلیم بھی لازماً دی جاتی ہے۔ سائنس کے تجربات کے لیے بچوں کے لیے پورا سامان ہے۔ ایک کلاس میں ہم نے تجربات کرتے ہوئے دیکھا۔ اپنے ملک کے بارے میں معلومات بھی تعلیم کا اہم جزو ہے۔ یہاں نباتات کیا ہوتے ہیں، جمادات کیا ہیں، حیوانات کون سے ہیں، ان سب کے ماڈل اس اسکول میں موجود ہیں۔ پھر ٹیچرز تعلیمی چارٹ تیار کرتی ہیں اور ان کی مدد سے تعلیم دی جاتی ہے۔ اس اسکول میں ہر اسکول کی طرح ایک کمرہ طبی سہولت کے لیے موجود ہے اور جہاں ایک خاتون ڈاکٹر موجود ہے۔ یہ کمرہ براہ راست " ری کلینک " کے زیر نظام رہتا ہے۔ بچوں کو سال میں کم از کم ۱۵ انجیکشن چھوت والے امراض سے بچانے والے لازماً دیے جاتے ہیں۔

ایک کمرے میں تبرک و تقدس کے طور پر وہ کوٹ محفوظ کیا گیا ہے جس پر صدر کم ال سنگ کا ہاتھ لگا تھا۔ یہ کوٹ ایک شیشے کے بکس میں ہے جس پر غلاف ڈھکا ہوا ہے۔ ہمیں یہ کوٹ دکھانے کے لیے پورے احترام سے غلاف کو ہٹایا گیا۔ اس کوٹ کا یہاں سب کے سب اساتذہ و طلبہ پورا احترام کرتے ہیں۔ اسکول کی ہر گیلری میں اقوال صدر کم ال سنگ لگے ہوئے ہیں اور ہر کمرے میں ان کی تصویر موجود ہے اور بعض گیلریوں میں آزادی کی جنگ کے مناظر بھی ہیں اور تعمیری جد وجہد کی نقشہ کشی بھی ہے۔

کوریا میں ہر اسکول کا بلکہ کہنا چاہیے کہ ہر درس گاہ کا انداز یہی ہے، اور یہ کہ یہاں ہر قدم صدر کم ال سنگ کا رہین منت ہے۔ یہ بڑی دلچسپ حقیقت ہے کہ صدر کم ال سنگ صاحب نے کم و بیش ہر اسکول کو کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور دیا ہے جس کی بڑی قدر و منزلت کی جاتی ہے، وہ خود بھی اسکولوں کالجوں میں پہنچ جاتے ہیں، یا کوئی نہ کوئی ہدایت بھجوا دیتے ہیں۔ تعلیم سے کم ال سنگ صاحب کا یہ شغف بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اور اس شغف اور تعلق نے کوریا میں انقلاب کا سامان کیا ہے اور اس قوم کو عظمتوں سے

ہم کنار کر دیا ہے۔

ڈھائی گھنٹے اس ماحول میں رہنے کے بعد جب ہم باہر آئے تو ہمارے لیے وہی سازو آہنگ تھا کہ جو آمد پر ہمیں خوش آمدید کہہ رہا تھا اور باہر سینکڑوں بچے قطار اندر قطار ہمیں " کم ال سنگ حافظ " کہنے کے لیے موجود تھے ! ہم بچّوں کے جلومیں اپنی موٹر تک آئے اور اس میں سوار ہوئے ۔نہ بچے چاہتے تھے کہ ہم ان سے جدا ہوں اور نہ ہم خوش تھے کہ ہم اس ماحول سے جا رہے ہیں !

کم ال سنگ یونی ورسٹی

شمالی کوریا کے نظام تعلیم سے میری دل چسپی کی وجہ بیّن طور یہ ہے کہ میں اس کا پاکستان کے نظام تعلیم سے موازنہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔شمالی کوریا اور پاکستان کی آزادی کی عمر تقریباً ایک ہی ہے ۔حالات کا جو مطالعہ میں نے کیا ہے اس کی روشنی میں بلاخوفِ تردید میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ شمالی کوریا پر دورانِ جنگِ آزادی جو افتاد بن پڑی ہیں وہ بدرجہا شدید و کثیر ہیں ان سے کہ جن سے پاکستان کے قیام کے لیے ہمیں سابقہ پڑا تھا ۔اب تک دامنِ احتیاط تھامے جو حالات میں اپنے مطالعہ کے نتیجے میں لکھ چکا ہوں اور جو مجھے آگے لکھنے ہیں ان سے میری اس تحریر کا ہر قاری میری اس رائے کی تائید کرے گا ۔میرے اس موازنے میں مرتبۂ قیادت اور دیانتِ فکر و عمل کے اشارات لازماً آئیں گے ۔ پاکستان میں نظام تعلیم کے ساتھ گزشتہ ۳۲ سال سے جو الم ناک اور شرم ناک مذاق ہو رہا ہے اس کی اجازت صرف وہی قیادتیں دے سکتی ہیں کہ جو شقی القلب ہوں اور جن کو پاکستان سے اور پاکستان میں رہنے بسنے والی اُمّتِ مسلمہ سے کوئی محبت ہو نہ خلوص ۔ میں تو یہ تسلیم کرنے سے قطعی انکار کرتا ہوں کہ پاکستان میں نظام تعلیم کے نام کی کوئی چیز موجود ہے ۔ہاں نصابِ تعلیم ہمارے ہاں ضرور ہے مگر وہ بھی ہماری ملّی امنگوں کے مطابق نہیں ہے اور صریحاً ہمارے نظریۂ حیاتِ ملّی سے غیر آہنگ ہے بلکہ متضاد اور متخالف ہے۔

ماتم یہ ہے اور سخت ماتم ہے کہ ہم پاکستان میں نظامِ تعلیم مرتب کرنے میں آزاد نہیں رہے ہیں۔تعمیرِ وطن کی اِس اساسی اور بنیادی ضرورت پر بقراطی (بیوروکریٹک) فکر و نظر حاوی و غالب رہا اور میں اس بقراطیت کی امانت و دیانت پر سخت شبہ کرتا ہوں کہ اس کی وجہ سے پاکستان ہنوز جہل اور جہالت کی گرفت میں ہے۔

جامعۂ کم ال سنگ کو بار بار گزرتے ہوئے بہ جذباتِ رشک دیکھتا رہا ہوں ۔ تاثر یہی رہا کہ اس وسیع اور عریض و طویل قطعۂ زمین پر بلند و بالا عمارات تشنگانِ علم کی پیاس بجھانے کا سامان کر رہی ہوں گی۔پیونگ یانگ کی صاف ستھری سڑکوں سے گزرتا ہوا میں آج ساڑھے پانچ بجے شام جامعۂ کم ال سنگ میں داخل ہو گیا۔یہ میری بڑی تمنا تھی اور آرزو کہ میں اس شہرِ علم کو دیکھ لوں ۔

جامعۂ کم ال سنگ کے وائس پریسیڈنٹ صاحب نے اور ان کے رفقا نے میرا پُر جوش خیر مقدم کیا تھا۔میرے ساتھ میری بیٹی سعدیہ ہیں کہ جنھوں نے جامعۂ کراچی سے سماجیات میں ایم ۔اے کیا ہے ۔اور میرے جلو میں اخبارات کے نمائندے اور ریڈیو اور ٹیلےوژن کے رپورٹرز ہیں۔

ذہنی طور پر اور قلبی طور پر میں ان تمام مقامات کو جہاں تعلیم و تعلّم کا سامان کیا جائے اور انسانوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کیا جائے عبادت گاہوں کا مقام دیتا ہوں اور ان عبادت گاہوں میں مصروف انسانوں کو مقام شرف و عز دیتا ہوں اور ان کے احترام میں اپنا سر جھکا دیتا ہوں ۔جامعۂ کم ال سنگ کے نائب شیخ کے پر خلوص اور پر جوش استقبال کے لیے نہیں ، ان کے مرتبہ علمی کے سامنے میں نے اپنا سر جھکا دیا۔

یہ عمارت جس کے پورچ میں ہماری موٹرکار آ کھڑی ہوئی ہے جامعۂ کم ال سنگ کی اولین عمارت ہے۔ اس عمارت کے کانفرنس روم میں ہم پہنچ گئے جہاں بڑی سادگی تھی جو اس حقیقت کی غماز تھی کہ یہاں سادگی میں انسانی عظمتوں اور رفعتوں کا سامان کیا جاتا ہے ۔

مجھے بتایا گیا کہ اس یونیورسٹی کے محلِ وقوع کا انتخاب خود صدر کم ال سنگ صاحب ہی نے کیا تھا۔ نائب صدر جامعہ کم ال سنگ نے مجھے جامعہ کے بارے میں ضروری معلومات بہم پہنچاتے وقت یہ بات بڑی اہمیت کے ساتھ بتائی۔ اس جامعہ میں اس وقت بارہ ہزار طلبہ و طالبات زیرِ تعلیم ہیں۔ قیام کے بعد (۱۹۴۶) سے اب تک اس جامعہ سے ۳۰ ہزار گریجویٹ فراغت پا کر مختلف شعبہ ہائے زندگی میں مصروفِ تعمیر و ترقیٔ وطن ہیں۔ اس وقت جامعہ کم ال سنگ میں بارہ سو اساتذہ کی ایک مخلص ٹیم ہے کہ جو تعلیم دینے میں شب و روز مصروف ہے۔ جامعہ کم ال سنگ میں ۷ ہزار طلبہ موجود ہیں اور ۵ ہزار بذریعہ خط و کتابت تعلیم پا رہے ہیں (اوپن یونیورسٹی)

اس عمارت میں اس جامعہ کی پوری تاریخ تصاویر اور نقشوں سے واضح کی گئی ہے۔ یہاں باور کرایا گیا ہے کہ جامعہ کی کوئی ایک تعمیری اینٹ صدر کم ال سنگ کے بغیر نہیں رکھی گئی ہے۔ وہ تعمیر کے ہر مرحلے پر موجود رہے ہیں۔ ان کی تصاویر اور ان کی ہدایات قدم قدم پر دکھائی گئی ہیں۔ اور پھر تعمیر کے بعد وہ جامعہ میں کم از کم ایک سو بار خود آ چکے ہیں۔ اور جامعہ کی تعمیر و ترقی کے لیے ان کی تحریری ہدایات کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے۔
میں نے اس صورتِ حال کو بڑے غور سے سنا اور دیکھا اور لمحہ بھر کے لیے میں پاکستان پہنچ گیا کہ جہاں برسرِ اقتدار حضرات کا حال یہ ہے کہ وہ کسی ایک جامعہ پاکستان میں قدم نہیں رکھ سکتے اور جہاں کوئی گورنر اور کوئی وزیر کسی جامعہ تو کیا کالج میں نہیں جا سکتا۔ تمام طالب علم ان کے وجود سے فرار رکھتے ہیں۔

جامعۂ کم ال سنگ کی سب سے بلند عمارت ۲۱ منزلہ ہے۔ میں نے اس کو اصرار کے ساتھ دیکھا۔ ہر منزل پر کلاسیں ہو رہی ہیں اور طلبہ و طالبات بغیر کسی ہنگامے کے تعلیم و تعمیر میں مصروف ہیں۔ سب کا لباس ایک ہے اور یہ ایسا لباس ہے کہ طلبہ پر افواجِ کوریا کا شبہ ہوتا ہے۔ میں نے کلاسوں میں جا کر اور بیٹھ کر دیکھا، اور نظم و ضبط نے مجھے بدرجۂ انتہا متاثر کیا ہے۔

میں نے ایک منزل سے دوسری منزل تک جاتے ہوئے سوال کیا:

"کیا یہاں جامعۂ کم ال سنگ کے طلبہ در و دیوار پر نعرے وغیرہ نہیں لکھتے ؟" نائب صدر جامعہ نے کہا "ان کے پاس لکھنے کے لیے کاغذ موجود ہے !" میں نے دل میں کہا کہ ہمارے ملک میں تو طلبہ کا یہ بڑا محبوب مشغلہ ہے کہ وہ اپنی درسگاہوں کے در و دیوار کو احتجاجی سلوگنوں سے منقش اور اظہارِ ناراضی کے لیے نعروں سے مُزیّن کر دیتے ہیں اور ہماری جامعات کے بیت الخلا "مہذب" اور "شائستہ" اقوال کے لیے بڑی موزوں جگہ تصور کیے جاتے ہیں !

اس ۲۱ منزلہ عمارت میں ایک منزل میں درجنوں کمپیوٹروں کا پورا نظام موجود ہے اور تعلیم کے لیے اس زبردست نظام کو دیکھ کر میں ورطۂ حیرت میں پڑ گیا اور میرا ذہن بے اختیار جامعہ قائد اعظم تک چلا گیا کہ جہاں بہ ہزار دقّت اور بہ ہزار بھیک ایک کمپیوٹر لگا ہے جس کے استعمال کا کوئی نظم ہے اور نہ ضبط !

جامعۂ کم ال سنگ کی لائبریری بیس لاکھ کتابوں پر مشتمل ہے - میں اس لائبریری میں گیا اور اس کو بدرجۂ کمال مصروف پا کر میرا دل داد دینے کو بے قرار ہو گیا - کئی منزلہ اس لائبریری میں درجنوں ریڈنگ روم ہیں کہ جہاں بڑی تعداد میں طلبہ مصروف مطالعہ و تحقیق ہیں -

ہمارے معائنے کا آغاز مرکزی عمارت ہی سے ہوا - ہم نے سب سے پہلے صدر کم ال سنگ کے بھیجے ہوئے تحفے دیکھے جو یہاں نمائش کے لیے قطار در قطار رکھے تھے - یہ شیشوں میں بند جانوروں اور ہڈیوں کے نمونے تھے - بے شمار نمونے دیواروں پر بھی آویزاں کیے ہوئے تھے -

کمرے میں داخل ہوتے ہی ہماری نظریں بُھس بھرے اس کوریائی شیر پر جم کر رہ گئیں جو دانت نکالے ہماری طرف دیکھ رہا تھا - اس کے سر پر ایک علامتی طفرے کا نشان بنا ہوا تھا جس کے معنی بادشاہ تھے - یہ شیر تحفے کے طور پر یونیورسٹی کو بھیجتے وقت صدر کم ال سنگ نے ہدایت کی تھی کہ اس کی کھال میں بھس بھر کر اسے محفوظ کر لیا جائے - اس کی ہڈیوں اور پیٹ کی دوسری چیزوں سے بھی ایک نمونہ تیار کیا جائے اور انہیں علمی سائنسی تحقیق

کے کام میں لایا جائے ۔

ہال میں جانوروں کے ایسے بہت سے نمونے رکھے ہوئے تھے جو زمین ، سمندر اور ہوا میں پائے جاتے ہیں ۔ان میں ایک سفید چکور واقعی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے ۔ سب جانتے ہیں کہ برفانی گراؤس (grouse) کے پر سردیوں میں سفید ہو جاتے ہیں لیکن سفید پروں والے چکور کے بارے میں کبھی نہیں سنا تھا ۔ مجھے بتایا گیا کہ صدر نے اسے بھی پرندوں کی تبدیلی رنگ کے بارے میں تحقیق کے لیے بھیجا تھا ۔

ایک مچھلی کا نمونہ بھی ہمارے لیے باعث حیرت بنا ۔ یہ مچھلی کافی بڑی اور چپٹی ہے ۔اس کی عمر تیس سال ہے ۔یہ ۲ء ۲ میٹر لمبی ، ۵ء۱ میٹر چوڑی اور ۳۷ سینٹی میٹر موٹی ہے ۔اس کا وزن ۱۳۵ کلو گرام بنتا ہے ۔

مچھلی کا ایک اور عجیب نمونہ دیکھا جسے کن یومو (Kinyomo) کہتے ہیں ۔بتایا گیا کہ عام طور پر اس کی رنگت سیاہی مائل ہوتی ہے مگر خلافِ معمول یہ مچھلی سرخی مائل رنگ کی تھی ۔

یہ تحفے نہ صرف اپنی کثیر تعداد کے لحاظ سے متاثر کن تھے بلکہ اس لیے بھی اہم تھے کہ ان سے صدر کی شفقت اور قلبی لگاؤ کا اظہار ہوتا تھا ۔ سربراہِ مملکت کی حیثیت میں ان کے شانوں پر بھاری ذمہ داریاں عائد تھیں اور وہ رفاہی تعمیر کو معجز نما رفتار سے ترقی دینے میں کوشاں تھے ،اس کے باوجود طلبہ پر ایسی نوازشات اس بات کا بیّن ثبوت تھا کہ انہیں طلبہ سے بے پناہ گہری محبت ہے اور ہر دم ان کی عظیم توقعات کا خیال رہتا ہے ۔یہی وجہ ہے کہ طلبہ بھی انہیں ایسی نگاہ سے دیکھتے ہیں گویا وہ ان کے فیاض اور شفیق باپ ہیں اور انہیں "ابوجی" ہی کہہ کر پکارتے ہیں ۔

اس کے بعد ہم نے یونیورسٹی کے وقائع کے لیے مخصوص نمائش ہال دیکھا تاکہ اس کے سنگ بنیاد رکھے جانے کا سراغ ملے ۔

یونیورسٹی کا قیام یکم اکتوبر ۱۹۴۶ء کو عمل میں آیا تھا ۔ مُبیّنہ طور پر ان دِنوں لوگوں کے دل ایک نئی امید سے معمور تھے لیکن ملک

ایک مشکل ترین صورت حال سے دو چار تھا، کیوں کہ صرف ایک ہی سال پہلے ۱۹۴۵ء میں جاپانی سامراج کے نو آبادیاتی نظام کا جؤا اُتار کر آزاد ہوا تھا۔

اساتذہ کا مسئلہ اور تعمیراتی مالی وسائل کی حالت خاص طور پر بہت پتلی تھی مگر صدر کم ال سنگ اس پر ڈٹے تھے کہ ایک یونیورسٹی کا قیام اشد ضروری ہے اور خواہ کچھ بھی ہو بن کر رہے گی۔

انہوں نے اپنے ارد گرد کے لوگوں سے تدریسی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے کہا اور ان کی تقرری کے احکامات بھی خود اپنے قلم سے لکھ دیے۔ یونیورسٹی کے قیام کی ہدایت دیتے ہی انہوں نے جگہ جگہ تقریریں کر کے عوام میں اپنی مدد آپ کا جذبہ پیدا کر دیا۔ وہ تعلیم کو ایسا بنیادی مسئلہ قرار دیتے تھے جو ملک کی تقدیر کا تعین کرتا ہے۔

صدر نے رفاہی معلمی سے متعلق نظریہ کی وضاحت "سوشلسٹ تعلیم پر مقالات" کے ذریعہ سے کر کے انہیں دنیا بھر کے عوام کے سامنے پیش کیا اور اپنا ایک ہم خیال طبقہ پیدا کر لیا۔

صدر کم ال سنگ عملے کی تربیت پر اتنی فکر مندی سے کیوں توجہ مرکوز رکھتے تھے؟ ہمارے معائنے نے اس بات کا احساس دلایا کہ ایک نئی ریاست کی تشکیل میں عملے کی تربیت ہی سب سے اہم مسئلے کی حیثیت رکھتی ہے۔ عظیم تخلیقی قوت کے بل پر عوام کی فہم و دانش اور طاقت و توانائی کو مجتمع کر کے نظریۂ حیات کی پالیسی نافذ کرنے کے لیے اور قومی معیشت کا دامن ترقی یافتہ سائنس اور ٹیکنالوجی سے بھرنے کے لیے اور ایک خود مختار، اپنا بوجھ آپ اٹھانے اور اپنا دفاع آپ کرنے والی ریاست کی تشکیل کے لیے نہایت ضروری ہے کہ غیر ملکی ماہرین کے بجائے ریاست کا خود اپنا تکنیکی عملہ موجود ہو۔

یونیورسٹی کے قیام کے بعد بھی صدر بقیہ تمام دشواریاں دور کرتے رہے۔ انہوں نے مسائل حل کر کے ایک لائبریری، ایک چھاپہ خانے، ایک کھانا کھانے کے ہال اور اقامت گاہوں کی تعمیر یقینی بنا دی۔ اور ۱۹۴۸ء میں زراعتی، انجنیئرنگ، میڈیکل اور دیگر کالج

قائم ہو گئے تھے۔

ایک بڑے ہال میں ہم نے ایک نمونہ دیکھا۔ یہ ۱ : ۱۰۰ کی پیمائش میں یونیورسٹی کا ایک ہُو بہُو اصل نمونہ تھا جس نے پُورے ہال کی جگہ گھیر رکھی تھی اور ایک ہی نظر میں پوری یونیورسٹی اور اس کے جناتی حجم کا اندازہ کرنے میں مدد دیتا تھا۔

بلڈنگ نمبر۱، مرکزی عمارت میں قدرتی سائنس کے شعبے بنے ہوئے ہیں۔ بلڈنگ نمبر ۲ میں عمرانی سائنس کے شعبے اور عمارت نمبر۳ ریاضی، فزکس اور کیمسٹری کے شعبوں کے لیے تجویز کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں یہاں ایک سائنس لائبریری ہے جس میں بیس لاکھ جلدیں اور بارہ سو سے زیادہ نشستوں کی گنجائش ہے۔ طلبہ کے ہوسٹل، کھانا کھانے کے ہال، صحت کی سہولتیں، ایک پرنٹنگ پریس، ایک اشاعت گھر اور دیگر عمارات ہیں۔ یونی ورسٹی کا صحن پندرہ لاکھ مربع میٹر رقبے پر محیط اور اس کا گھیر آٹھ کلومیٹر ہے۔

آخر میں نیچرل سائنس میوزیم دیکھنے گیا۔ تین منزلہ عمارت کا ایک حصہ جمادات پر مشتمل ہے، دوسری منزل میں نباتات اور تیسری منزل میں حیوانات ہیں، حسنِ ترتیب اور جمالِ تنظیم کی تعریف کیے بغیر رہا نہیں جا سکتا۔

صدر کم ال سنگ نے اس مرکزِ علم و حکمت کو "یونیورسٹی ولیج" کا نام دیا ہے اور بجا طور پر دیا ہے۔ لاکھوں میٹر میں یہ ولیج آباد ہے۔ اساتذہ کے مکانات دور سے دیکھے اور طلبہ کے رہائش گاہوں کو بھی بس فاصلے ہی سے دیکھا۔

تین گھنٹے تک جامعۂ کم ال سنگ پر اچٹتی ہوئی ایک نظر ڈالنے کے بعد میں واپس اولین عمارت میں آ گیا۔ نائب صدر صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ مجھ سے زیادہ وہ ممنون و متشکر نظر آئے کہ میں ہزارہا میل سے صدر کم ال سنگ کے جشنِ ولادت کی تقریبات میں شرکت کے لیے آیا اور پھر اس یونیورسٹی کو میں نے "اپنے قدوم میمنت لزوم سے سرفراز کیا!"

واللہ عجب حسین اخلاق کے لوگ ہیں!

میں نے جامعہ کم ال سنگ کی لائبریری کے لیے مطبوعاتِ ہمدرد نائب صدر صاحب کی خدمت میں پیش کیں جن کو انھوں نے بڑی مسرت کے ساتھ قبول فرمایا - میں نے آخری تبادلِ خیال میں مشورہ دیا کہ شمالی کوریا اور پاکستان کے مابین علمی اور تعلیمی سطح پر وفود کا تبادلہ ہونا چاہیے اور میں نے جامعۂ کم ال سنگ کے صدرِ گرامی قدر کو پاکستان آنے کی دعوت دیدی ہے -

یونیسکو میں اظہارخیال

ادارۂ اقوام متحدہ (یونائیٹڈ نیشنز) کے بارے میں اب عالمی سطح پر اختلاف رائے ہو گیا ہے - دنیا بھر میں سیاسی حالات اس درجہ ابتر ہو رہے ہیں اور اس سرعت کے ساتھ حالات بدل رہے ہیں اور اس پچیدگی کے ساتھ مسائل جنم لے رہے ہیں کہ خود ادارۂ اقوام متحدہ کا اتحاد، لگتا ہے کہ پارہ پارہ ہوا چاہتا ہے - اگر فکر ونظر میں انتشار کی یہی کیفیت باقی رہی اور بڑی طاقتیں باہم برسر پیکار رہنے کے لیے چھوٹی طاقتوں کو تختۂ مشق بناتی رہیں اور اقوام و امم کی نظریاتی سرحدوں کے انہدام کی کاوشیں جاری رہیں تو ادارۂ اقوام متحدہ کا حال اور انجام بالآخر لیگ اوف نیشنز سے کسی طرح مختلف نہ ہوگا -

بہ ایں ہمہ اقوام متحدہ کا ایک ذیلی "ادارۂ تعلیم، سائنس و ثقافت" یعنی یونیسکو، حتی الامکان سیاست سے ماوراء ہو کر اور رہ کر تعلیم، سائنس اور ثقافت کے میدانوں میں خلوص نیت کے ساتھ برسرعمل ہے - ۱۹۸۰ء کی بات ہے کہ یونیسکو نے اپنے ہیڈ کواٹرز، پیرس (فرانس) میں ایک "مذاکرۂ عالمی تعلیمی" کا اہتمام کیا - اس مذاکرے میں تمام دنیا سے مفکرین تعلیم کو دعوت شرکت دی گئی تھی، پاکستان سے، یونیسکو کے مستعد ڈائریکٹر جنرل ہز ایکسی لنسی احمد مختار امبو نے راقم الحروف (حکیم محمد سعید) کو یہ اعزاز دیا کہ اس مذاکرۂ عالمی تعلیمی میں میں شرکت کروں اور تبادلِ خیال میں حصہ لوں اور اپنے خیالات کا اظہار کروں -

اس مذاکرۂ عالمی کا موضوع تھا "تعلیم آنے والے دو[۲] عشروں میں" یعنی ۱۹۸۱ء سے ۲۰۰۰ء تک کے بیس سال کے عرصے میں نظام تعلیم میں کیا اصول اختیار کیے جائیں کہ اس کے عالمی سطح پر مثبت اثرات مرتب ہوں۔ یونیسکو کے زیر اہتمام اس مذاکرۂ عالمی تعلیمی کی بڑی اہمیت تھی اور اس مذاکرے کو پر مقصد اور موثر بنانے کے لیے یونیسکو نے فکر و نظر کی پوری توانائیوں کے ساتھ اقدامات کیے تھے۔

نظامِ تعلیم اور میرا نقطۂ نظر

اس مذاکرۂ عالمی میں میرا انداز فکر اس طرح تھا:

تعلیم کے میدان میں عالمی بحران کی وجوہ متعدد اور مختلف ہیں اور عالمی سطح پر گہرائی اور گیرائی کے ساتھ غور ہو رہا ہے۔ اس بحران کا کئی نقطہ ہائے نظر سے جائزہ لیا گیا ہے اور وقتاً فوقتاً یہی سوال ابھرتا رہا ہے کہ کیا انسانوں کو ایک تعلیمی نظام کے مطابق خود کو ڈھال لینا چاہیے یا پھر ایک نظام تعلیم کو انسانوں کی متغیر ضروریات کے مطابق خود کو ڈھالنا چاہیے؟

ہر نسل کے عہد میں یہ خیال متنازع فیہ رہا ہے کہ تعلیمی ترقی کو ہمیشہ اقتصادی ترقی پر فوقیت حاصل ہونی چاہیے۔ کس نسل نے اپنے بعد آنے والی نسل کے معیار تعلیم کی پستی پر نکتہ چینی نہیں کی ہے؟ اور کونسی نسل ایسی ہے جو خود اپنے نظام تعلیم کی نقاد نہ رہی ہو؟ اور اس کے باوجود حیرت انگیز طور پر دنیا مادی اعتبار سے نسلاً بعد نسلٍ مالا مال ہوتی چلی گئی۔

تعلیمی عمل، تاریخ کے کسی بھی دور میں ناہمواریوں، مسائل، حسرتوں اور توقعات سے خالی نہیں رہا۔ بہ قول ایچ جی ویلز "انسانی تاریخ روز بہ روز تعلیم اور سانحۂ عظیم کے درمیان ایک دوڑ کی حیثیت حاصل کرتی جا رہی ہے۔" ان کے اس تبصرے سے صاف عیاں ہے کہ ان کا مطلب اس تعلیم سے ہے جسے اقتصادی ترقی کے لیے شرط اول قرار دیا جاتا ہے۔ ان کی مراد وہ تعلیم ہے جو صرف اور صرف حصول اقتدار اور مادی فوائد کا ذریعہ قرار پاتی ہے۔

میری دانست میں ہماری بحث کا اصل نقطہ یہ ہے کہ اگر تعلیم کا مقصد یہ نہ ہوتا تو پھر اب تک کی جانے والی ترقی بالخصوص مادی ترقی کا حاصل کرنا ممکن نہ ہوتا ، لیکن اگر تعلیم والدین کے نقطہ نظر سے اطمینان بخش قرار پاتی اور خود اساتذہ اور طلبہ دونوں ہی کی نظر میں اسے یہ حیثیت و وقعت حاصل ہوتی تو آج وہ بحران جس سے تعلیم دوچار ہے اتنا بد شگون نہ قرار پاتا۔

یہ کسی ایک ملک کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ بہ حیثیت مجموعی پوری دنیا اس سے دو چار ہے اس لیے یہ ضروری ہے کہ اس مسئلے کا ایک آفاقی حل تلاش کیا جائے ۔

مادی ترقی میں سائنس اور سائنسی تعلیم کے کردار کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ لہذا آئندہ دو عشروں میں تعلیم عمومی کے مشمولات و لوازمات کے ارتقا میں اس حقیقت کا جائزہ لینا ہوگا کہ سائنسی ترقی مرحلہ وار منصوبہ بندی اور پروگرام سازی کا ایک ایسا انتہائی پچیدہ عمل ہے جسے ایک واضح تعلیم سائنس اور حکمت عملی کے مجموعی مقاصد کے حصول کے لیے کثیرالجہت حل کی حیثیت حاصل ہے۔اس نقطۂ نظر کی اساس یہ تصور ہے کہ ترقی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی ہر سطح کی تعلیم و تحقیق میں کسی بھی شعبے کو دوسرے شعبے پر برتری و فوقیت حاصل نہیں ہے۔ کوئی شعبہ دوسرے کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

تاہم اس استثنا کے ساتھ ہمیں سب سے زیادہ زور اور توجہ یونیورسٹیوں میں مختلف سائنسی شعبوں کی تعلیم کے معیارات کو بلند کرنے پر صرف کرنی چاہیے۔ اس کے بغیر مستقبل کی مادی اور ثقافتی میدانوں میں ہونے والی مساعی کے لیے ایک محفوظ اور مستحکم ذیلی ڈھانچے کا حصول و تعین ممکن نہیں ہے۔ لہذا یہ ضروری ہے کہ سائنسی حکمت عملی کے وضع کرنے میں اس بات کو اہمیت و اولیت دی جائے کہ کسی بھی ملک میں بنیادی و اطلاقی دو میدانوں میں تعلیمی اساس کو ایک فیصلہ کن حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں موجودہ صورت حال کے جائزے کی روشنی میں تربیت کے ایک وسیع مگر محتاط مرحلہ وار پروگرام کا آغاز لازمی ہے تاکہ سائنسی

تحقیقات اور تکنیکی صلاحیتوں کے مختلف شعبوں میں قیادت کا تدریجی فروغ یقینی ہو جائے۔

تحقیق و ترقی کی عمومی حکمت عملیوں کا سب سے اہم مسئلہ قومی سطح پر تحقیق کے خالص اور اطلاقی پہلوؤں کی اولیت و ترجیح کا تعین ہے۔قومی اور بین الاقوامی کانفرنسوں میں طویل بحث و تمحیص کے بعد یہ بات مکمل طور پر تسلیم کر لی گئی ہے کہ یہ دونوں پہلو اس حد تک باہم دگر پیوست ہیں کہ الگ الگ شعبوں میں ان کی تعریف و تعیین ممکن نہیں ہے۔علاوہ ازیں اب یہ بات بھی تسلیم کر لی گئی ہے کہ خالص اور اطلاقی میدانوں میں مصروف محققین اپنے مسائل ایک دوسرے کے سامنے حل کے لیے پیش کرتے رہتے ہیں اور وہ اس طرح ایک دوسرے کو توانائی اور طاقت بخشتے رہتے ہیں۔اس کے برخلاف موجودہ صدی میں سائنس برائے سائنس کے خالص اور الگ تھلگ انداز کو اقتصادی مجبوریوں کے باعث افادیت کے آستانے پر اپنا سر جھکانا پڑا ہے اور تحقیقی ادارے ایسے مسائل کی تحقیق پر اپنی مساعی مرکوز کرنے پرمجبور ہیں جو انتہائی اقتصادی فوائد کے لیے ملک کے قدرتی وسائل کے استعمال پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ صورت حال ایسے ملکوں کی تنظیموں کے لیے بڑی سنگین اور پریشان کن ثابت ہو رہی، کیونکہ اب یہ اصرار بڑھتا جا رہا ہے کہ ان تنظیموں کو ان پر خرچ ہونے والی رقوم کو جواباً نمایاں اقتصادی فوائد کی صورت میں پیش کر کے اسے حق بجانب قرار دینا چاہیے۔ نفع نقصان کے اس انداز پر اصرار سے قطع نظر جیسے صنعتی پیداوار کی طرح سائنسی منصوبوں کی کامیابیوں کا معیار نہیں قرار دیا جاسکتا، پیداوار کے متعلقہ شعبوں سے نتائج کے ہم آہنگ نہ ہونے کی صورت میں اطلاقی تحقیق سائنسی کارکنوں کی نظر میں بےوقعت ٹھہرتی ہے۔

گزشتہ تین عشروں میں پاکستان اور اس جیسے حالات سے دو چار ملکوں میں حاصل کردہ تجربات کی روشنی میں ہونے والی تحقیقات کی افادیت کا اندازہ کرنے کے لیے جائزہ نظام کا قیام ضروری ہے تاکہ ترقی کے مختلف میدانوں میں ہونے والی مقامی تحقیقات سے بھرپور استفادہ کیا جائے۔

آئندہ دو عشروں میں مربوط سائنسی پالیسی اور اس کی تعلیمی حیثیت و نوعیت کے بارے میں بہت کچھ کافی ہے مگر تنہا سائنس ہی تمام انسانی ضروریات کی کفیل نہیں ہو سکتی، کیونکہ انسانی احتیاجات محض مادی نہیں ہیں ان میں انسان کی ذہنی اور روحانی احتیاجات بھی شامل ہیں۔ بیسویں صدی کا آخری نصف حصہ انسانی تاریخ میں ایک بے مثال صورت حال کا مظہر ہے۔ اس کے سب سے نمایاں پہلو بڑی تعداد میں کئی یک قومی ملکوں کا ظہور، جوہری اسلحہ کا فروغ، جس سے خود نسل انسانی کا وجود معرض خطر میں ہے اور سب سے بڑھ کر انسانی آبادی میں زبردست اضافہ ہیں۔ اس کا ایک اور نمایاں پہلو اور قابل توجہ کیفیت تشدد میں روز افزوں اضافہ ہے۔ تشدد جو قوموں اور ملکوں کے درمیان پروان چڑھ رہا ہے، تشدد جو نظریات کے مابین بڑھ رہا ہے، تشدد جو قوموں کو ہلکان کر رہا ہے۔ اگر اس صدی کے گزشتہ عشرے مذکورہ بالا کیفیات کا محض مظہر ہیں تو پھر ایسی صورت حال میں آئندہ دو عشروں میں ان تمام مسائل کا ہجوم ہوگا اور پھر یہ ہجومِ بلا اپنی انتہا کو پہنچ جائے گا۔

ہماری بد قسمتی یہ ہے کہ بنیادی تعلیم جس کا مقصد اولیٰ ان مسائل کو حل کرنا تھا خود ان مسائل ہی سے بری طرح متاثر ہوگئی ہے۔ ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ملکوں کے درمیان روزافزوں اقتصادی اور تکنیکی فرق اسی صورت حال کو بد سے بدتر کر رہا ہے۔ ترقی پذیر ممالک ترقی یافتہ ملکوں کے ہم پلّہ ہونے کے لیے اپنا زیادہ سے زیادہ زور اور اپنی توانائیاں تکنیکی ترقی کے میدان میں صرف کر رہے ہیں تو دوسری جانب ترقی یافتہ ملکوں کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی برتری کو برقرار رکھنے کے لیے تکنیکی ترقی میں مسلسل اضافے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ دونوں ہی قسم کے ملک اپنے اسی مقصد کی قربان گاہ پر اخلاقی اور انسانی اقدار کی بھینٹ چڑھا رہے ہیں۔ —— بالآخر اس کا یہ قدرتی نتیجہ برآمد ہو رہا ہے کہ ہمارے تعلیمی نظام انسانی خوبیوں سے متصف انسان پیدا کرنے کے بجائے صرف تکنک کی مہارت سے مزین انسان تیار کر رہے ہیں۔ یہ بات کسی شک و شبہ کے بغیر کہی جا سکتی ہے کہ ایک عمدہ بنیادی تعلیم کا مقصد انسانی خوبیوں سے آراستہ انسان تیار کرنا ہے نہ کہ صرف تکنیکی مہارت کا حامل انسان۔

تاہم سائنس کی اس مشکل میں اور گومگو کی اس کیفیت میں کہ جس کی جانب میں نے اشارہ کیا ہے انسانی مستقبل کے نقطۂ نظر سے صورت حال امید افزا بھی نظر آتی ہے ، کیونکہ اب تیزی سے سکڑتی اس دنیا میں انسانی معاشروں کے باہمی انحصار کا احساس بھی تیزی سے بڑھ رہا ہے اور قوموں کے تعاون باہمی کی اشد ضرورت کے احساس میں بھی بڑی تیز رفتاری کے ساتھ اضافہ ہو رہا ہے۔ انسانوں میں ہمارے عہد کے سخت چیلنجوں اور ان کا سامنا کرنے کی ضرورت کے احساس کے ساتھ ساتھ بتدریج یہ شعور بڑھ رہا ہے اور ضرورت بھی محسوس کی جانے لگی ہے کہ سائنس ، انجینیرنگ اور فن تعمیر اور انسانی اور عمرانی علوم کے درمیان گہرا ربط ضروری ہے ، کیونکہ اس باہمی تعلق و ربط کے بغیر سائنسی علوم عہد حاضر کے معاشرے کو براہ راست متاثر کرنے سے قاصر رہیں گے یا بہ الفاظ دیگر وہ اپنے طلبہ کو جدید مدنیت کی روزافزوں ذمہ داریوں کو قبول کرنے کا اہل بنانے میں ناکام رہیں گے ۔ اس انداز فکر ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ اب بہت سے تکنیکی ادارے خود کو تکنیکل یونیورسیٹیاں کہلوانا پسند کرتے ہیں۔ وہ ان اداروں میں پیشہ ورانہ مضامین کے علاوہ انسانی اور عمرانی علوم کے ایک مربوط پروگرام کا اہتمام بھی کرتے ہیں تاکہ طلبہ تصورات و نظریات کی ایک وسیع دنیا سے متعارف ہو سکیں اور انہیں ان رجحانات و اعتقادات سے آگہی حاصل ہو جو موجودہ معاشرے کی ساخت اور اس کے تعین میں شامل ہیں۔ درحقیقت تصور یہ ہے کہ ایک انجینیئر کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ تاریخ و ادب کا مطالعہ محض تفنن طبع کی خاطر نہیں بلکہ اس لیے کرے کہ وہ اس کے بغیر ایک اعلا پائے کا سائنس داں یا انجینئر نہیں بن سکتا ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ مہارت خصوصی کے تعلیمی نظریے کے مقابلے میں ایک بڑا ہی اہم اور صحت مندانہ طریقہ کار ہے ۔ مہارت خصوصی کے تعلیمی نظریے کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے انسانوں کے رجحان کے باوجود علم کو بے شمار ذہنی اور فکری نظاموں میں بانٹ دیا ہے ۔ تعلیم کے اس پورے منصوبے کے از سر نو تعین کی اہمیت اور ضرورت کو تمام دنیا میں بڑی تیزی کے ساتھ قبول کیا جا رہا ہے ۔ اسے انسانی مسائل کی ترتیب و تنظیم کے سلسلے میں آفاقیت کی گہری آگہی کے ساتھ تسلیم کیا جا رہا ہے اور اب اس نے ترقی

پذیر ملکوں میں زرعی اور تکنیکی یونی ورسٹیوں کے قیام کے پروگرام کے سلسلے میں بڑی اہمیت حاصل کر لی ہے۔

میں نے سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ اس سمپوزیم کی تمام ترگفت گو سننے کے بعد آپ کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کے دور دراز علاقوں میں کسی حد تک تعلیم کے طریقہ ہائے عمل کے ازسر نو تعین کے نتیجے میں موجودہ کشیدگی اور دباؤ کم ہو جائے گا، لیکن سائنس جس طوفانی رفتار سے تسخیر فطرت کی منزل کی طرف پیش قدمی کر رہی ہے اس کے نتیجے میں وہ سفاک طاقتیں بے لگام ہو جائیں گی جو انسانیت کو جنگ و جدل، باہمی شورش اورخود تباہی کے جال میں پھانس رہی ہیں۔ آپ کا یہ تبصرہ جو خود ایک مجسم سوال ہے، درست و بجا ہوگا۔ اب یہ ایک آفاقی سوال کی حیثیت اختیار کرتا جا رہا ہے اور ہم سب ہی سے جواب کا طالب نظر آ رہا ہے۔ ہمارے عہد کے بہترین دماغ اس چیلنج کا سامنا کر رہے ہیں۔ تاہم جیسا کہ ہم سمجھتے ہیں یہ کوئی جدید سوال نہیں ہے۔ مثلاً گزشتہ صدی کے ایک عظیم شاعر فلسفی کے اس ارشاد کو غور سے سنیے۔

"دریافتوں اور پیش گوئیوں کی تڑپ ہمارے لیے ویسی ہی پُر کشش اور ناگزیر بن گئی ہے جیسا کہ بدبخت عشق عاشق کو اپنا فریفتہ کر لیتا ہے۔ ہمارے لیے علم ایک جذباتی شے بن چکا ہے جس کے لیے ہم نہ کسی قربانی سے دریغ کرتے ہیں اور نہ کوئی خوف ہمیں اس شوق سے باز رکھتا ہے، سوائے اس کے کہ یہ جذبہ ازخود سرد ہو جائے۔ یہ ممکن ہے کہ آخر کار انسانیت اس جذبۂ علم ہی کے ہاتھوں ختم ہو جائے، لیکن یہ ڈر بھی ہمیں مبتلائے خوف نہیں کر سکتا ہے۔ بلا شبہ ہم سب وحشت و بربریت پر نفرین بھیجتے ہیں۔ ہم سب اس بات کو ترجیح دیں گے کہ علمی تنزل و انحطاط کے بجائے انسانیت ختم ہو جائے۔ اور آخر میں یہ بات بھی یاد رہے کہ اگر انسانیت کی موت کسی شدید ہیجان و جوش کے ہاتھوں واقع نہ ہوئی تو پھر وہ کسی کمزوری کے باعث موت کے گھاٹ اتر جائے گی۔ سوال یہی ہے کہ ہم اس میں سے کس کو ترجیح دیں گے؟ یہی اصل سوال ہے۔ ہم انسانیت کو آگ اور روشنی کے ہاتھوں

ختم ہوتا دیکھنا چاہتے ہیں یا اسے خاک میں ملتا دیکھنے کے خواہاں ہیں ؟" یہ الہامی الفاظ سننے کے ہیں جس کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا ہے کہ

قلب او مومن دماغش کافر است

پیشہ اور تربیت کے اعتبار سے میں اس عربی ، اسلامی نظام طب کا معالج ہوں جس میں تشریح البدن اور قلبی و ذہنی کیفیات کو روح انسانی سے الگ تھلگ تصور نہیں کیا جاتا۔ دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور ان میں کسی کو بھی زندہ جسم سے الگ نہیں کیا جا سکتا ۔ اسی طرح میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ایک صحت مند عومی تعلیم کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ زندگی کے جسمانی اور ذہنی، معاشرتی ، اخلاقی اور روحانی پہلوؤں کے مجموعی فروغ کی سعی کرے، انہیں ایک دوسرے سے الگ تھلگ رکھنے کی کوشش نہ کرے ۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ عومی تعلیم کا بنیادی کام تلاش اتحاد ہو۔ انسان اور فطرت کا اتحاد ، فکر و عمل ، زندگی کے ظاہری و باطنی پہلوؤں کا اتحاد ، روح انسانی کے گوناگوں پہلوؤں کا اتحاد ، مشرق و مغرب کا اتحاد اور نسلوں ، ماضی اور مستقبل کا باہمی اتحاد ۔

لاریب انسان کے ثقافتی ورثے کی حیثیت سے تاریخ کا مطالعہ اہم ہے ، لیکن مطالعۂ تاریخ کے سلسلے میں ہمیں پوری کشادہ دلی کے ساتھ انسان کے قومی و بین الاقوامی ورثے کی ہر گراں قیمت شے کو قبول کرنا چاہیے اور ہمیں بلا کسی تردد کے ہر وہ شے رد کر دینی چاہیے جو کم زور اور پست ہو۔ ہر وہ شے ٹھکرا دینی چاہیے جو زندگی کے جدید اور اہم تقاضوں سے ہم آہنگ نہ ہو۔ پھر چاہے یہ باتیں کسی کے اپنے ملک کی ہوں یا مشرق و مغرب میں کسی سے ان کا تعلق کیوں نہ ہو۔ پیغمبر اسلام ؐ نے فرمایا کہ حکمت سچے مومن کی گم شدہ میراث ہے ، جہاں کہیں بھی ملے وہ اس کا حق دار ہے۔ بہ الفاظ دیگر ہر وہ شے جو حیات بخش ہو قبول کر لینی چاہیے اور ہر وہ شے جس سے زندگی کو گزند پہنچے رد کر دینے کے قابل ہے۔ لہٰذا بنیادی تعلیم کا فرض ہے کہ وہ ایک ایسے آزاد ذہن کی تخلیق کرے جو ہر قسم کے تعصبات سے پاک صاف ہو۔ آزاد ذہن یقین کامل، جرأت اور کمال و زیر کی کا مظہر ہوتا ہے ۔

اس لیے یہ میری پختہ رائے ہے کہ در پیش مسائل کی روشنی میں تعلیم عمومی کو بہتر بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم سائنسی ترقی اور ایسے اخلاق کے ایک ایسے امتزاج کی کوشش کریں جس کی مذہب تلقین کرتا ہے اور جس پر وہ عمل پیرا رہتا ہے۔ اخلاق انسانیت کا آخری سہارا ہے، اور یہ بات طے ہے کہ اعلا اخلاق کے تصور کے بغیر انسانی ذہن کی دوسری صلاحتیں ادھوری رہ جاتی ہیں۔

کسی بھی بنیادی تعلیم کا سب سے اہم مقصد ایسی مستحکم اخلاقی بنیادوں کا فراہم کرنا ہونا چاہیے جس پر شجاعت، یقین کامل، وفاداری، خوش اطواری اور شخصی ذمہ داری جیسی خوبیوں کے حامل کردار کے بلند و بالا ایوان کی تعمیر ہو سکے۔ عالی حوصلگی کے درس کا بہترین وقت بچپن ہے۔ یہ وہ خوبی ہے جو ہر سطح پر زندگی میں شیرینی گھولتی رہتی ہے اور اس کو تابندگی عطا کرتی ہے۔

اسی طرح اعلا تعلیم کا مقصد بھی ایسے نوجوان تیار کرنا ہونا چاہیے کہ جو نہ صرف یہ کہ مستقبل کے تقاضوں کی تعمیل کے لیے تکنیکی اور انتظامی صلاحیتوں سے آراستہ ہوں بلکہ وہ رواداری اور انکساری و شفقت کا نمونہ بھی ہوں۔ جنہیں صرف اور صرف سچائی سے عشق ہو اور ان میں صنعتی اور اس سے جنم لینے والے بربریت کے شکار معاشرے میں اسے روشناس کرانے کی جرأت ہو تاکہ اس معاشرے کی تلخیٔ کام و دہن شیرینی میں تبدیل ہو جائے اور اس کے اندھیروں میں وہ روشنی جگمگا اٹھے جو ثقافتوں کی امتیازی خصوصیت ہے۔ اب مغرب کے سائنس دانوں نے بھی مذہب کو ایک ایسی نفسیاتی اور ذہنی ضرورت کی حیثیت سے تسلیم کر لیا ہے جو دنیا کو مقام انسانیت پر فائز کر سکتا ہے، جو اسے انتشار اور نراج کی طاقتوں کے خلاف امن و ہمت عطا کر سکتا ہے۔ تعلیم کی مقداری اور کمیتی منصوبہ بندی ناکام ہو چکی ہے کیوں کہ طویل عرصوں کے لیے افرادی قوت کی ضروریات کے لیے پیشن گوئی نہیں کی جا سکتی۔ یہ کام صرف ایک ایسی مربوط تعلیم کے ذریعہ سے ہی ممکن ہے جس کی بنیاد سائنس، ترقی اور مذہب کے ایک جاندار امتزاج پر رکھی ہو۔

یونیسکو کے اہم عالمی اجتماع ماہرین و مفکرین تعلیم سے اپنا خطاب جاری رکھتے ہوئے میں نے کہا کہ مجھے یہ کہنے کی اجازت مرحمت ہو کہ مذہب کے انتہائی فراخ دلانہ اور شائستہ معنی ایک ایسی روح اور ایک ایسی امنگ کے ہیں جو انسانی زندگی کے ہر پہلو پر محیط ہے ۔ وہ اعلا ترین اقدار سے انسان کے تعلق اور رشتے کی توثیق کرتا ہے اور ذات حقیقی یا مطلق سے انسان کے احساس تعلق کی توثیق کر دیتا ہے ۔مذہب ہماری موجودہ و ظاہری زندگی اور اس کے ان باطنی پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے جو ذات اعلا سے انسان کا رابطہ قائم کرتا ہے ۔

تعلیم محض فرد کی بالیدگی اور تکمیل ہی نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق اس پورے جسمانی اور معاشرتی دائرے سے ہے جس میں وہ رہتا بستا ہے ۔اور اگر لوگوں کی اکثریت خستہ اور نامناسب ماحول میں رہتی بستی ہے تو پھر ایسی صورت میں تعلیم کو اپنے اصلاحی اثرات کو اجاگر کرنا چاہیے ۔

لہذا یہ ضروری ہے کہ آنے والے دو عشروں میں چھے سے پندرہ سال کے لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے ایسے نظام کا اہتمام کیا جائے جس کی بنیادیں اخلاقی اور روحانی اور مہذب و شائستہ اقدار پر استوار ہوں تاکہ ان سے محبت ، جرأت ، یقین کامل ، آزادی اور عالمی برادری سے محبت جیسے اوصاف و جذبات پروان چڑھیں ۔ان تین نکات پر مبنی ایک خصوصی نصاب تعلیم کی تدوین ضروری ہے ۔ (۱) خود اپنی ذات سے انسان کا ربط و تعلق (۲) اپنے ساتھیوں یا معاشرے سے اس کا تعلق اور (۳) فطرت سے اس کا رشتہ ۔اس کے لیے دوستی ، خیر سگالی ، فیاضی ، محبت اور ہر ایک کے ساتھ مشفقانہ برتاؤ ، رحم ، دوسروں کی تکلیف کا احساس ، ہمدردی ، ہر ایک کی فلاح و بہبود سے سرور و فرحت کا احساس ، عفو و درگزر اور چشم پوشی جیسی خوبیوں کو پروان چڑھانا ہوگا ۔ان اخلاقی اقدار پر مبنی تعلیم بچوں میں صحیح عزم و ہمت کو فروغ دے گی ۔اس سے ان میں موقع و محل کی مناسبت سے ٹھیک طریق عمل اور ذرائع کے انتخاب کی صلاحیت پروان چڑھے گی ۔ان کی مدد سے وہ اپنی زندگی صحیح انداز اور صحیح مساعی کے بل پر گزار سکیں گے ۔

میں نے آخر میں ایک نکتہ اور پیش کیا۔ میں نے کہا کہ اس نصاب میں ایک اور موضوع کو شروع میں متعارف کرانے کی ضرورت ہے، اور وہ ہے مسئلہ آبادی۔ طلبہ چاہے وہ مشرق کے ہوں یا مغرب کے آبادی میں اضافے کے خطرات کا ان کو احساس دلانا ضروری ہے۔ ۲۰۰۰ء تک موجودہ آبادی کے دو گنے ہونے پر نسل انسانی کا کیا حشر ہوگا۔ آبادی میں زبردست اضافے کی وجہ سے فراہمیٔ آب، خوراک، ادویہ، سڑکوں، ٹرانسپورٹ اور تعلیم وغیرہ جیسے مسائل منہ پھاڑے کھڑے ہوں گے۔

اپنی تقریر ختم کرنے سے پہلے میں نے جناب صدر سے تعلیم کے بارے میں اس عالمی اسمبلی کے سامنے ابن خلدون کے نظریات کو پیش کرنے کی اجازت طلب کی اور اس طرح اظہار خیال کیا:

ممتاز مورخ اور ماہر تعلیم، ابن خلدون کے مقدمہ کو مورخ آرنلڈ ٹائن بی نے اپنی نوعیت کا ایک ایسا کارنامہ قرار دیا ہے جس کی تخلیق کے بارے میں ٹائن بی نے تسلیم کیا ہے کہ ایسی تحریر کسی بھی ذہن نے کسی بھی عہد یا مقام میں پیش نہیں کی ہے۔ تعلیم کے بارے میں اپنے نظریات کے آغاز میں ابن خلدون انسان کو ایک معاشرت پسند حیوان قرار دیتا ہے۔ اس کے خیال میں انسان کے سلسلۂ تعلیم کا تعین اس تہذیب کی مادی، فکری اور روحانی قوتیں کرتی ہیں جس میں وہ رہتا بستا ہے۔ وہ اس خیال کا حامی تھا کہ "تعلم و تعلیم صرف مہذب معاشرے میں پروان چڑھتے ہیں۔ انسان کی استدلالی صلاحیت ہی اسے جانوروں سے ممتاز کرتی ہے۔ اس کی یہ قوت استدلال اسے زندگی بسر کرنے، معاشرے کے دوسرے ارکان کے ساتھ تعاون کرنے اور ان تعلیمات کو قبول کرنے کی صلاحیت عطا کرتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ کے ذریعہ سے انسان کی دنیوی اور اخروی فلاح کے لیے عطا کی ہیں۔ لہذا انسان استدلالی صلاحیت کا حامل حیوان ہے اور استدلال ہی تمام تعلم کا سرچشمہ ہے"۔

ابن خلدون نے تمام تر عمل تعلیم کی وضاحت کی ہے۔وہ کہتا ہے کہ طالب علم استدلال ہی کی قوت سے کہے اور لکھے جانے والے لفظ کے معنٰی اخذ کرتا ہے اور اسی کی مدد سے وہ قوانین وضع کرتا اور مختلف معانی کے درمیان نظم و تعلق قائم کرتا ہے۔ ابن خلدون کے بعض اصول تعلیم اس قدر حیران کن ہیں کہ ان کا آج کے تجربات کی روشنی میں جائزہ لینا چاہیے۔

ان میں سے چند یہ ہیں:

+ سائنسی مضامین کی تعلیم صرف اسی وقت موثر ثابت ہوتی ہے کہ جب یہ بتدریج اور رفتہ رفتہ دی جائے۔

+ معاون علوم کا مطالعہ طویل نہیں ہونا چاہیے اور نہ ان کے مسائل کا تفصیلی جائزہ لینا چاہیے۔

+ سخت رویہ سے بچوں کو نقصان پہنچتا ہے۔

+ عالم کو تلاش علم کے لیے سفر اور جید اساتذہ سے ملاقات سے زبردست فائدہ پہنچتا ہے۔

+ علما سیاست کے طور طریقوں سے نابلد ہوتے ہیں۔

+ اپنی زبان میں تعلیم نہ پانے والے کو حصول علم میں بڑی دقت ہوتی ہے۔

ابن خلدون اسباق یاد کرنے کے ضمن میں شرح اور فاضل شرح کی مدد سے قوت یادداشت پر ضرورت سے زیادہ انحصار کو اچھا نہیں سمجھتا۔ بہ قول اس کے اس میں الفاظ کی تکرار زیادہ ہوتی ہے جب کہ معنی کے اعتبار سے یہ یکساں ہوتے ہیں۔ وہ مختلف علوم کو خلاصوں کی شکل میں پیش کرنے کے طریقے کو طلبہ کے لیے پریشان کن اور حوصلہ شکن قرار دیتا ہے۔

جناب صدر مذاکرہ سے میں نے درخواست کی کہ وہ ازراہ کرم مجھے اپنی اس تقریر کا خلاصہ پیش کرنے کی اجازت مرحمت فرمائیں:

۱۔ تعلیم کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو اس کی کامیابی کا انحصار اساتذہ پر ہوتا ہے ۔لہذا تربیت اساتذہ پر تعلیم کے ایک اہم جز کی حیثیت سے زیادہ توجہ دینی چاہیے ۔

۲۔ اس سمپوزیم کو تعلیم اور اس کے لوازمات کے پیش نظر اسکول میں داخلے کی عمر اور اس کی تعلیم پر خرچ ہونے والے برسوں (مدت) پر غور کرنا چاہیے ۔

۳۔ ہم بالعموم دوسرے اہم مضامین کو نظر انداز کر کے ابتدائی عمر میں طلبہ کو مہارت خصوصی کی تعلیم دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ حال آنکہ یہ مضامین زندگی کی عمومی اقدار کو پروان چڑھانے کے لیے بے حد ضروری ہوتے ہیں ۔

۴۔ سہانے ماضی میں اسکول میں کلاسیکی زبانوں کی تدریس کو ضروری سمجھا جاتا تھا ۔ یہ عمل آج بالعموم اس انداز میں جاری نہیں ہے۔ کیا اس رجحان کو تعلیمی معیار کی پستی کا سبب قرار دیا جا سکتا ہے ؟

میرے خیال میں تکنیکی ، سائنسی تعلیم اور عمرانی علوم کی تعلیم میں توازن ہونا چاہیے ۔ تعلم کی دو اقسام کے لیے عمومی تعلیم کے مشترکہ سال کو کیوں نہ لازمی قرار دے دیا جائے ؟ اس کے اچھے نتائج برآمد ہوں گے ۔

۵۔ ہمیں اس بات کا بھی جائزہ لینا چاہیے کہ اعلا کامیابی حاصل کرنے والے طلبہ کو کس طرح پیشۂ تدریس اختیار کرنے پر آمادہ کیا جائے ۔معیار تعلیم کی پستی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ درجۂ اوّل کے وہ طلبہ جو اچھے اساتذہ بن سکتے ہیں زیادہ تر منفعت بخش پیشوں کو اختیار کر لیتے ہیں ۔

۶۔ ہمیں مقامی زبان میں تعلیم کی اہمیت پر غور کرنا چاہیے ۔ لہذا یہ ضروری ہے کہ مقامی زبانوں کو فروغ دیا جائے۔

۷۔ کیا ہمیں اب عمومی تعلیم کی لاگت پر غور نہیں کرنا چاہیے؟
غالباً لاگت اور اخراجات میں کمی کا ایک طریقہ مقامی سازو سامان کا استعمال ہے کیونکہ درآمد کردہ سامان روز بروز گراں ہوتا جا رہا ہے۔

۲۱۔اپریل ۱۹۸۲ ۔ بدھ

نظام طب وصحت
پیونگ یانگ جنرل ہسپتال
طب مشرقی اور طب مغربی کا سنگم

طے شدہ پروگرام کے مطابق میں ٹھیک دس بجے ہسپتال پہنچ گیا۔ میرے ساتھ دوسری کار میں پریس کے نمائندے اور فوٹو گرافرز بھی ہیں۔ ہسپتال کے دروازے پر ہسپتال کے ایڈمنسٹریٹر صاحب نے پُرخلوص استقبال کیا۔ مجھے یہ یقین ہے کہ اس احترام و استقبال میں پاکستان کی خارجہ پالیسی کے موجودہ توازن کا اثر ہے اور یہ بھی کہ میں پاکستان کے صدرِ گرامی قدر کا مشیر برائے طب ہوں۔

سب سے پہلے ہم کمرۂ ملاقات میں ذرا سی دیر بیٹھے اور ہسپتال کے بارے میں ابتدائی معلومات سے بہرہ ور ہوئے اور پھر ہسپتال کا دورہ شروع کر دیا۔ ان کو طب مشرقی سے میری دلچسپی کا بخوبی علم اور "۸۔ فروری ہسپتال" میں میں نے طب مغربی کے حاملین سے مرض و مریض کے باب میں جو بحث و تبادل خیال کیا تھا وہ ان تک پہنچ چکا ہوگا۔ میں نے وہاں امراضِ جگر کے مریضوں کے بارے میں اپنی رائے ان کی رائے سے مختلف دی تھی اور پھر پیونگ یانگ میٹرنٹی ہسپتال میں میں نے حمل اور اس سے متعلق معاملات پر وہاں کے ڈاکٹروں کی رائے سے اختلاف کیا تھا اور ان کی رائے ماننے سے انکار کر دیا تھا، اس کی خبر اس ہسپتال میں

ضرور آ گئی ہوگی -

یہی وجہ ہے کہ انھوں نے مجھے آج ایک شدید امتحان میں ڈال دیا اور ایک مریضہ کی اسکریننگ برائے معدہ میرے سامنے شروع کردی - میں نے پوری آزادی کے ساتھ رائے دی کہ معدے کا " شیپ " صحیح نہیں نظر آ رہا ہے ، مگر اس میں کوئی زخم موجود نہیں ہے - اس کے بعد ایڈ منسٹریٹو صاحب مجھے گُردے کے ایک مریض کے پاس لے گئے اور اسکریننگ سے قبل میرے سامنے انھوں نے ڈائی انجکشن لگایا اور چند منٹ بعد گردوں کی اسکریننگ شروع کردی - میں نے ان کے اس اقدام سے اختلاف کیا - میری رائے میں انجکشن کے کم از کم ۷ منٹ اور احتیاطاً ۲۰ منٹ بعد اسکریننگ کی جا سکتی ہے - میں نے ان کو بتایا کہ مریض کا دایاں گردہ کام نہیں کر رہا ہے - اس مریض کا اگر خون ٹیسٹ ہو گیا ہے اور یہ کہ حمرۃ الدم (ہموگلوبین) بہت بڑھی ہوئی ہے تو اس پر سرطان کا شبہ کرنا چاہیے -

ایک دوسرے شعبے میں منظار المعدہ سے معدے کے اندر کا معائنہ کیا جا رہا تھا - انھوں نے مجھے اس کام پر لگا دیا - میں نے احتیاط سے معائنہ کر کے اپنی رائے دی کہ ڈیوڈنل بلب کو غور سے دیکھنا چاہیے ، میں یہاں ایک "اسکار" دیکھ رہا ہوں -

اس ہسپتال کی قدیم ترین عمارت میں جدید ترین آلاتِ تشخیص و علاج موجود ہیں اور اس کثرت و افراط سے ہیں کہ بڑی حیرت ہوتی ہے اور شبہ یہ بھی ہوتا ہے کہ "سوشلسٹ پیٹرن" یہی ہے کہ بڑے سے بڑا کام کیا جائے تاکہ ذہنوں پر اس کا اثر ہو -

صدر کم ال سنگ کی تازہ ترین ہدایات یہ ہیں کہ طبِ مشرقی پر خصوصی توجہ کی جائے اور اس کی ہر اچھائی کی قدر کی جائے - ہر چند کہ کوریا میں طب مشرقی کا رکھ رکھاؤ رہا ہے اور اپنے اس علاج کو انھوں نے ترک نہیں کیا ، مگر صدر کوریا کی تازہ ترین ہدایت بڑی معنی خیز ہے اور اپنے میں جہانِ معنی پنہاں رکھتی ہے - یہ اس ہدایت و فرمان کی طاقت ہے کہ جدید ترین پیونگ یانگ میٹرنٹی ہسپتال میں طبِ مشرقی کا شعبہ اس شان کے ساتھ موجود ہے کہ طبِ مشرقی کے حاملین کو ایکسریز ، لیبورٹریوں وغیرہ کی تمام سہولتیں

دی گئی ہیں اور ان کے لیے طبّی دواسازی کا انتظام بھی وہاں جدید ترین انداز پر قائم ہے۔

ہم ایک اور وارڈ میں گئے اور فزیوتھراپی کا شعبہ بھی دیکھا کہ جو تمام جدید سہولتوں سے آراستہ تھا۔ بتایا گیا کہ یہاں جو بھی اعداد و شمار وصول ہوتے ہیں انہیں برقی کمپیوٹروں کے ذریعہ سے پرکھا جاتا ہے۔ یہ برقی کمپیوٹر اپریشنوں کے سلسلے میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے کمروں میں جہاں جدید طبی آلات نصب تھے نوجوان طلبہ مصروفِ عمل دکھائی دیے۔ اس طرح یہ ہسپتال طبی تعلیم کی خدمات بھی انجام دے رہا ہے۔

جمہوریہ عوامی کوریا میں طبی خدمت کی خصوصیات زیادہ تر عوام کے مکمل طور پر مفت طبی علاج معالجے اور "سیکشن ڈاکٹر سسٹم" پر مبنی ہیں۔ باالفاظِ دیگر ملک گیر سطح پر ہر قسم کا طبی علاج حکومت کے خرچ پر مفت کیا جاتا ہے۔ سیکشن ڈاکٹر سسٹم انتہائی ترقی یافتہ طبی امداد ہے جس کی داغ بیل صدر کم ال سنگ کی اس تلقین پر ڈالی گئی کہ رفاہی طب وہ طب ہے جو مرض کو پنپنے نہ دے۔ فی الوقت جُمہوریہ میں ہر چار سو افراد کے لیے ایک معالج موجود ہے۔

ہر ایک ری (Ri) میں، جو سب سے نچلے درجے کا انتظامی یونٹ ہوتا ہے، ایک عوامی ہسپتال قائم ہے۔ پھر ہر ضلع میں بھی ایک عوامی ہسپتال ہے۔ ہر ڈونگ میں ایک کلینک ہے حالاں کہ یہ بھی سب سے نچلے درجے کا انتظامی یونٹ ہوتا ہے۔ ضلع کا عوامی ہسپتال موزوں اور ضروری سامان سے آراستہ رہتا ہے تاکہ یہاں خاص اپریشن کیے جاسکیں۔ صوبہ جو سب سے اعلیٰ درجے کا انتظامی یونٹ ہوتا ہے وہاں صوبائی سطح کے ہسپتال ہیں۔ اسے صوبائی طبی کالج ہسپتال بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں طلبہ کی طبی تربیت کا خیال رکھا جاتا ہے۔ بڑے شہروں میں خصوصی گشتی ہسپتال بھی ہیں۔ فیکٹریوں، بڑے تجارتی اداروں اور کانوں نے اپنے اپنے ہسپتال قائم کیے ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر اُن اضلاع کے جو ان کی تحویل میں ہوتے ہیں دور دراز

کر کے امراض کی روک تھام میں مصروف رہتے ہیں۔ جہاں مریض دیکھتے ہیں فوراً ہی ان کا ری، ضلعی، صوبائی یا قومی ہسپتالوں میں ان کے امراض کی نوعیت کے مطابق باقاعدہ طبی علاج کیا جاتا ہے۔

ایسے طبی نظام کو موثر بنانے کے لیے جہاں مناسب و موزوں ادویہ کی فراہمی اشد ضروری ہے وہاں تربیت یافتہ ڈاکٹروں کی موجودگی بھی لابدی ہے۔ لہذا یہاں دارالحکومت اور مقامی دونوں جگہوں پر دوا سازی کے کارخانے قائم ہیں اور طبی کارکن جیسے کہ نرسوں، دوا سازوں اور ڈاکٹروں کو حکومت کے خرچ پر تربیت دینے کا انتظام بھی موجود ہے۔

اسی نظام کا یہ کرشمہ ہے کہ ملک کی آزادی کے بعد ملک میں مرض خسرہ کا قطعی خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ اور وہ لوگ اسے تحفظاتی طب کی فتح قرار دے کو بجا طور پر فخر کرتے ہیں۔

آخر میں ایڈمنسٹریٹر نے کہا، "ہم طبی کارکنوں کے لیے یہ ایک انتہائی اہم فریضہ قرار دیتے ہیں کہ وہ محبوب عوام کو امراض سے محفوظ اور صحت مند رکھنے کے لیے خلوصِ دل سے خدمت کریں۔ یہ احساس جُوچے فکر کے فلسفہ نے پیدا کیا ہے۔ لہذا ہم جدید ترین طبی سائنس سے آگہی حاصل کرتے ہیں اور پھر کسی بھی قسم کا معاوضہ لیے بغیر مریضوں کا مفت علاج کرتے ہیں۔ ہم عوام کی خدمت کے لیے ہسپتالوں کے مقصد کو ذہن نشین رکھتے ہوئے پوری تن دہی اور ایثار کے ساتھ اس تحریک کو جاری رکھیں گے۔"

اس منفرد تحریکِ ایثار کا مقصد اس نعرہ کو موثر بنانا ہے کہ "ڈاکٹر کو ڈاکٹر بننے سے پہلے ایک اچھا انسان بننا لازم ہے۔"

اس تحریک کا یہ اثر ہوا ہے کہ ڈاکٹر مریضوں کی جان بچانے کے لیے اپنا گوشت پوست، ہڈیاں، خون اور آنکھیں تک دینے سے گریز نہیں کرتے۔

آج یہاں پیونگ یانگ جنرل ہسپتال میں بھی میری نگاہِ شوق نے طبِ مشرقی کا حصہ دیکھا کہ جسے یہاں بھی بدرجۂ کمال اہمیت کے ساتھ قائم کیا گیا ہے۔ اور بکثرت مریضوں کو دیکھا کہ اس علاج

سے مستفید ہونے کے لیے آئے ہیں ۔اس ہسپتال میں تحقیقاتِ طبیہ کا شعبہ بھی پوری وسعت کے ساتھ موجود ہے اور یہاں فارماکوگنوسی اور فارماکولوجی کے شعبے پوری اہمیت کے ساتھ قائم ہیں ۔ بہ حیثیتِ مجموعی آج اس ہسپتال اور طبی کالج کو دیکھ کر بڑا اطمینان ہوا ہے۔

بڑی شدت کے ساتھ یہاں "نیشنل کاؤنسل فار طبی ریسرچ" کا خیال آیا کہ جو بڑی جدوجہد کے بعد اور صدرِ مملکتِ پاکستان کی اشیرواد کے ساتھ میں نے قائم کی تھی اور چاہتا تھا کہ پاکستان میں تحقیقاتِ طبیہ کا آغاز کردوں کہ جو پاکستان کی ایک اہم ترین ضرورت ہے، اس لیے کہ پاکستان میں طبی تحقیقات کا ہنوز آغاز نہیں ہوا ہے اور طبی تحقیقات (میڈیکل ریسرچ) کے نام و عنوان سے جو کچھ ہو رہا ہے وہ ایک فریب ہے اور سراب ہے ۔یہی وجہ ہے کہ پاکستان نے آج تک تحقیقاتِ طبی کے میدان میں ذرّہ برابر کوئی پیش رفت نہیں کی ہے ۔ہماری تمام طبی وصحی منصوبہ بندیوں پر عالمی دوا ساز ادارے غالب ہیں کہ ان کے لیے پاکستان زرخیز منڈی ہے۔ یہ دوا ساز پاکستان کو زحمتِ تحقیقاتِ طبّی دینا پسند نہیں کرتے ہیں!

افسوس ہے کہ تین مقتدر بقراطوں نے میری اس تجویز کو خاک میں ملا دیا اور تحقیقاتِ طبیہ کا کھلنے والا باب ایک بار پھر بند ہوگیا۔

پیپلز کلچرل پیلس

ساڑھے بارہ بجے میں یہاں آ گیا ۔اس عمارت کو بارہا میں نے باہر سے دیکھا تھا اور اس کی عظمت کو محسوس کرتا تھا ۔ آج یہاں آنے کا پروگرام بن ہی گیا ۔شاید اس لیے کہ میں نے کم از کم دو بار اظہارِ رائے کیا تھا کہ اسے دیکھنا چاہیے ۔ بلاشبہ یہ اندر سے ایک ایسی عظیم عمارت ہے کہ اسلام آباد کا قصر صدر اس کے سامنے پانی بھرتا ہے اور پیپلز کلچرل پیلس کے تو ایک کونے میں یہ سما جائے!

شمالی کوریا کی عمارات دل دھلانے کے لیے بھی بڑی بنائی جاتی ہیں، مگر یہاں بڑے کام بھی ہو جایا کرتے ہیں۔ اس پیلیس میں ہر قسم کی ثقافتی سرگرمیوں کے لیے پورے انتظامات موجود ہیں۔ تقاریر، ڈرامے وغیرہ کے لیے ہر سازو سامان موجود ہے۔ ایک ہال میں مارشل کم ال سنگ کی کتابوں کی نمائش بھی ہے اور مجھے اجازت دی گئی کہ میں یہاں سے اپنی پسند کی کتابیں بلاقیمت لے سکتا ہوں۔ میں نے صرف ایسی کتابیں لے لیں کہ جن کی ضرورت مجھے کوریا کی تعمیری پالیسیوں کو سمجھنے میں ہو سکتی ہے۔ گو باقی کتابوں کی اہمیت ہے مگر میں نے ذہنی طور پر میزبانوں کو زیر بار کرنے کی کوشش نہیں کی، گو میں نے اس سے کہیں زیادہ اپنی کتابیں جگہ جگہ ہدیہ کر دی ہیں جن کا وزن ۵۰ کیلو سے زیادہ ہی تھا!

چلڈرن پیلس

میرے مطالعے کے لیے اس کی بڑی اہمیت تھی اور میں نے شروع ہی میں اپنے محترم میزبانوں کو بتا دیا تھا کہ میں اسے ضرور دیکھوں گا۔ درحقیقت اس قسم کے مقامات کو دیکھنے سے بھرپور اندازہ ہو جاتا ہے کہ بچوں کے باب میں قیادت کا اندازِ فکر کیا ہے۔ میں اب تک نرسری، پرائمری، سکنڈری تعلیمات کے مراکز دیکھ چکا ہوں اور میں نے کم ال سنگ یونیورسٹی کو بھی تفصیل سے دیکھا ہے۔ اس مطالعہ سے میرا تاثر یہ ہے اور غلط نہیں بلکہ سو فیصد صحیح ہے کہ صدر کم ال سنگ کی فکری توانائیوں نے تعلیمِ بچگان کو نشوونما بخشا ہے۔ تعمیر کے میدان میں بچوں کی تعلیم و تربیت اولین فکر ہوتی ہے جو کی جانی چاہیے۔ تاریخ کا یہ ایسا فیصلہ ہے کہ اسے کبھی تبدیل نہیں کیا جا سکتا اور تعمیر و ترقی کا یہ وہ زینہ ہے جس پر چڑھے بغیر روشنی نظر نہیں آ سکتی۔ اپنی انقلابی جدوجہد میں قائدِ کوریا نے پوری توجہ بچوں پر صرف کر ڈالی ہے اور سوشلزم سے محبت اور دنیا کے ہر ازم سے نفرت ان کو گھٹی میں ڈال کر پلا دی ہے۔ نصابِ تعلیم کو یکسر بدل کر اسے سوشلزم

کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر دیا اور اس کا کُلیتہً انحصار و انداز شخصیتِ کم ال سنگ اور نظریۂ پارٹی پر ہو گیا ہے۔ نصابِ تعلیم پر گیرائی کے ساتھ نظر ڈالنے سے یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ اس نے کم ال سنگ کو مسجود کا مقام دیدیا ہے جس کے بُت کے سامنے ہر خاص و عام اور ہر چھوٹا اور بڑا رکوع و سجود کر رہا ہے ، اور پارٹی کو آغوشِ مادر کا مقام دے کر ہر بچے کو اس کی محبت دیدی ہے۔ اس فکرِ اساسی کے بعد صنعت و حرفت ، زراعت و تجارت اور افواج کے لیے رہنما اصولِ تعلیم وضع کیے گئے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ ایک نظریاتی مملکت میں انقلابِ فکری برپا کرنے کے لیے نظامِ تعلیم اور نصابِ تعلیم کو نظریۂ حیاتِ ملّی سے ہم آہنگ کرنا اولین ضرورت ہوتی ہے۔ یہ وہ اصول متعینہ ہے کہ جس کی نفی نہیں کی جاسکتی۔ کم ال سنگ کی ساری جدوجہد اور شمالی کوریا کی تعمیرِ نو فقط نظام و نصابِ تعلیم اور لازمی تعلیم و تربیت کی رہین منت ہے۔ میں اس اصول متعینہ کی سچائی کا بھرپور مشاہدہ یہاں کر رہا ہوں جبکہ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میرے پیارے وطن میں اس بیّن اصول کی نفی کا ہر سامان ہو رہا ہے اور ہم اپنی آزادی کے بعد سے پورے تسلسل و تواتر کے ساتھ تعلیم و تربیت کو نظر انداز کر رہے ہیں کہ جو ہمیں منزل مقصود تک نہیں لے جا سکتا۔

ہماری موٹرکار ڈھلواں سڑک پر دوڑتی ، دائیں بائیں خوشنما پھولوں اور بچوں کے مجسموں کے پاس سے گزرتی پیونگ یانگ طلبہ اور بچوں کے محل پہنچی جو ایک پہاڑی پر قائم ہے۔ چشم زدن میں بے شمار بچے سامنے آگئے اور مسکراتے ہوئے گرم جوشی سے ہمیں خوش آمدید کہنے لگے۔ انہوں نے بڑے جچے تلے انداز میں نوجوان دستوں کی طرح ہمیں سلامی دی۔ اس کے بعد ہم سب کے گلوں میں ایک ایک سرخ رومال باندھا اور تحسین و آفرین کے شور میں ہر بچے نے ہم سے مصافحہ کیا۔ پھر ہم تالیوں کی گونج میں پورچ سے گزرتے ہوئے دوسری منزل پر استقبالیہ کمرے میں پہنچ گئے جہاں محل کے وائس ڈائریکٹر نے ہمیں محل کی تاریخ کے سلسلے میں یہ اہم داستان سنائی:

ایک بار صدر کم ال سنگ نے اس امر کی طرف اشارا کیاکہ بچوں کی دیکھ بھال کا فریضہ حکومت کو ادا کرنا چاہیے کیوں کہ والدین اپنے اپنے کاموں پر چلے جاتے ہیں اور وہ دن کے اوقات میں اپنے بچوں کی نگرانی نہیں کر سکتے۔ان کی اسی ہدایت کے نتیجے میں پیونگ یانگ کی ایک پُرفضا خوبصورت پہاڑی پر یہ محل ایک جامع، غیر معمولی نصابی تعلیمی مرکز کے طور پر تعمیر ہوا اور ۳۰ ستمبر ۱۹۶۳ء کو طلبہ کے لیے کھولا گیا تھا۔بعد از جنگ کی معاشی دشواریوں کے باوجود صدر نے کہا :

" نئی نسل کے لیے کسی بات کی کسر اٹھا نہیں رکھی جائے گی۔" اور پھر دیکھا گیا کہ پچاس ہزار مربع میٹر رقبے پر ایک شاہانہ عمارت بن گئی جس میں پانچ سو کمرے ہیں ۔انہوں نے یہ کہتے ہوئے کہ " بچے ملک کے بادشاہ ہیں " اس عمارت کا نام طلبہ اور بچوں کا محل رکھ دیا۔

اب ہر صوبے اور ضلع میں طلبہ کے ہال اور دیگر غیر معمولی نصابی سرگرمیوں کے مراکز ہیں جہاں بچے خوش دلی سے اپنا وقت گزارتے ہیں۔

جو طلبہ بلا استثنا گیارہ سالہ لازمی تعلیم حاصل کر رہے ہوتے ہیں انہیں اس پیونگ یانگ اور بچوں کے محل میں داخلہ ملتا ہے۔

مرکزی سرگرمیوں کے لیے طلبہ دو یا تین مرتبہ باری باری آتے ہیں۔ہر روز دس ہزار سے زیادہ طلبہ یہاں جمع ہوتے ہیں۔یہاں ششماہی کورس کرائے جاتے ہیں ، اور بچے ہر چھے ماہ کی تکمیل کے بعد اپنے کورس میں تبدیلی کراکے یہ غیر معمولی نصابی سرگرمیاں مسلسل جاری رکھ سکتے ہیں۔پانچ سو کے لگ بھگ مستقل انسٹرکٹر اور ایک ہزار سے زیادہ جزو وقتی انسٹرکٹر بچوں کو علوم وفنون سکھاتے پڑھاتے ہیں - یہ انسٹرکٹر معروف و مشہور اتھلیٹ اور سائنس داں ہیں -

وائس ڈائریکٹر نے ہمیں حلقے کے کئی کمروں میں گھمایا - سارا محل اچھی طرح دیکھنے میں تو پورا ہفتہ لگ جاتا ہے لہذا ہم اس کا کچھ حصہ ہی دیکھ سکے۔تاہم بخوبی اندازہ ہو گیا کہ

بچے کیسی آزادی اور خوشی سے حلقے کی سوگرمیوں میں مصروف رہتے ہیں -

میں ان میں سے چند کا حوالہ دینا چاہتا ہوں :

۱ - کایا گم روم :- حلقہ کے ارکان نے ہمارے اعزاز میں کایاگم پر جو موسیقی کا ایک قومی ساز ہے " اپنے قائد کی بدولت ہم نے ایک اچھی فصل کاٹی ہے " کی دھن سنائی۔

۲- پیانو روم :- یہاں انہوں نے ہمیں پیانو کی گت پر "کوریا ایک ہے " کی گروپ پیشکش سے بے انتہا محظوظ کیا - ہم نے شدت سے محسوس کیا کہ نئی نسل کو بھی ہر دم اپنے ان ہم وطنوں کا خیال رہتا ہے جو جنوبی کوریا میں بستے ہیں -

۳ - ڈزائیننگ روم :- تقریباً بیس طلبہ ڈیزائن بنانے میں منہمک تھے -میں نے اب تک جتنے اسٹوڈیوز دیکھے ہیں ان کے برعکس یہاں پلاسٹر کےتمام نمونے جذبۂ حریت کے حامل تھے -یہ نمونے جاپان کے خلاف مسلح جدوجہد کرنے والے مرد میدان شجاعوں ، کوریا کی جنگ یا نئے معاشرہ کی تشکیل میں حصہ لینے والوں سے متعلق تھے -بے شک ان نمونوں کی صورت گری میں نوجوانوں نےاپنی ذمہ داری پر انقلابی روایات کو آگے بڑھانے کے عہد کا عزمِ نو ظاہر کیا تھا -

۴- مشین ٹول روم :- یہاں بچے خراد اور کٹائی کی مشینیں چلا رہے تھے -اس ملک میں اسکول کے زمانے ہی سے بچوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے کہ وہ مشینیں چلانا سیکھیں،کیوں کہ یہاں کے ہر فرد کو کوئی نہ کوئی ایک ہُنو سیکھنے کا پابند کیا گیا ہے -

۵- باکسنگ روم :- یہاں تربیت دینے والا ایک عالمی شہرت کا حامل باکسر ہے -باکسنگ کے اکھاڑے میں نوعمر باکسر مشاق کے ساتھ باکسنگ میں مصروف تھے -

۶- ٹریکٹر روم :-یہاں بچے بڑے ٹریکٹر چلانا ، اس کے ڈھانچے کو علاحدہ علاحدہ کرنا اور پھر سارے پرزے جوڑ کر ٹریکٹر تیار کرنا سیکھ رہے تھے -

چلڈرن پیلس (باغ اطفال) کی آج کی سیر میں حسب توقع وہ تمام تعمیری جدوجہد ملی کہ جو تعمیر وطن کی آئینہ دار اور ترقی کی عکاس ہے۔ جیسا کہ میں نے ابھی لکھا پانچ سو کمروں کی اس عمارت میں ، جہاں اوسطاً ۱۰ ہزار بچے یومیہ آتے ہیں " ایجوکیشن تھرو ریکری ایشن " کا عمل جاری و ساری ہے۔ کون سا شعبۂ زندگی ایسا ہے کہ جس کی تربیت یہاں نہ دی جا رہی ہو۔

اگر آزادئ وطن کے بعد ہی ۱۹۲۵ء میں مارشل کم ال سنگ اولین توجہ بچوں کی تعلیم و تربیت پر نہ کرتے تو آج کے نوجوان اور جوان ان کے ہم رائے کہاں سے آتے ! آج صورت یہ ہے کہ ایک فردِ واحد بھی نہیں ہے کہ جو وطن دوست نہ ہو ! حتی کہ وہ وقت آ گیا کہ کم ال سنگ چین اور روس دونوں سے اپنی بات منواتے ہیں اور چین جب ان کی بات نہیں مانتا تو کم ال سنگ اس سے صَرفِ نظر کرنے کی جراٗت رکھتے ہیں ۔ آج بھی پیونگ یانگ سے سینۂ بیجنگ چیر کر شمالی کوریا کی ریل گاڑیاں ماسکو تک جا رہی ہیں !

پاکستان میں ہم اپنے پیارے بچوں کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں ؟ اس سے بڑا ظلم اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہمارے ملک کے تین چوتھائی بچے تعلیم سے محروم رہ کر ہر قسم کی روشنی سے محروم ہیں ۔ دیہات میں ہماری غلط پالیسیوں اور عدم فکر کی وجہ سے آدھے سے زیادہ بچے دماغی اعتبار سے کمزور پیدا ہو رہے ہیں اور یہ خطرہ سامنے ہے کہ آج سے ۲۵ سال بعد پاکستان کی ۲۵ فیصد آبادی دماغی صلاحیتوں سے محروم ہوگی ۔ آج جو بچے جاہل اور تعلیم کی روشنی سے عاری اور علم سے محروم رکھے جا رہے ہیں کل یہ پاکستان کے لیے بے مصرف ہوں گے اور ان کو بھیڑ بکری کے ریوڑوں کی طرح جدھر دل چاہے گا ہنکایا جا سکے گا ۔

خصوصی پروگرام

مشیرِ صدرِ اسلامی جُمہوریۂ پاکستان برائے طب کے لیے اس باغ نونہال میں نونہالانِ کوریا نے ایک خصوصی پروگرام وسیع وعریض آڈیٹوریم میں کیا ۔ آڈیٹوریم بچوں سے بھرا ہوا تھا ۔ دو تین ہزار بچے تو ضرور ہوں

گے ، اور ڈرامہ میں اداکار بھی سب بچے ہی تھے۔ان بچوں کے جوشِ مسرّت سے تمتماتے چہرے ان کی قلبی بشاشت وطمانیت اور ان کی خود اعتمادی کے غماز تھے۔ اونچی تان میں ان کی سویلی و ترنم ریز آوازیں کیف آور تھیں اور ان کے معصومانہ و دلکش رقص وجد آفریں تھے۔ ننّھے ننّھے ہاتھوں کی معنی خیز جنبشیں اورنازک انگلیوں کی حساس نرت دیکھ کر داد تحسین دیے بغیر کیسے رہا جا سکتا ہے! بلامبالغہ ڈرامے کی تیاری اس قدر جذبات سے بھرپور انداز میں کی گئی تھی کہ میرے لیے یہ یقین کرنا مشکل ہو گیا کہ یہ فن بچے پیش کر رہے ہیں - یہ تمام ڈرامہ از اول تا آخر قومی تھا۔اس ڈرامے کا ہر فن کار رقص و سرود کے ذریعہ سے اپنے ملک اور قوم پر فخر کا اظہار کر رہا تھا۔

میرے تاثرات معلوم کرنے کے لیے ابلاغ عامہ کے ماہرین میرے ساتھ تھے۔میں نے بچوں کی تعلیم و تربیت کی ضرورت اور اہمیت پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور بچوں کے لیے صدر کم ال سنگ کی فکری توانائیوں اور حکومت کوریا کی مثبت پیش رفت کو بجا طور پر خراج تحسین پیش کیا -

نیشنل لائبریری پیونگ یانگ

پاکستان میں لائبریری تحریک کا میری ذات سے اور بالخصوص مولانا عارف الدین صاحب کی ذات سے اور ان کے اس تحریکِ قیامِ کتب خانہ جات سے مجنونانہ شغف سے گہرا تعلق ہے۔ہمارے اس تعلق کی نفی کی بڑی بڑی بقراطی (بیوروکریٹک) کوشش ہوتی رہی ہیں جس پر کسی قسم کے تعجب کی ضرورت ہے نہ حاجت کہ یہ ہماری قومی خصوصیت ہو چکی ہے کہ ہم خود کام کرتے ہیں نہ کسی کو کرنے دیتے ہیں اور اگر اس کے باوجود کام کا کوئی دھنی کام کر جائے تو اس کا ناطقہ بند کر دیتے ہیں ، اور اگر اس میں بھی ناکامی ہو جائے تو پھر ہر انداز سے اور ہر طور سے اس کی خدمات کی نفی کرتے ہیں۔پاکستان کے نام نہاد نظام تعلیم میں قیام لائبریری کو کبھی کوئی اہمیت حاصل نہیں رہی ہے۔ہمارے ہاں بڑے سے بڑے کالج

ہیں اور بڑے سے بڑے اسکول ہیں مگر ان میں لائبریری نام کی کوئی چیز نہیں رہی ہے۔ پبلک لائبریریوں کا تصور تو بہت بعد کی چیز ہے۔ پاکستان میں لائبریری ایسوسی ایشن کے نام سے ایک غیر متحرک ادارہ قائم ہوا اور قائم ہے مگر تحریکِ لائبریری سے اس کا دُور دُور کوئی واسطہ نہیں رہا ہے۔ پاکستان میں لائبریری کے تصور کو اور نظام تعلیم سے اس کے تعلق اور درس گاہوں میں لائبریریوں کی ضرورت کو اگر کسی نے واضح کیا ہے اور ذہنوں میں اجاگر کیا ہے تو وہ صرف اور صرف انجمن ترقی وفروغ کتب خانہ (Society for the Promotion and Improvement of Libraries) ہے۔ اس انجمن نے ہر سطح پر اپنی خدمات کا مظاہرہ کیا ہے، بڑے بڑے مذاکرات اور سمینار اس کی جانب سے ہوئے ہیں، اور درسگاہوں میں ورک شاپ اس کے زیر اہتمام انعقاد پذیر ہوئے ہیں۔ مطبوعات اس کی ہیں۔ حکومتِ پاکستان کی سوئی ہوئی وزارت تعلیم کو اس انجمن نے بیدار کرنے کا خوش گوار فریضہ انجام دیا ہے۔ غرض ہر سطح پر اس انجمن نے خدمات سر انجام دی ہیں مگر حکومت پاکستان میں اس انجمن کو اس لیے کبھی بار نہ مل سکا کہ اس انجمن نے حقیقی اور تعمیری خدمات انجام دی ہیں اور پاکستان کو لائبریریوں کا صحیح اور سچا تصور دیا ہے۔ حکومت کی سطح پر اب اور جب بھی کوئی ادارہ برائے لائبریری قائم ہوتا ہے وہاں انجمن کو قصداً اور ہمیشہ نظر انداز کیا جاتا رہا ہے، اور اس انجمن کا دستور یہ رہا ہے کہ وہ اس قسم کے صرف نظر سے ایک بار بھی مایوس نہیں ہوئی اور اس نے اپنی تحریک کو شد و مد کے ساتھ اس وقت تک جاری رکھا کہ بالآخر حکومت پاکستان نے اور صوبائی حکومتوں نے لائبریری کی ضرورت و اہمیت کو تسلیم کر لیا۔ اب یہ انجمن زیادہ فعال اور متحرک نہیں ہے مگر اس نے ہنوز اپنے وجود کو احتیاطاً برقرار رکھا ہے تاکہ کسی جگہ اگر سُستی نظر آئے تو اس کا نوٹس لے سکے۔

پاکستان میں لائبریری تحریک کے ذیل میں یہ جملے ارتجاجاً قلم سے نکل گئے ہیں اور درحقیقت یہ جملے در مدح مولانا عارف الدین ہیں کہ جن کی انتھک محنت نے اور جن کے خلوص اور لگن نے اس تحریک میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

آج میں نے پیونگ یانگ کی نیشنل لائبریری دیکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میری میزبان وزارتِ صحت، شمالی کوریا نے اس کا انتظام آج کر دیا ہے۔ ۱۰ بجے ٹھیک ہم یہاں پہنچ گئے جہاں منیجر منتظر تھے اور ان کے ساتھ ایک مترجم خاتون۔ ابتدائی کلماتِ تعریف و تعارف کے بعد ہم لائبریری کے اندر داخل ہوئے۔ اس کے تمام دروازے بند تھے اور ایک بلند دروازہ کھلا تھا۔ اس کا ایک حصہ کھول کر ہم نے اندر قدم رکھا۔ یہ دروازہ ایک انتہائی وسیع ہال میں جاکر کھلا۔ اس ہال کا طول و عرض کیا بتاؤں! غرض خوب بڑا تھا۔ فرش ایسا ہے کہ معلوم ہو کہ قالین پڑا ہے۔ چھت میں بڑے بڑے فانوس جن کی روشنیوں نے ہال کو بقعۂ نور بنا رکھا تھا۔ اس ہال میں صدر کم ال سنگ کا مجسمہ لگا ہوا تھا، اس طرح کہ وہ اس مرکز علم و دانش میں ہر آنے والے کا استقبال کر رہے ہوں اور داد کے خواہاں ہوں کہ انہوں نے شمالی کوریا کے لوگوں کے لیے اس مرکز علم و دانش کی تعمیر میں خصوصی حصہ لیا ہے۔ مجسمہ کے خدو خال ایسے کہ جن سے فخر و اطمینان کا اظہار ہوتا ہو۔

اس ہال سے گزر کر ہم اس سے وسیع تر ہال میں داخل ہوئے۔ یہ لائبریری انڈیکس ہال ہے۔ یہ لائبریری دس لاکھ کتابوں کی گنجائش رکھتی ہے، اسی مناسبت سے انڈیکس الماریاں بھی ہیں۔ اس ہال کی چھت میں تین سنہری اور شیشے کے شینڈلڑ آویزاں ہیں جن کا قطر تین میٹر سے کم نہیں ہے اور اس پوری عمارت میں اس قسم کے سینکڑوں اور چھوٹے ہزاروں فانوس ہیں۔

اس لائبریری کے بارے میں میرا تاثر یہ ہے کہ اس میں جب کتابیں جمع ہو جائیں گی تو یہ ایک بڑی علمی جگہ بن جائے گی۔ طرز تعمیر بلا شبہ آج کے جدید لائبریری تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہے بایں ہمہ اس میں داخل ہو کر عظمت علم اور رفعت عالم کا احساس ہوتا ہے۔ اس سات منزلہ وسیع و عریض عمارت میں درجنوں ریڈنگ روم ہیں جو گنجائش کے اعتبار سے ۸۰ لوگوں کے اور زیادہ سے زیادہ ۲۵۰ لوگوں کے لیے ہیں۔ لائبریری کی دوسری سہولتیں بھی فراہم کی گئی ہیں۔ مائکرو فلم یونٹ بھی ہے اور آڈیو وژول مطالعہ کا سامان بھی ہے۔

کوریائے شمالی کے بارے میں جو تصور ذہن میں تھا یہ مراکزِ علم اس سے کہیں زیادہ ہیں ۔ ناقابل بیان اور ناقابل تصور ۔ تعمیر کے میدان میں ایسی محیّرالعقول پیش رفت قابلِ داد ہے اور لائقِ تحسین و آفرین ۔

نیشنل لائبریری پیونگ یانگ میں ایک بڑا وسیع حصہ ان کتابوں کی نمائش پر مشتمل ہے کہ جن کا تعلق صدر کم ال سنگ کی تحریرات سے ہے ۔ ہر میدان میں ان کی تعلیمات کو ضخیم جلدوں میں چھاپ دیا گیا ہے ۔ یہ طباعت و اشاعت نہ صرف کوریا میں ہوئی ہے بلکہ متعدد ممالک نے ان کے تراجم بھی شائع کیے ہیں : روس ، جاپان، چین ،انگلستان،فرانس، تھائی لینڈ، سوڈان، عراق وغیرہ وغیرہ پر ۔ پاکستان کا نام بھی ہے کہ وہاں لاہور کے ایک ناشر نے بڑی خوب صورت کتاب چھاپی ہے کہ جو یہاں نمائش میں میں نے پہلی بار دیکھی ہے ۔ ممکن ہے کہ ہمدرد لائبریری میں ہو ۔

پھر مختلف شعبہ ہائے زندگی میں کوریا میں جو کتب چھپی ہیں ان کی نمائش کی گئی ہے اور بڑی حیرت ہوئی کہ کس قدر متنوع کتب کوریا میں چھپی ہیں ۔ سائنس و تکنالوجی ، طب و صحت، نباتات ، جمادات و حیوانات ، علوم سائنس ، زراعت اور صنعت وغیرہ پر ۔ پھر بچوں کا لٹریچر بکثرت چھپا ہے ۔علم وادب، ڈرامے اور ناول ۔ غیر ملکی اہم ادبیات (شیکسپیر وغیرہ) کے کوریائی زبان میں تراجم ۔غرض کوئی حد ہے نہ انتہا ۔

میں نے اس لائبریری کے لیے اکثر مطبوعاتِ ہمدرد پیش کر دی ہیں جن کو شکریے کے ساتھ قبول کر لیا گیا ہے ۔میں نے ان کے اصرار پر ایک مشورہ یہ دیا ہے کہ اس لائبریری میں پاکستان پر ایک سیکشن ہونا چاہیے ۔جب آپ اس سیکشن قائم کرنے کا فیصلہ کریں مجھے اطلاع دیدیں ۔میں پاکستان پر تمام کتابیں اس لائبریری کو ہدیہ کرنے میں فرحت و اطمینان محسوس کروں گا ۔

سفارت خانۂ چین میں

اگر ہماری گائڈ محترمہ مسز کوران سل خیال نہ کرلیتیں تو چین

کے لیے ویزا کا مسئلہ پیدا ہو جاتا۔ ہمارے پاس پورٹ ان ہی کے پاس ہیں جن کو دیکھ کر انہوں نے محسوس کیا کہ ہمیں ویزا کی ضرورت ہے۔ یہ میرے پرائیوٹ سکوٹری کی کوتاہیٔ فیصلہ ہے۔ میرا پروگرام ان کے پاس تھا اور ان کو معلوم تھا کہ چین میں میرا داخلہ دو بار ہونا ہے۔ ایک بار کوریا جاتے ہوئے اور دوبارہ کوریا سے آتے ہوئے۔ ویزا ڈبل انٹری کا ہونا چاہیئے تھا۔ بارے ہم لائبریری وزٹ کے بعد سیدھے سفارت خانۂ چین گئے۔ بڑی وسیع اور کشادہ عمارت ہے۔ اس کے ایک کونے میں ویزا آفس ہے۔ یہاں ایک خاتون اور ایک حضرت نے ہمارا پر جوش استقبال کیا۔ انہوں نے سادہ کاغذ پر پاس پورٹ سے متعلق تفصیلات لکھوا لیں اور پھر ۱۵ منٹ میں میرے اور سعدیہ کے ویزا تیار کر کے دیدیے۔

ہماری گائڈ اور مترجم کو بڑی حیرت ہوئی۔ یہاں جو غیر ملکی مہمان آتے ہیں ان میں سے زیادہ تر واپسی پر چین گئے ہیں اور ان سب سے سفارت خانۂ چین نے ویزا فیس ۱۰ یون لیے ہیں اور سب کو دوسرے دن ویزا دیا ہے۔ ہمیں انہوں نے ۱۵ منٹ میں فارغ کردیا اور خاطر مدارت الگ کی۔ ویزا فیس نہیں لی اور باہر تک ہمیں چھوڑنے بھی آئے۔

ناشتہ اور کھانا

سعدیہ اور میں دونوں ناشتہ نہیں کرتے ہیں۔ یہ بات یہاں کسی کی سمجھ میں نہیں آئی۔ لنچ کے وقت ہم دونوں ڈائننگ ہال میں جاتے ہیں۔ میں ناشتہ کرتا ہوں (یعنی ایک گلاس دودھ ، دو انڈے ، ڈبل روٹی اور پنیر) ، اور سعدیہ لنچ پورا لیتی ہیں۔ اب تین دن سے ان لوگوں کو سمجھا رہا ہوں کہ مجھے لنچ نہیں چاہیے مگر ہو یہ رہا ہے کہ مجھے ناشتہ دے کر وہ فوراً ہی پورا لنچ بھی لے آتے ہیں ، جسے میں واپس کر دیتا ہوں۔

زیرِ زمین ریلویز

مجھے جب یہ معلوم ہوا کہ پیونگ یانگ میں ایک زمین دوز ریلوے سسٹم بھی ہے تو مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ اس حیرت کو یقین میں

بد لنا ضروری تھا ۔ میں د نیا کے بہت سے ممالک میں زیرِ زمین نظام حمل و نقل کا مشاہدہ کر چکا ہوں اور بڑھتے پھیلتے ہوئے شہروں کی ضرورت سے واقف ہوں اور کراچی میں ایسا نظام نہ ہونے بلکہ سرکلو ریلویز کی عدم تکمیل پر متاسف ہوں ۔

پیونگ یانگ میٹرو (زیر زمین ریل) کا نظام دیکھنے کے لیے میرا اصرار مختلف وجوہ کی بنا پر تھا اور میں نے آج اسے دیکھ ہی لیا۔ ہمارا یہ سفر پونگھوا زمین دوز ریلوے اسٹیشن سے شروع ہوا ۔یہاں اسٹیشن ماسٹر صاحب نے بڑی محبت و اخلاص کے ساتھ خوش آمدید کہا ۔ان کے ساتھ ہم اندر گئے ۔میں نے" خود کار سیڑھی " کو بڑی حیرت سے دیکھا کہ وہ اس قدر گہرائی ـــــ انتہاہ گہرائی میں ہے کہ اس سے قبل میں نے ایسا نہ دیکھا تھا ۔لندن کے پیکاڈلی اسٹیشن پر زمین دوز ضرور گہری ہے مگر نہ اس قدر ۔

ہم لاؤڈ اسپیکروں سے نکلنے والی مسرور کن موسیقی سنتے ہوئے اسٹیشن پر نیچے پہنچ گئے ۔ اگرچہ موسم آج زیادہ سرد نہ تھا مگر یہاں پلیٹ فارم پر ٹھنڈک محسوس ہونے لگی ۔ سنگ مرمر کے فرش مثل آئینہ تھے جو جھل چراغوں کی حسین روشنیوں سے جگ مگ جگ مگ کر رہے تھے ۔یہ شیش محل کا سماں زیر زمین ایک محل کا نقشہ پیش کر رہا تھا ۔

منبت کار مرمریں ستون دو قطاروں میں کھڑے کیے گئے ہیں اور دونوں سمت کی دیواروں پر پچی کاری کے ذریعہ سے ایسے نقشے بنائے گئے ہیں جن میں ہر ایک میٹرو اسٹیشن کی اہم خصوصیات کی جھلک ملتی ہے ۔ پچی کاری سے جو تزئین کی گئی ہے ان میں سے بعض آرائشوں کی لمبائی ستر میٹر تک ہے ۔ان آرائشوں میں اس حیرت انگیز فنکارانہ مہارت کا مظاہرہ کیا گیا ہے کہ ان سے ایک طویل تصویر بنتی ہے لیکن ترتیب اس کمال سے کی گئی ہے کہ دو ستونوں کے درمیان تصویر کا جو حصہ دکھائی دیتا ہے وہ ایک علاحدہ مکمل تصویر لگتی ہے ۔کونگ گک ریلوے اسٹیشن پر بنائے گئے مرمریں ستون اپنی منبت کاری کے لحاظ سے انتہائی دیدہ زیب اور شان دار ہیں ۔

فانوس مختلف الاشکال ہیں اور ہر ایک کی بناوٹ میں اس اسٹیشن

کی مناسبت کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ مثلاً جو فانوس ہوانگ گمپوں اسٹیشن پر ہیں وہ انگوروں کے خوشوں کی مانند دکھائی دیتے ہیں۔

سام ہنگ اسٹیشن علمی، ادبی اور اخلاقی تعلیمات اور طلبہ کی جسمانی تربیت کی علامت قرار پاتا ہے لہذا یہاں کی تزئین میں تعلیمی انداز کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک دو میٹر طویل اور ڈیڑھ میٹر عریض تصویر بنائی گئی ہے جس میں کنڈر گارٹن سے لے کر کالج تک کے طلبہ کو پورے انہماک سے مطالعے میں مصروف دکھایا گیا ہے۔

ہوانگ گمپوں اسٹیشن کی سجاوٹ رنگین پچی کاری اور دیواری نقاشی سے کی گئی ہے جن میں چاول ، گندم ، مکئی ، سبزیوں اور پھلوں کی تصویریں نظر آتی ہیں ۔

صبح اور شام کے اوقات میں جب زیادہ بھیڑ ہوتی ہے ہر تین منٹ کے بعد گاڑیاں روانہ ہوتی ہیں جب کہ عموماً پانچ یا چھے منٹ کے وقفے سے ایک کے بعد دوسری ٹرین چلتی رہتی ہے ۔ صبح چھے بجے گاڑیاں چلنی شروع ہوتی ہیں اور رات کے ایک بجے یہ سلسلہ رک جاتا ہے ۔ اوسطاً ہر گاڑی میں تین ڈبے ہوتے ہیں لیکن ہجوم کے اوقات میں ان کی تعداد چار کر دی جاتی ہے ۔

ہر پلیٹ فارم پر ایک تصویر آویزاں ہے جس میں وہ اشیا دکھائی گئی ہیں جنھیں ہمراہ لے کر گاڑی میں سفر نہیں کیا جا سکتا ۔ ان میں پیٹرول ، پرندے ، مچھلیاں ، تمباکو اور تعمیراتی اوزار شامل ہیں تاہم ریل کے ڈبوں میں ایسی کوئی ہدایت درج نہیں ملی ۔ ڈبے صفائی کا منہ بولتا نمونہ ہیں، کہیں گرد کا ایک ذرہ تک دکھائی نہیں دیتا ۔

پونگھوا (مشعل) سنگری (فتح) کائے سون (فاتحانہ مراجعت) چون سنگ (فتح جنگ) چونو (ہتھیاروں سے لیس رفقا) اور کوانگ بوک (قومی آزادی) ریلوے اسٹیشنوں کے چند نام ہیں کہ مجھے یاد رہ گئے ہیں۔ یہ علامتی نام قومی آزادی کی اس جد وجہد کی تاریخ بیان کرتے ہیں جس نے کوریائی عوام کو خود مختاری اور انقلابی فتح کا تاج پہنایا۔ ہاں ، اور نام یاد آئے ۔ پل گن بیول (سرخ ستارہ)

سام ہنگ (خوشحالی) تانگیل (دوبارہ اتحاد) کون گک (تعمیر قوم) اور ہیوکسن (اختراع) اسٹیشنوں کے ایسے نام ہیں جو انقلابی مقصد کی عظمت بیان کرتے اور آنے والی نسل کو اس مقصد سے آگاہ کرتے ہیں۔

کوانگ بوک (قومی آزادی) کے اسٹیشن پر ستّر میٹر لمبی ایک تصویر میں پیک دوسان کے خفیہ کیمپ کی منظر کشی کی گئی ہے۔ یہ کیمپ جاپان دشمن مسلح جدوجہد کے دوران جس کی کمان خود صدر کم ال سنگ نے کی انقلابی ہیڈکوارٹر کے طور پر قائم کیا گیا تھا۔ اس تصویر میں صدر کے جذبۂ حریت کی عکاسی ملتی ہے جنہوں نے صرف تیرہ برس کی عمر میں دریائے ایمنوک گانگ عبور کیا اور پھر شمالی مشرقی چین میں پہنچ کر بیس سالوں تک قومی آزادی کی صبر آزما جنگ لڑتے رہے۔

کون گک (قومی تعمیر) اسٹیشن۔ یہاں رنگین پچی کاری کے ذریعہ سے دریائے پٹونگ، چولیما سٹریٹ، عوامی محل ثقافت، پیونگ یانگ اسٹیڈیم، اور کوریائی انقلابی عجائب گھر اور ملک میں دیگر کامیابیوں کی تصویری عکاسی کی گئی ہے۔ برسات کے دنوں میں دریائے پٹونگ سیلاب بن کر چھوٹے چھوٹے مکانوں کو بہا لے جاتا تھا لیکن آزادی کے بعد صرف پچپن دنوں میں عوام دریا کے اس عظیم منصوبے کو مکمل کرنے میں کامیاب ہو گئے جس کے بارے میں لوگوں کا کہنا تھا کہ "یہ کام دس سال تک بھی پائے تکمیل کو نہیں پہنچے گا۔"

کائے سون (فاتحانہ مراجعت) اسٹیشن پر پچی کاری سے نقاشی کر کے صدر کم ال سنگ کو بولتے اور سامعین کو پوری توجہ سے ان کی تقریر سنتے دکھایا گیا ہے۔ انہوں نے گھر کی طرف فاتحانہ مراجعت کے وقت قومی تعمیر کی تلقین کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ جن کے پاس طاقت ہے وہ اپنی طاقت کا نذرانہ دیں، جن کے پاس علم و ہنر ہے وہ اپنا علم اور فن تفویض کر دیں، جن کے پاس دولت ہے وہ اپنی دولت تقسیم کر دیں تاکہ پوری قوم توانا، علم و فن سے بہرہ ور اور دولت سے فیضیاب ہو جائے۔

ہوانگ گمبوں (سنہری کھیت) اسٹیشن پر زراعت کی مناسبت

سے کھیتوں کی پیداوار کنندہ کاری کے ذریعہ سے دکھائی گئی ہے۔

حاصلِ مطالعہ یہ کہ میٹرو میں عمر رسیدہ لوگ اس میں اپنی اس درخشاں تخلیقی تاریخ کی جھلک دیکھتے ہیں جسے انہوں نے اپنے ہاتھوں سے رقم کیا تھا۔ جب کہ بچے تصوّر کی آنکھ سے اپنا مستقبل دیکھیں گے اور اپنے آبا کے عظیم کارناموں کو خراجِ تحسین پیش کریں گے، جنھوں نے مشکلات و مصائب کا مقابلہ کرتے ہوئے قومی آزمائش سے گزر کر انہیں اس شاندار دور سے روشناس کرایا۔

جب ہم شکریہ ادا کرکے رخصت ہونے لگے تو پونگھوا کے اسٹیشن ماسٹر نے کہا:

"ہمارا ملک ابھی دو بارہ متحد نہیں ہوا ہے۔ یہ کتنے دکھ کی بات ہے کہ وہ لوگ جن کا خون ایک ہے ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے حالاں کہ غیر ملکی یہاں آکر آزادی سے گھومتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ ہمارے ملک کے دوبارہ متحد ہونے کے لیے ایک موثر اور جان دار تحریک چلائیں گے۔"

دونوں کوریاؤں کو باہم ملانے کی اس آرزو کے پیچھے ہزار جد وجہد ہے۔ آرزوئے محض سے منزل مقصود تک نہیں پہنچا جا سکتا، اس کے لیے عمل شرط ہے۔ میں یہ سوچتا ہوا یہاں سے رخصت ہوا۔ زیر زمین ریلوے نہ صرف حمل و نقل کا ایک ذریعہ ہے بلکہ یہ کوئی نناوے اسٹیشن ہیں کہ جو آرٹ گیلری کا درجہ رکھتے ہیں۔ وہ آرٹ گیلری کہ جو سوا سو پر مقصد ہے اور سراسر ایک درسِ حیات ہے۔ ماسکو (روس) کا میٹرو کا بھی انداز ایسا ہی ہے اور ظاہر ہے کہ پیونگ یانگ میٹرو اس کے بعد ہی عالم وجود میں آئی ہے۔

۲۲۔ اپریل ۱۹۸۲ء۔ جمعرات

جہانِ نو

جاپان کے طویل اقتدار اور پھر امریکی یلغار اور شدید بمباری نے کوریا کو بہر اعتبار مفلوج کر کے ڈال دیا تھا، اور اس کی تعلیمی، صحّی، معاشی و اقتصادی اور سیاسی و سماجی زندگی کو ختم کر دیا

تھا ـ تاریخ نے بتایا کہ ایسے حالات میں بعض اقوام و ملل ہمّت ہار جاتی ہیں ، مگر ایسی بھی خوش قسمت اقوام و امم ہیں کہ جن میں کوئی ایک شخصیت جنم لیتی ہے اور غیر ملکی استعمار کے پرخچے اڑا دیتی ہے اور پھر تعمیر کی کوششوں سے ایک جہانِ نو پیش کر دیتی ہے ـ کوریا میں جاپانی اقتدار و استعمار کے خلاف کامریڈ کم ال سنگ کا خاندان بیدار ہوا ـ ان کے والد اور والدہ نیز ان کے چچا نے کمرِ ہمت باندھی اور جاپان کو سر زمین کوریا سے نکال دینے کا عزم کیا ـ ایسے لوگوں کے ساتھ جو گزرتی ہے وہ تاریخ میں یکسانیت کی حامل ہے ـ اقتدار و استعمار ایسے لوگوں سے بہیمانہ سلوک کرتا ہے اور تختۂ دار ان کی قسمت ہوا کرتا ہے ـ کم ال سنگ نے ایسے ماحول میں پرورش پائی کہ ان کے والد اور چچا نیز ان کی والدہ جاپان کے خلاف مہم میں مصروف تھے اور کوریا کو آزادی دلانا ان کا منتہائے مقصود اور مقصود زندگی بن گیا تھا ـ اور پھر ایسا ہوا کہ بچہ کم ال سنگ بھی کسی نہ کسی انداز سے اس تحریک میں شریک ہوتا رہا اور تربیت پاتا رہا اور بالآخر کم ال سنگ بڑا ہو کر جاپان کے خلاف لڑتا رہا اور ایسا وقت آیا کہ جاپانِ کو ہر میدان میں شکست ہوئی اور پھر کوریا اس کے چنگل سے آزاد ہوا مگر اس کے بعد امریکی استعماریت نے کوریا کو زیرِ اثر لانے کی راہ اختیار کی اور جدوجہدِ آزادی کو اپنے اتنے ہی بموں سے کچلنا چاہا کہ جتنی پیونگ یانگ کی آبادی تھی اور یہاں اس نے اینٹ سے اینٹ بجا دی ـ بایں ہمہ کوریا میں جذبۂ آزادی سرد نہ ہوا بلکہ بموں کی بارش نے کم الِ سنگ اور ان کے رفقا کو عزم تازہ دیا اور کوریا امریکا کے خلاف صف آرا رہا اور بالآخر ۱۹۴۵ء میں یہ جدوجہد آزادی کامران ہوئی ، ملک تقسیم ہوا، امریکی اثرات نے جنوبی حصہ کوریا کو اپنے زیر نگین کر لیا اور شمالی کوریا پر امریکی اپنا اقتدار باقی نہ رکھ سکے ـ کم ال سنگ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے اور پھر وہ شمالی کوریا کی تعمیر نو کی جدوجہد میں مصروف ہو گئے اور پیونگ یانگ ان کی توجہ کا مرکز بن گیا ـ

اس درجہ شدید تباہی کے بعد کہ کوئی عمارت سلامت نہ رہی اور کوئی بستی تھی کہ اجڑ نہ گئی ہو اور کوئی جھونپڑی تھی کہ جل نہ گئی ہو ، کم ال سنگ نے باوجود ناداریوں کے ایک جہاں نو

پیدا کرنے کا عزم کر لیا۔ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۸۲ء تک کا عرصہ اتنا طویل عرصہ نہیں ہے کہ ایک مُردہ قوم زندہ اور ایک تباہ ملک آباد ہوجائے مگر عزمِ تازہ، یقینِ محکم اور تنظیم و ایمان کی طاقتوں نے راہوں کو ہموار کر دیا اور آج شمالی کوریا ایسا ملک ہے کہ جہاں وہ سب کچھ ہے جس کی ایک ملک کو ضرورت ہے، اور وہ سب کچھ ہے کہ جس کی ضرورت ایک انسان کو ہے۔ نیا شمالی کوریا تمام دنیا کے لیے ایک مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ ملک کہ جو ۱۹۲۵ء میں پیسے پیسے کو محتاج تھا اور جہاں کے لوگ دانے دانے کو ترس رہے تھے آج صرف ۳۷ سال میں وہ اب اتنا خود کفیل ہے کہ وہ دنیا کے دوسرے ممالک کو اشیائے ضرورت بھجوا رہا ہے۔ کم ال سنگ کا منصوبہ خود کفالتی اور خودی پر مشتمل تھا۔ وہ خودی اور خود کفالتی کے فلسفے کو لے کر اٹھے اور افرادِ وطن کی خودی کو انھوں نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور خود شناسی اور عرفانِ ذات کا ان میں جذبہ پیدا کر دیا اور جب قوم کا ہر فرد خودی کے جذبے سے سرشار ہوگیا تو اس کا لازمی نتیجہ خود کفالتی ہوتا ہے اور خود اعتمادی، اس لیے کہ وہ قوم کہ جو خودی کو بلند کرے وہ کسی کے سامنے دستِ سؤال دراز نہیں کر سکتی۔ وہ فاقہ مست ہو جاتی ہے، وہ پیٹ سے پتھر باندھ لیا کرتی ہے، وہ دنیا کا ہر دکھ سہ لیتی ہے مگر اپنی خودی کا کوئی سودا نہیں کرتی ہے۔ شمالی کوریا نے خودی کا کبھی سودا نہیں کیا۔

اس نے اپنے ذرائع و ذخائر کو کھنگال ڈالا اور پھر اپنے ان ذرائع و ذخائر سے اور اپنی ہمت مردانہ سے تعمیرِ نو کا آغاز کر دیا۔ یہ ذہن میں رہنا چاہیے کہ شدید دشمن کہ جس نے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی صرف چند کیلو میٹر دور آدھے کوریا پر قبضہ کیے ہوئے بیٹھا ہے اور وہ دشمن اس درجہ قوی ہے کہ ہر تعمیر نو کو تباہ کر دینے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کے باوجود شمالی کوریا کی تعمیر کا سلسلہ جاری رہا اور ۳۷ سال میں آج شمالی کوریا وہ ہے کہ جسے ہم دیکھ رہے ہیں۔ یہ ایک قطعی آزاد خطۂ زمین ہے جہاں کم ال سنگ کا سکّہ چلتا ہے اور اب کوریا فوجی اعتبار سے اس درجہ قوی ہے کہ امریکا جنوبی کوریا میں بیٹھا اس سے خائف ہے اور اس کو

جنوبی کوریا میں ایٹمی ہتھیاروں کا سامان کرنا پڑا ہے ، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ شمالی کوریا پر اب نہ وہ بمباری کر سکتا ہے اور نہ اس پر فوج کشی ممکن ہے ۔ شمالی کوریا کے صدر مقام پیونگ یانگ میں ۱۰ دن رہنے کے بعد میں نے یہ اندازہ کرنے میں کوئی غلطی نہیں کی ہے کہ شمالی کوریا کی افواج بڑی سوعت و طاقت سے بڑھ رہی ہیں ، اور اس کی برّی و فضائی طاقت میں بے اندازہ اضافہ ہو گیا ہے ، اور اس کی فضائی طاقت سے امریکا خائف ہو چکا ہے اور برّی افواج کی ہمت سے امریکی استعمار لرزاں ہے ۔ میں کوئی بات یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا اور یقین کے ساتھ کہنا شاید ممکن بھی نہیں ہے مگر شمالی کوریا کے عزائم کی جھلک امریکی پریشانی کے آئینے میں دیکھی جانی ممکن ہے ۔ اس وقت جنوبی کوریا میں امریکا نے ایٹمی حملے کے پورے انتظامات کر لیے ہیں ۔ یہ انتظامات شمالی کوریا کی فوجی تیاریوں اور ان کے عزائم کے عکاس ہیں ۔ اس لیے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ دونوں کوریا کو ایک کر دینے کی جد وجہد کا آغاز ہونے میں اب زیادہ دیر نہیں ہے ۔

انقلاب کے لیے جد وجہد کا عجائب گھر

اس پس منظر کے ساتھ میں آج جد وجہد آزادی اور ایک انقلاب کا عجائب گھر دیکھنے گیا ۔ یہ ایک پرشکوہ عمارت ہے جس کے سامنے دونوں جانب زیرِ سایۂ علمِ شمالی کوریا آزادی کی جد وجہد اور افواج کی ہمت مردانہ مجسموں کی صورت میں دعوتِ نظارہ دیتے ہیں ، ان دونوں کے درمیان مارشل کم ال سنگ پُر وقار انداز میں کھڑے ہیں اور اتنی بلندی پر ہیں کہ پیونگ یانگ میں رہنے والا ہر فردِ بشر ان کو ہمہ وقت دیکھ سکتا ہے ۔ وہ اپنا دایاں ہاتھ بلند کیے ہوئے اب بھی ہر شخص کو دعوت فکر و عزم دے رہے ہیں اور قوم کا ہر فرد ان پر فدا ہے ۔ اس پر شکوہ اور دل نواز اور ہمت افزا ماحول کی پشت پر عجائب گھر کی پر شکوہ عمارت ایستادہ ہے کہ جس کے ایک سو بڑے ہالوں میں جد وجہد آزادی کی داستان در و دیوار سے کندہ و ثبت ہے ۔ داستان تباہی و غلامی سے شروع ہوئی ہے اور پھر کم ال سنگ خاندان کی جد وجہدِ آزادی کی منظر کشی کی گئی

ہے اور ۳۷ سال کی پوری داستان از اوّل تا آخر تفصیل کے ساتھ یہاں دیکھی اور پڑھی جا سکتی ہے۔ کم ال سنگ نے اپنی آزادی کی جدوجہد کی جو داستانیں رقم و تحریر کی ہیں یہ سب عجائب گھر میں تصویروں اور نقشوں اور تاریخی دستاویزوں کے ساتھ در و دیوار پر ثبت کر دی گئی ہیں۔ بعض جگہ حیرت ہوتی ہے کہ یہ تفصیلات کیسے محفوظ رہ گئی ہیں اور اس سے زیادہ حیرت اس پر ہوتی ہے کہ وہ کیسے مصور ہیں کہ جنھوں نے کتابِ داستان پڑھ کر ہر داستان کو مصور کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ شدید حالات میں کم ال سنگ کے ساتھ فوٹو گرافرز نہیں رہ سکتے تھے۔ انھوں نے اپنی ہر داستان کو لکھ دیا ہے اور کوریا کے ماہرین نے ان داستانوں کو ماحول کی پوری حفاظت کرتے ہوئے مصور کر کے عجائب گھر کو سجا دیا ہے۔ اتنا بڑا عجائب گھر دیکھنے کے لیے ایک ہفتہ درکار ہے اور اگر آزادی کی داستان کو سمجھنا ہے تو اس عجائب گھر میں کم از کم دو ماہ گزارنے ضروری ہیں۔

اس زندہ قوم نے اپنے قومی ہیرو کو آسمان تک پہنچا دیا ہے اور یہ اس کا صلہ ہے کہ کم ال سنگ نے مردہ کوریائی انسانوں کو زندہ اور بم زدہ زمین کو آباد اور خزاں رسیدہ دنیائے کوریا کو بہار کی رعنائی اور ہر بہار سے اسے روشناس کرا دیا ہے۔

اس عجائب گھر کی ہر داستان، بلکہ داستان کا ہر ورق کم ال سنگ کی شخصیت کے ارد گرد گھومتا ہے۔ ان کے بغیر کوئی بات کہی نہیں جا سکتی اور اس عجائب گھر میں ہر بات اور ہر عنوان کم ال سنگ سے عبارت ہے۔

اس عجائب گھر میں جب تعمیرِ نو کی بات کی جاتی ہے اور زراعت و صنعت، صحت و طب وغیرہ کی بات کی جاتی ہے تو ہم کم ال سنگ صاحب کو ہر جگہ موجود پاتے ہیں۔ وہ ہر شعبۂ زندگی میں رہنمائی دیتے ہیں۔ ان کی فکرِ جواں اور ان کی طاقتِ عمل کی کوئی حد ہے نہ انتہا، وہ ہر جگہ موجود ہیں اور ہر جگہ تعمیرِ نو میں رہنمائی دے رہے ہیں۔

کوریائی انقلاب کا عجائب گھر اس مشاہدہ کا بہترین موقع فراہم

کرتا ہے اور ان عوامل کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے جن کی بدولت جمہوریہ میں ایک فلاحی ریاست تعمیر ہو گئی ۔یہ عجائب گھر اس تاریخی مواد پر مشتمل ہے جس کا تعلق جاپان کی نوآبادیاتی حکومت کے دور اور اس کے بعد انقلابی جدوجہد کے عرصے سے ہے ۔

ایک دستاویزی فلم ہمیں دکھائی گئی۔ پہلا منظر یہ ہے کہ شدید ترین امریکی بمباری کے نتیجے میں پورا پیونگ یانگ شہر اس طرح تباہ ہوا ہے کہ اس کی اینٹ سے اینٹ بج گئی ہے۔ ہرانسان اس شدید تباہ کاری اور تباہی کو دیکھ کر کوریائی عوام کے جذبات کو بہ خوبی سمجھ سکتا ہے اور ان کے ردعمل کو محسوس بھی کر سکتا ہے ۔ایسے لمحات اقوام و ملل کی تاریخوں میں فیصلہ کن ہوا کرتے ہیں۔ بعض اقوام کندھا ڈال دیتی ہیں اور مقابلہ و تعمیر کی ہمت و جذبہ کھو بیٹھتی ہیں ۔لازماً ان کی قسمت میں غلامی رقم ہو جایا کرتی ہے۔ لیکن ایسی اقوام و امم بھی اس صفحۂ ارض پر موجود ہیں کہ ہر شکست ان میں فتح کا جذبہ پیدا کرتی ہے اور ہر تباہی ان کو آمادۂ تعمیر کر دیتی ہے ۔

اس عجائب گھر میں اور پھر دورانِ فلم میں نے صدر کم ال سنگ کا ایک قول بڑی توجہ اور دلچسپی کے ساتھ نوٹ کیا :

> " جب تک ہماری پارٹی ہے ، ہماری حکومت ہے ، ہمارے عوام ہیں اور ہماری سرحدیں ہیں ہم بار بار نئی زندگی اختیار کر سکتے ہیں۔"

فلم کا سلسلہ جاری رہا اور اس کے بعد وہ تعمیرات اور پرشکوہ عمارات میرے لیے وجۂ کشش و حیرت ہیں کہ جو جنگ کے ملبے پر ازسر نو بہ صد افتخار جلوہ فگن ہیں ۔

واقعہ یہ ہے کہ ایک قائد کے لیے مستقبل کا ادراک کرنا اشد ضروری ہوتا ہے۔ کل کی امید دلا کر ہی عوام میں جوش عمل اور ولولہ پیدا کیا جا سکتا ہے ۔ایک نئے معاشرے کی تعمیر کا منصوبہ ذہن میں ہو تو اس کی تکمیل کے لیے آدمی جنگ کرتے ہوئے بے دریغ جان بھی دے دیتا ہے۔ لیکن اس جاں سپاری کا حوصلہ ہر کسی

میں نہیں ہوتا۔ جوں جوں جنگ شدید ہوتی ہے میدان کارزار گرم ہوتا ہے تخت یا تختہ کی نوبت پہنچ جاتی ہے تو آدمی مستقبل سے ناامید ہو کر حوصلہ ہار بیٹھتا ہے۔ اپنے گمشدہ عوام اور اپنی سرحدوں کو دوبارہ حاصل کرنے کی جدوجہد ناقابل بیان تکالیف و مصائب اور ابتلا و آزمائش کے کڑے لمحات میں ثابت قدم رہنے کا تقاضا کرتی ہے۔ بلاشبہ قیادت کی بصارت اور بصیرت اور مکمل غور و فکر کی حامل منصوبہ بندی ہی تعمیرِ نو پر فکر و عمل کی توانائیوں کو جوان کر سکتی ہے۔ محض عزائم اور ان عزائم کا صرف کھوکھلا اظہار کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ ایک قائد کی دیانت و امانت کا اظہار اس کے صحت مندانہ عمل ہی سے ہو سکتا ہے اور جو قائد عزائم کے اظہار پر اکتفا کرتا ہے اور نہ خود عمل کر سکتا ہے اور نہ دوسروں کو آمادۂ عمل کر سکتا ہے اس کی ناکامیاں بڑے خطرناک اور الم ناک نتائج پیدا کرتی ہیں۔

یہاں کوریا میں متاثر کن پہلو عمل کی وہ پختگی ہے جس کا مُظاہِرہ عوام نے ملکی تعمیرِ نو کے مرحلہ پر کیا۔ وہ حقیقی معماروں کے روپ میں ڈھل گئے۔ ایک صحیح معنوں میں مکمل فلاحی ریاست کی تشکیل غیر معمولی قیادت کی مرہون منت ہے جس میں قائد کی صدق دلی اور روشن ضمیری شامل ہے۔

کوریا کی تقسیم کی وہ بنیادی وجہ کیا ہے جس کے تحت عوام کی خواہش کے خلاف اسے زبردستی عمل میں لایا گیا؟ تقسیم کیسے عمل میں آئی؟ اب اس مسئلہ کے حل کی کیا صورت ہے؟ ان تمام سوالوں پر مفاہمانہ انداز میں غور کرنے کی ضرورت ہے۔

دنیا میں کسی بھی جنگ کی واقعاتی بنیادیں اتنی واضح نہیں ہوں گی جیسی کہ کوریا میں ملتی ہیں۔ گو باور کیا جاتا ہے کہ ساری دنیا کے عوام اس تاریخی حقیقت سے باخبر ہوں گے۔

ایک متکبر بڑی طاقت جس نے جنگ کے حالات پیدا کیے اور ملک کی تقسیم کا باعث بنی پھر اس تقسیم کو برقرار رکھنے پر بھی کوشاں ہے وہ حقائق کو کیسے گوارا کر سکتی ہے؟ مگر ظالم خواہ کتنا ہی معصوم بننے کی کوشش کرے مظلوم اپنے ساتھ کیے جانے والے سلوک کو کبھی فراموش نہیں کرتا۔

وزیر صحت شمالی کوریا۔ تبادلِ خیال

وزیرِ صحت شمالی کوریا ہزایکسی لنسی ڈاکٹر پاک میونگ بن صاحب حکومتِ کوریا کی جانب سے میرے میزبان ہیں ، اور اُنھوں نے میزبانی کے تمام لوازم کو اس انداز سے پورا کیا ہے کہ ہم اس کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکے۔ بہ تقریبِ جشنِ ولادتِ کم اِل سنگ وہ وزیر کی حیثیت سے انتہائی مصروف رہے ہیں ، وہ میری آمد پر ہوائی میدان آئے، مگر جہاز کے وقت کی تبدیلی نے ان کی مجھ سے ملاقات کا موقع نہیں دیا اور پھر دورانِ تقریبات ان سے ملاقات کی توقّع کرنا صحیح نہ تھا اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ کارکنان کا مزاج ایک خاص انداز رکھتا ہے اس لیے وزیر صحت سے ملاقات کو ایک معما بنائے رکھنا کوریائی طریقِ کار ہے۔ میں نے اپنے پروگرام میں وزیر صحت سے ملاقات کو شامل کر دیا تھا مگر اس کے بعد میں نے ایک بار بھی اس کی یاد دہانی نہیں کرائی اور اپنی کسی تشویش و تشویق کا کوئی اظہار نہیں کیا۔آج صبح میری رہنما اور میرے ترجمان جب ۸ بجے دن بھر کا پروگرام بنانے آئے تو انھوں نے معمّے کے انداز میں اشارہ کیا کہ ہنوز بات تو طے نہیں ہے مگر شاید شام کو وزیرصحت سے ملاقات ہوگی۔ میں جانتا تھا کہ پروگرام تو طے شدہ ہے مگر سسپنس کے بغیر یہ کام بھلا کیسے ہو سکتا ہے! جب سیرِ عجائب گھر ختم ہوگئی اور میں ناشتہ سے اور سعدیہ لنچ سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں آگئے تو ڈھائی بجے پروگرام بتایا گیا کہ شام ساڑھے پانچ بجے وزیر صحت سے ملاقات ہے اور اس قدر بتا کر پروگرام کا دوسرا حصہ شام کو ایک نئے اسٹور نمبر۱ کی سیر سے فراغت پا کر بتایا کہ وزیرصحت نے آپ کے اعزاز میں ڈنر بھی دیا ہے اور یہ کہ سفیر پاکستان کو بھی دعوت دیدی گئی ہے!

میں اس قسم کے سسپنسوں سے واقف ہوں اس لیے میں اس سے لطف اندوز ہوتا رہا ہوں!

کلچرل ہاؤس فار فارن گیسٹس میں یہ ملاقات طے پائی - میں اسٹور نمبر ا کی سیر سے فارغ ہو کر اپنے ترجمان اور اپنی گائڈ اور سعدیہ کے ساتھ وہاں ۲ منٹ قبل پہنچ گیا اور میں نے بار بار کہا کہ ہمیں وقت سے پہلے اندر نہیں جانا چاہیے مگر آج یہ لوگ میری بات نہ مانے اور وقت سے پہلے اندر لے گئے - بہ ظاہر یہ طے شدہ پالیسی تھی کہ میرے پہنچنے کے بعد وزیر صحت تشریف لائیں اور ایسا ہی ہوا - دروازے پر جناب ناظم الامور سفارت خانۂ پاکستان ، جو ان دنوں قائم مقام سفیر ہیں ، موجود تھے - میں ان کے اور استقبالیہ کی ایک خاتون کے ساتھ اندر گیا اور میرے اندر جاتے ہی وزیر صحت شمالی کوریا تشریف لے آئے اور بڑے تپاک سے ملے -

میری ان سے ۷۵ منٹ طب و صحت اور تعلیم و تربیت پربالخصوص اور عمومی موضوعات پر بالعموم باتیں ہوئیں - ماحول بڑا خوش گوار تھا اور جلد ہی یہ ماحول بے تکلف گفت گو میں بدل گیا - البتہ وہ رسمی جملے ضرور ادا ہوئے کہ جو ایسے مواقع پر ادا ہوتے ہیں یعنی آپ کی آمد کا شکریہ اور آپ کی میزبانی کا شکریہ - مگر اس بار ہر جگہ ایک اضافہ ہوتا رہا کہ بڑی خوشی ہوئی کہ آپ گریٹ لیڈر کم ال سنگ کی ۷۰ویں سالگرہ کی تقریبات میں شرکت کے لیے ہزارہا میل سے آئے ہیں ، یہ جملہ ہر جگہ ادا ہوا اور یہاں بھی جناب محترم وزیر صحت نے یہی بات کہی -

میں نے ہسپتالوں میں اپنے تجربات و مشاہدات اور محسوسات و تاثرات کا ذکر وزیر صحت کے سوال پر کیا اور میں نے سب سے پہلے گردہ کے امراض (یورولوجی) پر یہاں ایک ہسپتال میں اپنے مشاہدات و تاثرات کا ذکر کیا کہ میری رائے یہ تھی کہ گردہ دایاں کام نہیں کر رہا ہے اور میرا یہ مشورہ کہ اس مریض کے خون میں حمرت الدم کو چیک کرنا ضروری ہے - اگر وہ زیادہ ہے تو سرطان کا شبہ کرنا چاہیے - میں نے وزیر صحت کو بتایا کہ میری بے لاگ رائے ہے اور میرے اظہار خیال کو وہاں ڈاکٹروں نے لبیک کہا - اس سے مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے کہ ہسپتالوں میں علمی فضا ہے - اس موقع پر وزیر صحت صاحب نے بتایا کہ ان کا فیلڈ اور میدان عمل یورولوجی ہے - میں نے ان سے کہا کہ یہ مجھے معلوم ہے اور اسی لیے میں نے آج

اپنی گفت گو کا آغاز امراض گردہ سے کیا ہے !

میری اس معلومات پر کہ میں ان کا میدانِ عمل جانتا ہوں وزیر صحت اور ناظم الامور پاکستان کو دل چسپ حیرت ہوئی - پھر میں نے منظار المعدہ کا ذکر کیا کہ میری تشخیص سے اتفاق رائے کیا گیا کہ بوّاب پر زخم موجود ہے ! میں نے اپنے دلی تاثرات بیان کیے کہ پیونگ یانگ کے ہسپتالوں میں تشخیص کے لیے جو جدید ترین سہولتیں ہیں وہ میری توقّعات اور میرے تصورات سے کہیں زیادہ ہیں - میں نے یہ نہیں کہا کہ بعض جگہ تو یہ شبہ ہوتا ہے کہ ہم الات کے کس اسٹور میں ہیں ! لیکن میں نے یہ حقیقت بیان کی کہ ہسپتالوں میں مڈیکل ورکرز بڑی محبت والفت کے ساتھ اور بڑے خضوع کے ساتھ مریضوں کی خدمت میں مصروف ہیں - واقعہ یہ ہے کہ یہاں خدمت کے جذباتِ مقدّسہ سے سرشاری دیکھ کر دل بڑا ہی خوش ہوا ہے -

طب مغربی سے بالآخر ہم طب مشرقی پر آ گئیے اور میں نے ان ہدایات اور قوانین کا ذکر کیا کہ جو صدر کم ال سنگ نے طب مشرقی کے لیے جاری کیے ہیں اور بار بار زور دیا ہے کہ اس طب کو درجۂ سائنس دیا جائے اور اس کے لیے تمام وہی اقدامات کیے جائیں کہ جو طب مغربی کے لیے ہو رہے ہیں - صدر کم ال سنگ کی ان ہدایات پر عمل ہو رہا ہے اور ہر ہسپتال میں پوری اہمیت کے ساتھ طب مشرقی کا شعبہ موجود ہے -

وزیر صحت نے بتایا کہ صدر کم ال سنگ کی واضح ہدایت یہ ہے کہ تشخیصِ موض کے لیے طب مشرقی کے شعبوں کے لیے تمام جدید ترین سہولتیں فراہم کر دی جائیں - میں نے اس موقع پر بتایا کہ پیونگ یانگ میٹرنٹی ہسپتال میں طب مشرقی کے شعبے کے لیے ایکسرے سے لے کر دوسرے آلات تشخیص اور معملوں وغیرہ کی سہولتیں فراہم ہیں ، اور یقیناً یہ صدر کم ال سنگ کی ہدایت پر عمل کا مظہر ہے - وزیر صحت نے بتایا کہ صدر کم ال سنگ کے زیرِ ہدایت طبِ مشرقی کا ایک بڑا ہسپتال زیر تعمیر ہے اور جلد ہی اس کی تکمیل ہو جائے گی اور صدر کم ال سنگ کے زیر ہدایت اس میں تمام جدید ترین سہولتیں فراہم کی جا رہی ہیں اور یہ کہ اس کو طب مشرقی کے

اصول و نظریات اور فلسفہ وغیرہ کے لیے ایک تحقیقاتی مرکز بھی کی حیثیت دی جا رہی ہے۔

میں نے وزیر صحت کو دلی مبارکباد دی اور میں نے ان سے کہا کہ یہ سلامتیٔ فکر کا مظہر ہے۔ صدر کم ال سنگ نے طبِ مشرق کے بارے میں جو فرمان و ہدایت جاری کی ہے اور اب حال ہی میں اس پر بہت شدت کے ساتھ زور دیا ہے اور ایک "موسٹ ماڈرن ہسپتال" اور مرکزِ تحقیقات قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے یہ مسئلۂ صحت انسانی کی فہم کا عکاس ہے اور عظمتِ فکر اور رفعتِ عمل کا مظہر ہے۔ بدیہی طور پر صدر کم ال سنگ حالاتِ حاضرہ کا جائزہ لے چکے ہیں اور یہ کہ طبِ مشرق کو ایک سائنس کا درجہ دے کر اسے صحتِ عامّہ کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید بنانا چاہتے ہیں۔

وزیر صحت صاحب نے بتایا کہ وہ شمالی کوریا میں عالمی ادارۂ صحت (ڈبلیو ایچ او) کے ایک مرکز کے قیام پر غور کر رہے ہیں جیسا کہ ساؤتھ ایسٹ ایشیا کے لیے نئی دہلی میں ہے۔ اس موقع پر میں نے ان کو بتایا کہ میں نومبر ۱۹۸۱ء میں مشورہ کے لیے ڈبلیو ایچ او، جنیوا، مدعو کیا گیا تھا اور وہاں اصولی طور پر یہ بات طے پا گئی ہے کہ زیادہ سے زیادہ مراکزِ روابط یعنی کوآرڈینیٹنگ سنٹرز قائم کیے جائیں۔ اس لیے پیونگ یانگ میں ایک ایسے مرکز کا قیام ممکن ہو سکتا ہے۔ میں نے وزیر صحت کو بتایا کہ ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل موسیو لامبو طبِ مشرق کے حامی ہیں اور وہ اس طب کے لیے پورے تعاون کے لیے تیار ہیں۔

آخر میں گفت گو طب و صحت سے ہٹ کر سیاستِ حاضر پر آگئی اور دونوں کوریا کا مسئلہ سامنے آیا۔ وزیر صحت نے شکریہ ادا کیا کہ پاکستان اس باب میں شمالی کوریا کا حامی ہے اور جنوبی کوریا سے افواج امریکی کے انخلا کو ضروری سمجھتا ہے۔ میں نے ان کو یقین دلایا کہ پاکستان اس موضوع پر شمالی کوریا کے موقف کا پُر جوش حامی ہے۔ میں نے اعادہ کیا کہ پاکستان کے جنوبی کوریا سے سفارتی تعلقات اب تک نہیں ہیں۔ میں نے اپنی گفت گو میں اس اعلامیۂ مشترکہ کی شق ۹ کا حوالہ دیا کہ جو وزیر اعظم پاکستان کی ۲۱ تا ۲۲

مئی ۷۶ ۱۹ء کے کوریا آنے پر پیونگ یانگ اور اسلام آباد سے جاری ہوا تھا اور اس میں دونوں کوریاؤں کے انضمام کی تائید کی گئی ہے۔ وزیر صحت نے اس کا دلی شکریہ ادا کیا اور پاکستان کے اس موقف کی زبردست تعریف کی ہے اور توقع ظاہر کی ہے کہ پاکستان کی حکومت اور وہاں کے عوام کی اعانت و تائید سے ہم دونوں کوریاؤں کو ایک وطن کی صورت جلد دے سکیں گے۔

میں نے آخر میں ان سے کہا :

صدرِ مملکتِ پاکستان جنرل محمد ضیاءالحق صاحب نے مجھے اجازت دی ہے کہ میں ،یورایکسی لنسی! آپ کو پاکستان آنے کی پرخلوص دعوت دوں۔انھوں نے اس دعوت کا دلی شکریہ ادا کیا ، اور بڑی حد تک اسے قبول کر لیا ہے۔ان کی طرف سے قبولیت کا اظہار اس انداز سے ہوا ہے کہ

"وزارتی سطح پر تبادُلِ وفود کے بعد یہ مناسب تر ہوگا کہ طب و سائنس کے میدانوں میں وفود کا تبادلہ دونوں ملکوں کے مابین ہو۔"

میں نے اس خیال کی تائید کی ہے اور اتفاق رائے کیا ہے - اس موقع پر میں نے ان کو بتایا کہ نہ صرف طب مشرقی کے میدان میں بلکہ دوسرے سائنسی میدانوں میں بھی تبادل وفود سے مفید نتائج برآمد ہوں گے کہ جو صحت عام کے لیے نتیجہ خیز ہو سکتے ہیں - اس موقع پر میں نے پیونگ یانگ جنرل ہسپتال میں طب مشرقی کی دواؤں پر تجربات سائنسی کا ذکر کیا اور ان سے کہا کہ اس میدان میں باہمی ربط و ضبط بڑا مفید ہو سکتا ہے -میں نے وزیر صحت سے درخواست کی ہے کہ وہ اس پر غور فرمائیں کہ کوریا میں تحقیقات طبیہ کی رپورٹیں انگریزی زبان میں بھی ہوں -اس سے انھوں نے اتفاق رائے کیا ہے-

وزیر صحت نے امراض جگر پر اپنی تشویش کا اظہار کیا ہے اور بتایا کہ کوریا میں امراض جگر اور پھر سرطان جگر کے مسائل شدت اختیار کر رہے ہیں - میں نے ان کو بتایا کہ خود میں اس پر پریشان ہوں ، اسی لیے میں نے کراس ہسپتال میں امراضِ جگر کا شعبہ

دیکھنے کی خواہش کی اور وہاں جا کر مریضوں کو خود بھی دیکھا ہے اور معالجین سے تبادلِ خیال بھی کیا ہے۔ میں نے اس موقع پر مرض یرقان کی بات کی اور ان کو بتایا کہ ہم نے پاکستان میں یرقان کی ایک بڑی مفید دوا دریافت کر لی ہے اور یہ دوا صرف ایک پودے سے تیار ہوئی ہے۔ میں نے وزیر صحت سے کہا کہ اگر آپ اجازت دیں اور اتفاق رائے کریں تو میں کم از کم ایک سو مریضوں کے لیے یہ دوا بھجوا دوں تاکہ اس دوا کو آپ تجربات کے لیے اپنے کسی ہسپتال میں دیدیں۔ وزیر صحت نے اتفاق رائے کیا اور مجھ سے کہا کہ میں ایک سو مریضوں کے لیے دوا بھجوا دوں۔ اس موقع پر پاکستان کی سفارت کے ناظم الامور نے ذمہ داری قبول کی ہے کہ وہ ادویہ ہزایکسی لنسی کی خدمت میں پیش کر دیں گے۔

تحائف کا لین دین

اس ۷۵ منٹ سے زیادہ گفت گو کے بعد ہزایکسی لنسی وزیر صحت نے مجھے اور سعدیہ کو وہ تحائف دیے کہ جو گریٹ لیڈر صدر کم ال سنگ صاحب کی جانب سے ہم دونوں کے لیے آئے ہیں۔ ہم نے بڑے شرف و مسرت کے ساتھ صدر کم ال سنگ صاحب کا یہ تحفہ قبول کیا کہ جو ان کے ذاتی وزٹنگ کارڈ کے ساتھ آیا ہے۔ یہ تحفہ میرے تحفے کے جواب میں آیا ہے کہ جو میں نے جناب صدر کم ال سنگ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ پھر میں نے وزیر صحت کی خدمت میں مطبوعات ہمدرد کا ایک سیٹ پیش کیا اور ایک چاندی کی تھالی منقش پیش کی جس کے وسط میں مینار پاکستان سنہری رنگ میں لگا ہوا ہے۔ اس ہدیہ کو انھوں نے شکریے کے ساتھ قبول کیا ہے۔

عشائیہ

وزیرِ صحت صاحب نے ایک عشائیے کا اہتمام کیا تھا، یہاں انھوں نے سب سے پہلے میری آمد پر میرے استقبال کے لیے ایک تقریر کی جو بڑی اچھی تھی۔ اس میں انھوں نے میری آمد اور میری طب سے دلچسپی کا ذکر کیا۔ اس تقریر میں انھوں نے امید ظاہر کی

کہ پاکستان اور کوریا کے مابین تعلقات مزید بڑھیں گے ۔ اور پھر صدر مملکت پاکستان کا ذکر کیا کہ ہم یہاں ان کی آمد کے منتظر ہیں ۔ آخر میں انھوں نے جام صحت پیش کیا ۔ یہ تقریر لکھی ہوئی تھی ۔ اس تقریر کے بعد کھانا شروع ہو گیا ۔ جب کھانے کا ایک دور ختم ہو گیا تو میں نے اس موقع پر تقریر کی کہ جو میرے پاس لکھی ہوئی تیار تھی ۔ میں نے اس میں صدر کم ال سنگ صاحب کی جدوجہد اور فتح و نصرت کا اختصار سے ذکر کیا اور ان کی درازیٔ عمر کے لیے دعا کی کہ میں ان کے ۷۰ویں سالگرہ میں شریک ہوا تھا ۔ پھر میں نے کوریا کے انضمام کا ذکر کیا ۔ یہ ان کی تقریر کے جواب میں تھا کہ پاکستان اس کا حامی ہے ۔ آخر میں میں نے ان کو یقین دلایا کہ صدر پاکستان کوریا آنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور وہ ضرور آئیں گے ۔ آخر میں میں نے جام صحت تجویز کیا ۔ اور کھانے کا سلسلہ پھر جاری ہو گیا ۔

آج بکثرت کھانا تھا اور انواع و اقسام تھیں ۔ سفارت خانۂ پاکستان کے ناظم الامور صاحب نے کوریائی استفسار پر پہلے ہی ان کو بتا دیا تھا کہ ــــ کھانے میں لحم خنزیر نہ ہو ، مگر انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ میں گوشت نہیں کھاتا ہوں ۔ میں نے اپنے سبزی خور ہونے کا اعلان پہلے دن ہی اپنی گائڈ کے سامنے کر دیا تھا ۔ انھوں نے اس ہدایت کو فراموش کیا ۔ میں گزشتہ ۱۰ دن سے بغیر گوشت کے کھانا کھا رہا ہوں ۔ مگر آج مسئلہ نازک ہو گیا اور میں نے مجبوری کا سہارا لے کر آج ایسی چیزیں کھا لی ہیں جن پر شاید ذبیحہ کی تعریف صادق نہیں آتی ہے ۔

عشائیہ ڈیڑھ گھنٹے جاری رہا ۔ اس میں مسلسل باتیں ہوتی رہیں ۔ لطیفوں کے بعد میں نے بھی ان کو دو لطیفے سنا دیے ۔ میری تقریر کے بعد کھانا ختم سمجھا گیا تھا مگر سلسلہ جاری رہا اور انواع و اقسام کی ڈشیں آتی رہیں ۔ مجھے مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی یاد آ گئے ۔ مولانا کسی تقریبِ طعام میں شریک تھے اور کھا کر رُک چکے تھے ۔ میزبان نے لاکھ اصرار کیا مگر ان کا پیٹ بھر چکا تھا اور وہ ہاتھ کھینچ چکے تھے ۔ میزبان کا اصرار تھا کہ ذرا سا اور نوش جان فرما لیں ۔ مگر مولانا ملیح آبادی راضی ہوئے نہ

تیار۔ بالآخر میزبان نے کہا :

اچھا مولانا کل صبح کا کھا لیجیے !
مولانا جھٹ راضی ہو گئے ، " ہاں ایسا ہو سکتا ہے ! "

میں نے یہ لطیفہ سنا کر وزیر صحت سے کہا : " اب میں آپ کے اصرار پر کل کا کھانا کھا رہا ہوں !

ایک خان صاحب اور ایک لالہ جی ریل میں ہم سفر تھے ۔ دوران سفر باتیں ہوئیں اور بات کھانے پینے کی آ گئی ۔

خان صاحب : کیوں لالہ جی .. آپ کھانے میں کیا اہتمام کرتے ہیں !

لالہ جی : بھائی ہم اپنے معدے کے تین حصے کرتے ہیں

خان صاحب : پھر کیا کرتے ہیں ؟

لالہ جی : ایک میں کھانا ۔ ایک میں پانی ۔ ایک خالی کہ سانس آ جا سکے

لالہ جی نے اس موقع پر خان صاحب سے سُوال کیا کہ خان صاحب آپ کیا کرتے ہیں ؟

خان صاحب : بھائی ہم بھی معدے کے تین حصے کرتا ہے
ایک میں کھانا ۔ دوسرے میں کھانا ۔ تیسرے میں کھانا ۔

لالہ جی : اور پانی کی جگہ ؟

خان صاحب : پانی اپنا راستہ خود بنا لیتا ہے

لالہ جی : اور سانس کا کیا ہوتا ہے ؟

خان صاحب : سانس کی ایسی کی تیسی ، آئے نہ آئے !

میں نے آج کھانے پر یہ لطیفہ سنا کر وزیر صحت کو خوب ہنسا دیا ! ساڑھے آٹھ بجے وزیر صحت صاحب نے ہمیں احترام سے رخصیت کر دیا !

۲۳-اپریل ۱۹۸۲ء - جمعہ - پیونگ یانگ / بیجنگ

آج شمالی کوریا میں قیام کا آخری دن ہے ! میں صبح جلد بیدار ہوگیا - رات حسب معمول سویا مگر آج کسی بستر کے بغیر !یہاں آرام اس قدر زیادہ مل رہا ہے کہ اب عادتوں کا درست کرنا ضروری ہے ! میں نے اپنی ڈائری کو آخری شکل دیدی ہے از ۱۳- اپریل تا ۲۲-اپریل دس دن تک جو مصروفیتیں رہی ہے اور سرگرمیاں " سرزد " ہوئی ہیں ان کو احاطۂ تحریر میں لے آیا ہوں - ۲۲/اپریل کا جو حال ختم ہوا اس کے ایک سو پچاس صفحات تیار ہوگئے ہیں- یہ تو ایک پوری کتاب ہوئی ! ہنوز بعض تاثرات باقی ہیں جنھیں لکھنا شروع کرتا ہوں - کل سے تو چین کے حالات ہوں گے - مگر مسئلہ در پیش یہ ہے کہ کاغذ میرا ختم ہو گیا ہے - کسی اور کاغذ پر لکھنے کی عادت نہیں ہے - خیر اللہ مالک ہے -

سفارت پاکستان میں

آج کا دن میں نے سفارۃ پاکستان میں صَرف کرنے کا فیصلہ کیا- صبح جناب نوراللہ صاحب ناظم الامور تشریف لے آئے تھے - میں ان کے ساتھ اس علاقے میں گیا کہ جو سفارت خانوں کے لیے مخصوص ہے اور جہاں ہر سفارت کار محبوس ہے - اکثر سفارت خانے کمیونسٹ / شوشلسٹ ممالک کے ہیں اور ان کا ایک خاص مزاج ہے - نہ آپس میں ملتے ہیں اور نہ دوسروں سے ملنا چاہتے ہیں - اگر چاہیں بھی تو پابندیوں میں جکڑے ہوئے ہیں - اگر مسلمان ممالک کے سفرا اور دوسرے سفارت کار آپس میں ملیں تو ان پر بڑی کڑی نگاہ رکھی جاتی ہے - مگر خود بھی وہ ایک دوسرے سے جدا ہیں - مصری امام کے پیچھے عرب ممالک کے سفارت کار نماز ادا نہیں کرتے کہ وہ یہودی ہے - اور خود عرب ممالک کے سفرا ایک دوسرے سے دور ہیں - عراق تو سفارت خانہ بند کر کے چلا ہی گیا اس لیے کہ اسے یہ شکایت ہے اور شاید غلط نہیں ہے کہ کوریا نے ایران کی عسکری مدد کی ہے - اور میں یہ بات بھی کہہ سکتا ہوں کہ ایران کی پروپیگنڈا

مشنری اس وقت شمالی کوریا کے ساتھ میں ہے۔ایران میں کوریا کے لوگ بیٹھ کر تمام اسکیمیں تیار کر رہے ہیں اور ہم بڑی ہی آسانی کے ساتھ روس کو اس انتظام کی داد دے سکتے ہیں۔ایران کے شمالی کوریا کے ساتھ گہرے تعلقات ہیں۔ایرانیوں کی یہاں اچھی آؤ بھگت ہوئی ہے۔

سفارتِ پاکستان کے چار سفارت کار ہیں ۔میں ان سے اطمینان سے ملا اور ان کے درمیان کوئی دو گھنٹے بیٹھا رہا ، اور ان سے باتیں کرتا رہا ۔یہاں مجھے پہلی بار یہ معلوم ہوا کہ پاکستان کے سفارت کاروں پر تنہائی اور بے۔کاری کا بڑا گہرا اثر ہے ۔ کم از کم دو سفارت کار نیم پاگل ہو کر یہاں سے واپس بھجوائے جاچکے ہیں اور اب جو لوگ ہیں ان پر واقعی تنہائی کا گہرا اثر ہے اور میں نے ان کو غیر مطمئن اور پریشان پایا ہے ۔اس روشنی میں میں نے تو اس پر غور کیا کہ اگر واقعی میں یہاں دس دن سے زیادہ کا پروگرام بنا لیتا تو شاید پریشان ہو جاتا۔مجھ پر اس قسم کے اثرات دوسرے ممالک میں نہیں ہوتے ۔آخر یہاں ایسا کیوں ہوا ہے !

میں نے آج شب بیجنگ پہنچنے پر جناب محترم صاحبزادہ یعقوب خاں صاحب،وزیرِ خارجۂ پاکستان ، کو یہ مشورہ دیا ہے کہ ان سفارت کاروں کو کچھ عرصے بعد ہانگ کانگ وغیرہ کی سیر کی اجازت دے دینی چاہیئے ۔اور یہاں اب ایسے لوگ بھجوائے جائیں کہ جو ریٹائر ہو گئے ہوں اور باقی دن اس قسم کی خدمت کو اپنے لیے غنیمت جانیں ۔اس پر جناب ڈاکٹر بھٹی صاحب نے فرمایا " ہم ایسا ہی کر رہے ہیں "۔ میں نے ان سے کہا کہ میرے علم میں ہے کہ اب ائر وائس مارشل ریٹائر ہو کر بہ حیثیتِ سفیر آ رہے ہیں !

شمالی کوریا کا دس روزہ سرکاری دورہ آج اختتام پذیر ہوا ۔میں نے جناب وزیرِ صحت سے درخواست کی تھی کہ وہ ہوائی میدان تشریف لانے کی بالکل زحمت نہ فرمائیں ، مگر ان کا خلوص و انس ان کو ہوائی میدان لے آیا اور میں شرم سار ہوا ۔وہ مصروف انسان ہیں اور خود بڑے اچھے سرجن ہیں۔وزارت کے ساتھ اپنے مریضوں کو بھی دیکھتے ہیں ۔

ہوائی میدان پر تبادلۂ خیال کا مزید موقع مل گیا - میں نے ان کو ایک مشورہ یہ دیا ہے کہ وہ مرکزِ تحقیقاتِ طبیہ ، کہ جو صدر کم ال سنگ کی خصوصی ہدایت پر پائے تکمیل کو پہنچا چاہتا ہے ، کے افتتاح کے موقع پر ایک کنگرسِ عالمی طبِ مشرقی کا اہتمام کریں - میری یہ تجویز انھوں نے مان لی ہے اور اس سے بھی اتفاق رائے کر لیا ہے کہ عالمی ادارۂ صحت کو اس میں شریک کیا جائے -

میں نے " میڈیسن ان کوریا " لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے - میں نے ان کو بتایا ہے کہ میں نے اس کے لیے خاصا میٹریل جمع کر لیا ہے مگر مجھے مزید معلومات درکار ہیں - جناب وزیر صحت نے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ مجھے یہ فراہم کریں گے -

بالآخر چائنا ایئرلائنز کا ہوائی جہاز پیونگ یانگ سے بیجنگ اُڑنے کے لیے تیار ہو گیا - ہم دو دوست بغلگیر ہوئے اور پھر نہ جانے کتنے عرصے کے لیے جدا ہو گئے -

میں نے اپنی رہنما مادام کوران سل اور ترجمان مسٹر کم چینگ ہیبون کا دلی شکریہ ادا کیا - جدائی کے وقت سعدیہ اور مادام دونوں کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے - ان کی شدید محنت و محبت ہمارے لیے ناقابل فراموش رہیں گی -

دو کوریا ــــ ایک تجزیہ

جنوبی کوریا میں ایک عام نعرہ یہ ہے کہ " ملک مالدار ہو اور فوج مضبوط " - شمالی کوریا کی طرف سے حملے کا خطرہ ہر وقت اس ملک کی چالیس ملیون آبادی کے سر پر سوار رہتا ہے - اختلافات بھی تو شدید ہیں ، شاید ہی دو متصادم اور مخالف ہمسایہ ملکوں کے درمیان سخت سے سخت الفاظ کا آئے دن ایسا تبادلہ ہوتا ہو جیسا کہ سرحد کے دونوں طرف سے کوریا میں بوچھاڑ ہوتی رہتی ہے -

پان من جان ایک ایسا گاؤں ہے جہاں کچھ جھونپڑیاں پڑی ہوئی ہیں ، ان ہی جھونپڑیوں اور خیموں میں اقوام متحدہ کے مبصروں کی نگرانی میں ۱۹۵۳ء میں دونوں حصوں (شمالی و جنوبی

کوریا) کے نمائندوں نے تلخ و تند لہجے اور حد درجہ ناشائستہ الفاظ کے تبادلے کے بعد ایک طرح کا صلح نامہ طے کر لیا تھا اور اس صلح نامے کے تحت جب بھی کوئی مسئلہ درپیش ہوتا ہے تو اقوام متحدہ کے مبصرین کی موجودگی میں دونوں فریق لکھے ہوئے پرچوں کا تبادلہ کر لیتے ہیں ۔ سخت کلامی کی نوبت کم آتی ہے ۔ البتہ سرحد کے دونوں طرف سے لاوڈ اسپیکروں پر ہر طرح کی ملاحیاں تقریباً ہر وقت ایک دوسرے پر نچھاور کی جاتی رہتی ہیں ۔

پان من جان نامی دیہاتی علاقے کے پاس سیمنٹ کنکریٹ کی سڑک دونوں فریقوں کے درمیان حائل ہے ، ورنہ اصل حد فاصل چار کیلو میٹر عریض علاقہ ہے جسے غیر جانب دار یا غیر مملوکہ علاقہ کہا جاتا ہے ۔

شمالی کوریا اور جنوبی کوریا کی سرحد پر واقع پان من جان ، اب سیاحوں کے لیے خاص تفریح گاہ بن گیا ہے ۔ ۱۹۵۳ ء میں اسی جگہ دونوں حصوں کے نمائندوں نے اختلاف رائے ختم کرنے کا معاہدہ کیا تھا ۔ اب تقریباً تیس سال بعد اس گاؤں میں کشیدگی کی فضا میں کچھ کمی واقع ہوئی ہے اور لوگ سیمنٹ کنکریٹ کی بنی ہوئی سڑک پر گھوم پھر سکتے ہیں اور شمالی کوریا کے سرحدی فوج کے سپاہی انہیں خونخوار نظروں سے نہیں دیکھتے بلکہ منھ سے سیٹی بجاتے رہتے ہیں ۔ اپنا بھاری بھر کم یونیفارم جگہ جگہ سے درست کرتے رہتے ہیں بلکہ بعض وقت تو وہ (جنوبی کوریا کی طرف کے) فوٹو گرافروں کی تقلید میں خود بھی کیمرہ استعمال کرتے ہیں ۔ جنوبی کوریا کی طرف سے تو بے شمار کیمرے وقت بے وقت استعمال ہوتے رہتے ہیں ۔

امریکی فوجوں اور سیاحوں کا کہنا ہے کہ شمالی کوریا کے سرحدی فوجی اب نہ تو زیادہ وخشت باری کرتے ہیں نہ ان کو دیکھ کر پہلے کی طرح تھوکنے لگتے ہیں ۔ البتہ چار کیلومیٹر چوڑی پٹی کے آر پار سخت کلامی اور گولیاں چلانے کا معرکہ خوب گرم رہتا ہے ۔ یہ چار کیلومیٹر چوڑی پٹی دونوں حصوں کے درمیان جنگ بندی کے بعد بنا دی گئی ہے اور ساحلِ سمندر تک چلی گئی ہے ۔

بعض لوگوں نے بیان کیا ہے کہ اس سال موسم بہار میں ایک دن پھر پان من جان کے آس پاس دونوں ملکوں کے باشندوں کے درمیان

سخت کلامی کی چاند ماری کھیلی گئی مگر آوازیں زیادہ دور تک نہ سنی جا سکیں - بہر حال سرحد سے کوئی ایک میل دُور جنوبی کوریا کے علاقے میں ایک گاؤں کے پرائمری اسکول میں کئی سو فیٹ اونچا پرچم لہراتا دور سے نظر آتا ہے -

ایک واقعہ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ پان من جان کی ایک جھونپڑی میں اقوام متحدہ کے مبصر فریقین کے نمائندوں سے شمالی کوریا کے ایک فوجی کی لاش واپس کرنے کے معاملے پر مصروف گفت و شنید تھے ، ۱۹۵۳ء کے معاہدے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ فریقین میں لاش کی واپسی زیر بحث آئی - ذرا ذرا سی تفصیل پر بحث ہوئی تاکہ عین وقت پر مارا ماری یا کوئی اور ناخوشگوار صورت نہ پیدا ہو جائے - یہ پہلے سے طے ہوا کہ وقت کیا ہوگا ، لاش کی شناخت کے لیے شمالی کوریا کے آدمی کس طرح غیر جانبدار علاقے میں آئیں گے اور لاش کس طرح ان کے حوالے کی جائے گی - لاؤڈ اسپیکروں کے ذریعہ سے ذرا ذرا سی بات باہر سنائی دے رہی تھی ، حتیٰ کہ کھانسنے کی آواز ، زیر لب گفت گو ، کرسی سرکانے کی آہٹ وغیرہ بہر حال اس بظاہر پر امن علاقے ـــــ پان من جان ـــــ میں کسی وقت بھی سخت معرکہ آرائی شروع ہو سکتی ہے -

جنوبی کوریا تو پوری طرح تیار ہے اور اس کا بڑا شہر سیول (SEOUL) تو سرحد سے صرف پچیس میل دور ہے جس کی حفاظت کے لیے کنکریٹ کی اونچی دیوار بھی تیار کر لی گئی ہے اور ٹینکوں کو پھنسانے کے انتظامات بھی ہیں - تاہم یہ بات بھی بتائی جاتی ہے کہ جنوبی کوریا کے مقابلے میں شمالی کوریا کی فوج زیادہ (چھے لاکھ کے مقابلے میں سات لاکھ) ہے اور اس کے پاس بحری اور فضائی طاقت بھی زیادہ ہے - شمالی کوریا کی آبادی اٹھارہ ملین ہے اور اگرچہ اس کی معاشی ترقی کو ابھی مزید استحکام کی ضرورت ہے - مجموعی قومی پیداوار جنوبی کوریا کی مجموعی قومی پیداوار کے مقابلے میں ایک چوتھائی بلکہ $\frac{1}{5}$ سے بھی کم ہے لیکن وہ اپنی مجموعی قومی پیداوار کا پچیس فیصد دفاع (جنگی سامان) پر خرچ کرتا ہے ، درانحالیکہ جنوبی کوریا اپنی مجموعی قومی پیداوار کا صرف چھے فیصد دفاع پر صرف کرتا ہے -

شمالی کوریا میں ہر رخ تعمیری جد وجہد کے علی الوغم اب صدر کم ال سنگ نے قوم کو نیا نعرہ یہ دے دیا ہے کہ شمالی کوریا کا منتہائے جد وجہد یہ ہے کہ جنوبی کوریا کو امریکی چنگل سے ازاد کرا کے ایک عظیم کوریا کا خواب شرمندۂ تعبیر کیا جائے - یہ جد وجہد بڑی معنی خیز ہے - میرا مطالعہ یہ ہے کہ شمالی کوریا میں اس وقت بڑی زبردست لام بندی جاری ہے ، مگر انتہائی احتیاط اور شاید اخفا کے ساتھ - شمالی کوریا میں کاروبارِ زندگی بڑی حد تک خواتین کے ہاتھوں میں ہے - کھیت سے لے کر ہسپتال تک عورت ہی نمایاں ہے - قیاس یہ چاہتا ہے کہ تمام مرد فوجی خدمات میں مصروف ہیں - اس وقت نرسری سے لے کر اعلا تعلیم تک فوجی اور عسکری تعلیم کو اہمیت حاصل ہے - اسکول کے بچوں کا سلام سلیوٹ ہے اور ان کو تعلیم کے ساتھ عسکریت کا درس بھی بچپن سے دیا جا رہا ہے اس لیے عملاً یہاں ہر مرد فوجی ہے - شمالی کوریا کی یہ عسکری پیش رفت معنی خیز ہے اور میری رائے میں وہ وقت اب دور نہیں ہے کہ شمالی کوریا کی افواج جنوبی کوریا کی آزادی کا سامان کرنے کا فیصلہ کریں گی - ادھر جنوبی کوریا کے بارے میں یہ سمجھنا کہ وہاں کے لوگ امریکا کے زیر اثر ہیں کسی طرح صحیح نہیں ہے - ہر چند کہ جنوبی کوریا میں جو آزادی حاصل ہے اور عیش وعشرت کا جو سامان کر دیا گیا ہے وہ کوریا کو ایک کرنے کی جد وجہد میں مانع آئے گا مگر شمالی کوریا کا دباؤ بہت جلد اس قدر بڑھ جائے گا کہ امریکا کے لیے جنوبی کوریا کو زیر نگیں رکھنا زیادہ عرصہ ممکن نہ ہوگا - شمالی کوریا نے چین سے مایوس ہو کر روس سے تال میل قائم کیا ہے - پیونگ یانگ سے آج بھی منگل اور ہفتے کے دن ایک ٹرین چلتی ہے کہ جو بیجنگ ہوتی ہوئی ماسکو تک جاتی ہے - چین کے لیے شمالی کوریا سے بگاڑنا ممکن نہیں ہے - وہ شمالی کوریا اور روس کے تعلقات کو بہ نگاہِ تشویش دیکھ رہا ہے - ادھر روس نہایت احتیاط سے جنوبی کوریا کی آزادی اور شمالی کوریا میں اس کی شمولیت کا زبردست حامی ہے - جس دن یہ انضمام ممکن ہو گیا ، اور میری رائے ہے کہ ہو کر رہے گا ، اس دن کوریا اور روس مل کر چین کے لیے مسائل پیدا کریں گے - کم ال سنگ برتھ ڈے میں چین

کی اہم شخصیات کی عدم شرکت کم معنی خیز نہیں ہے - کیا یہ کہنا صحیح ہے کہ ذہنی طور پر چین جنوبی کوریا کا حامی ہوگیا ہے اور وہ دونوں کوریاؤں کے انضمام میں مانع ہے ؟ میرا ذہن اسے قبول کرنے کو تیار نہیں ہے - پھر وہ کیا حکمت عملی ہوگی کہ دونوں مل جائیں اور چین ان کا دوست رہے ؟ روس کا اس باب میں کیا کردار ہوگا ؟ ہر چند کہ تقریبات میں روس کا وفد نہیں آیا ہے ، مگر جناب برزنیف کا بیان اور پیغام تبریک یہاں کے اخبارات نے خاصا نمایاں کر کے شائع کیا ہے جبکہ صدر چین کا بس ڈیڑھ سطر میں ذکر ہے کہ ان کا پیغام تہنیت آیا ہے -

اگر ہم ماضی میں جائیں اور ۱۹۵۲ء تک کا مطالعہ کریں تو اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ چین کے وزیر اعظم جناب چو این لائی نے جینوا میں اقوام متحدہ کے اجلاس میں جنوبی کوریا اور شمالی کوریا کے انضمام کا کیس پیش اور پلیڈ کیا تھا - چین تقسیم کوریا کا سب سے بڑا مخالف رہا ہے - مگر گزشتہ دنوں چین کا ایک وفد جب شمالی کوریا آیا تو یہاں کے اخبارات نے اسے اہمیت کے ساتھ کالموں میں جگہ دی جبکہ خود چین میں اسے نظر انداز کیا گیا -

کم کی پیش رفت

کہا جاتا ہے کہ جنوبی کوریا کے لوگ شمالی کوریا کی فوج کی تعداد سے اتنے خائف نہیں جتنے شمالی کوریا کے جنگی پینترے سے - عام خیال یہ ہے کہ ان کا یہ ہمسایہ دفعتاً حملہ کر کے سیول کے شمالی نصف پر دریائے ہاں تک قبضہ کر لے گا اور پھر صلح کی بات شروع کرے گا - جنوبی کوریا کے پاس ایسے دفعتاً حملے کی مدافعت کی ضمانت وہ امریکی فوج ہے جو جنوبی کوریا کی فوج اور اقوام متحدہ کے سپاہیوں کے درمیان تعینات ہے - حملے کی صورت میں پہلی گولی امریکی فوج پر چلے گی - چنانچہ جب امریکا کے سابق صدر مسٹر کارٹر کا ایک مرتبہ یہ بیان شائع ہو گیا تھا (جس کی بعد میں تردید ہو گئی) کہ وہ امریکی فوجیوں کو واپس بلانے والے ہیں تو جنوبی کوریا میں بڑی کھلبلی مچ گئی تھی -

ماہروں کا خیال ہے کہ اگر شمالی کوریا کی فوجیں دفعتاً سیول پہنچ گئیں تو ان کو وہاں سے نکالنا غیر ممکن ہوگا - یہ انکشافات کہ غیر جانبدار علاقے کے نیچے نیچے انھوں نے چوڑی چوڑی سرنگیں کھود رکھی ہیں جن میں سے فوجیں گزر سکتی ہیں ، نیز ان کے ایک لاکھ نفری کمانڈو دستے ، جنوبی کوریا کے فوجی ماہروں کے اس اندیشے کو تقویت دیتے ہیں کہ جنوبی کوریا کی فوج پر دفعتاً حملہ ہو سکتا ہے اور وہ وقت پر اس کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے -

جنوبی کوریا والوں کو اس کی خبر بھی نہیں ہوتی کہ شمالی کوریا میں ہو کیا رہا ہے - دو باتیں خاص طور سے جنوبی کوریا والوں کے لیے معما بنی ہوئی ہیں اور وہ ہر اس پیام تہنیت پر اسی نظر سے غور کرتے ہیں جو شمالی کوریا کے صدر کم ال سنگ کی سالگرہ کی تقریب میں ان کو بھیجا گیا یا جو بھی وفد شمالی کوریا کے دارالحکومت پیونگ یانگ پہنچے اس پر اسی نظر سے رائے زنی ہوئی ہے کہ ان دونوں صورتوں میں کیا ہوگا اگر شمالی کوریا کے صدر کا بیٹا ان کا جانشیں ہو جائے - دوسری بات یہ کہ کیا شمالی کوریا کے لیے یہ ممکن ہوگا کہ وہ جمہوریہ چین کا خیال کیے بغیر جمہوریہ روس کے ساتھ زیادہ قریبی تعلقات قائم کر لے -

میں نے اپنے مطالعے میں انہماک کا حتی الامکان حق ادا کیا ہے اور میرا تاثر یہ ہے کہ صدر کم ال سنگ غیر اختلافی شخصیت کسی طرح نہیں ہیں - ان کو غالباً پارٹی میں تنقید اور بعض اوقات تضحیک کا بھی نشانہ بننا پڑتا ہے - پارٹی میں اعلا سطح پر ان کی رائے آزاد نہیں ہے - اور میں اس سے بھی واقف ہوں کہ ان کو اپنی حفاظت کرنی ہوتی ہے اور وہ حفاظتِ جان کے لیے اپنے قیام کی جگہیں بھی بدلنے پر مجبور ہیں - " ینگ لیڈر " (فرزندِ دل بند) کی جانشینی کا معاملہ کم اہم نہیں ہے - میں آگے اس موضوع پر تفصیل سے اپنے خیالات کا اظہار کروں گا - سیاسی اعتبار سے کم ال سنگ شاید وہ پہلے اور واحد سیاسی لیڈر ہیں جنھوں نے مارکس اور لینن کے اصولوں کی علم برداری کرتے رہنے کے باوجود ملوکیت کے گئے گزرے نظام کی تجدید کی کوشش شروع کر دی ہے - میں نے اپنے مطالعہ

کے دوران یہ محسوس کیا ہے کہ ان کے ثناخوانوں نے ان کی مدح میں جو کچھ لکھا اور جو کرامات ان سے منسوب کی گئی ہیں ان میں یہ بھی ہے کہ وہ پانی یا دریا و سمندر کو پا پیادہ عبور کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اگرچہ یہ سب ان ثناخوانوں نے گفتہ آید درحدیثِ دیگراں کے پیرائے میں دنیا کے سامنے پیش کیا ہے لیکن سب جانتے ہیں کہ ان کی اس کوشش کو کہ ان کے چالیس سالہ فرزند، مسٹر کم جونگ ال کو اختیارات (حکومت) سونپ دیے جائیں، ہر مرتبہ بڑی مخالفت کے ساتھ روکا گیا ہے، سالہا سال یہ کوشش ہوتی رہی اور جنوبی کوریا میں تو ہر مرتبہ یہ افواہ امید کے خلاف غلط ہی ثابت ہوئی۔ شمالی کوریا کے متعلق، خاندانی جھگڑوں کے بارے میں خاص طور سے جنوبی کوریا میں جو افواہیں مشہور ہوتی رہتی ہیں وہ ان سیاسی سازشوں اور چالبازیوں سے متعلق خبروں کی یاد دلاتی ہیں جو اس زمانے میں عام تھیں جب سارا ملک کوریا چھوٹی بڑی ہر طرح کی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔

جنوبی کوریا کے تجزیہ نگار عام طور سے اس بات پر متفق ہیں کہ نوجوان، کم جونگ ال کو اگر اقتدار مل گیا تو ان کے طرزِ عمل کے بارے میں پہلے سے کوئی رائے قائم کر لینا، موجودہ زمانے سے بھی زیادہ مشکل ہو گا۔ جنوبی کوریا کے نیشنل ڈیفنس کالج کے ایک تجزیہ کار نے بڑی ناپسندیدگی کے ساتھ یہ رائے زنی کی کہ اب تک تو "انہوں نے جو چاہا ان کو ملتا گیا کیونکہ وہ ایسے بڑے ڈکٹیٹر کے بیٹے ہیں جس کی پہلے سے کوئی مثال نہ تھی۔"

میرا تجزیہ یہ ہے کہ شمالی کوریا کی حکومت اب جمہوریۂ روس سے تجدیدِ مفاہمت کی فکر میں ہے جہاں سے اسے سب سے زیادہ اسلحہ ملتا رہا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جمہوریہ چین سے ماؤ نظریات کے خاتمے پر شمالی کوریا کو خوشی نہیں ہوئی۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ شمالی کوریا کے معاشی معاملات جیسے جیسے پیچیدہ ہوتے جائیں گے اس کی اسلحہ جمع کرنے کی خواہش بڑھتی ہی جائے گی۔ شمالی کوریا کو اب بھی جمہوریۂ روس سے بڑی تعداد میں اسلحہ مل رہا ہے اور اس کی بدولت ایک طرف تو اس

کی اپنی معاشی کمزوری کا مداوا ہو رہا ہے اور دوسری طرف جنوبی کوریا کی بڑھتی ہوئی صنعتی طاقت سے نمٹنے میں سہولت ہو رہی ہے۔

شمالی کوریا اور جمہوریۂ روس کے بڑھتے ہوئے تعلقات پر یہ اندیشہ ظاہر کیا جا سکتا ہے کہ اس طرح شمالی کوریا ایشیا میں وہی کردار ادا کرنے لگے گا جو کیوبا جنوبی بحر اطلانٹک کے علاقے میں ادا کر رہا ہے۔ فی الوقت تو یہ ممکن نظر نہیں آتا، البتہ ایسا اس حالت میں ہو سکتا ہے کہ شمالی کوریا کی معیشت بالکل ہی تباہ ہو جائے اور وہ جمہوریۂ روس کا دست نگر ہو جائے۔ صدر کم ال سنگ نے ابھی تک تو روس اور چین کو ایک دوسرے کا رقیب پاکر اپنی راہوں کو ہموار کیا ہے۔ پہلے وہ روس کی طرف بہت مائل رہے، پھر استالین کے مرنے کے بعد چینیوں سے رشتۂ محبت استوار کیا۔

فکر و تحقیق کا ایک دل چسپ پہلو یہ ہے کہ جنوبی کوریا اپنے ساتھیوں اور ہمسایوں کو برابر یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہے— اور وہ ماننے سے انکار پر انکار کر رہے ہیں —— کہ مشرقی ایشیا میں اب بھی سرد جنگ جاری ہے۔ معاشی امداد کے معاملے میں جنوبی کوریا اور جاپان کے درمیان بڑی طول طویل سودے بازی کی گفت و شنید ہوئی جو ابھی حال ہی میں ختم ہوئی اور جنوبی کوریا کو اپنے اس موقف سے بالآخر دست بردار ہونا پڑا کہ چونکہ علاقے میں طاقت کا توازن برقرار رکھنے کی خاطر جنوبی کوریا کو دفاعی سامان کثرت سے خریدنا ہے لہذا جاپان کی طرف سے اس کی معاشی امداد میں معتدبہ اضافہ کیا جائے۔

جزیرہ نمائے کوریا کے شمالی و جنوبی حصوں کے درمیان کشمکش اور آویزش کا اثر دونوں حصوں کے عوام کی معاشی حالت پر بہت برا پڑ رہا ہے۔ غالباً اسی وجہ سے اور بھی جنوبی کوریا کی طرف سے شمالی کوریا سے بات چیت کی کوشش کی جا رہی ہے کہ اگر فی الوقت دونوں حصوں کو دوبارہ ملانے کی بات ممکن نہ ہو تو اتنا تو ہوجائے کہ علاقے کی یہ غیر یقینی کیفیت کم ہو جائے۔ دونوں حصوں کے نمائندوں کے درمیان بات چیت کا سلسلہ کئی بار شروع ہوا مگر جلد ہی ختم بھی ہو گیا کیونکہ بات چیت نے ہر مرتبہ سخت کلامی

کی صورت اختیار کر لی - چنانچہ اب سوا ان ملاقاتوں کے جو پان من جان میں ہوتی ہیں اور جہاں دونوں فریق لکھے ہوئے مسودے پڑھ دیتے ہیں ، دونوں حصوں کے درمیان کوئی رابطہ نہیں ہے - عوامی سطح پر بھی خط ، تار ، ٹیلیفون ، ہر قسم کے رابطے بند ہیں، تجارت کا کوئی سُوال ہی نہیں - خاندان اس طرح تقسیم ہوئے ہیں کہ تقریباً تیس برس سے تقسیم شدہ افراد ایک دوسرے سے ملنا تو درکنار ،خیر خیریت سے بھی بے خبر ہیں-

جنوبی کوریا میں مسٹر چن کے صدر ہونے کے بعد سے شمالی کوریا نے بات چیت سے قطعی بےتعلق کا رویہ اختیار کیا - مسٹر چن نے بات چیت شروع کرنے کے لیے اقدام کیا بھی تو شمالی کوریا کی طرف سے شرائط یہ پیش ہوئیں کہ امریکی فوجیں جنوبی کوریا سے چلی جائیں ، کمیونسٹوں کی سیاسی تحریکوں پر قانونی پابندی نہ رہے اور مسٹر چن صدارت سے مستعفی ہو جائیں - میرا تاثر یہ ہے کہ امریکی افواج کا جنوبی کوریا سے انخلا ایک صریحاً جائز مطالبہ ہے-

اس سال جنوری میں جنوبی کوریا نے پھر قدم بڑھایا اور بات چیت نیز روابط قائم کرنے کے لیے ایک مفصل لائحۂ عمل بنا کر بھیجا جس میں دونوں حصوں کے مابین ڈاک اور ٹیلیفون کی سہولتوں اور غیر جانبدر علاقے میں ایک کھیل کا میدان (Sports Stadium) بنانے کی تجویز بھی تھی لیکن شمالی کوریا کی طرف سے جواب آیا کہ وہٗ جنوبی کوریا کے کسی عہدہ دار یا ثقافتی ادارے سے بات کرنا پسند نہیں کرتا - چنانچہ یہ اقدام بھی یونہی ختم ہوا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صورت حال یہی رہے گی تاوقتیکہ کوئی ایسا سیاسی انقلاب آئے کہ دونوں کوریا اس آویزش اور محاذ آرائی کو ختم کرنے میں دلچسپی لینا شروع کر سکیں-

متمول ملک اور مضبوط وطاقتور فوج ــــ اب بھی جنوبی کوریا کا مطمحِ نظر ہے لیکن گزشتہ دس سال کی معاشی ترقی طاقتور فوج نہ بنا سکی- مبصرین کا خیال ہے کہ ابھی دس برس اور جنوبی کوریا فوجی ومعاشی لحاظ سے اس قابل نہیں ہو سکتا کہ شمالی کوریا سے میدانِ جنگ میں نمٹ سکے -

جنوبی کوریا کے دانشور، اعلا عہدہ دار، صنعت کار سب جانتے ہیں کہ ملک میں رشوت کا بازار بہت گرم رہتا ہے مگو بعض صورتوں میں یہ ناگزیر ہے اور جنوبی و مشرقی ایشیا کی ثقافتی زندگی میں ایسی اخلاقی کوتاہیاں عام ہیں، خصوصاً دوستوں اور عزیزوں کو فائدہ پہنچانا۔ معاشی ترقی کی تگ و دو میں جنوبی کوریا نے طرح طرح کے تجربے کر ڈالے، عالمی منڈی میں شمالی کوریا سے مسابقت مہمیز کا کام دیتی ہے مگر ہمسایہ علاقوں کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑتے ہیں۔ عالمی سطح پر قرضداروں کی فہرست میں اول برازیل، دوم میکسیکو اور نمبر تین جنوبی کوریا ہے۔ پھر بھی عالمی سطح پر مسابقت و مقبولیت کی کوششیں جاری ہیں۔ اولمپک کھیلوں کا مرحلہ بھی اسی جذبے کے تحت آتا ہے۔

اولمپک کھیل

۱۹۸۸ء کے اولمپک کھیل جنوبی کوریا میں منعقد ہوں گے مگر بڑا سوال یہ ہے کہ فروری ۱۹۸۸ء میں جنوبی کوریا کے موجودہ صدر کی میعاد ختم ہو رہی ہے اور اولمپک کھیل جولائی / اگست ۱۹۸۸ء میں ہوں گے، اس وقت کے سیاسی حالات کا کھیلوں پر کیا اثر پڑے گا، یہ ایک عام سوال ہے۔

۱۹۷۲ء میں جب شمالی کوریا کے مسٹر کم ہوچن نے رائفل چلانے کے مقابلوں میں سونے کا تمغہ جیتا، اور ان سے حسب معمول اخبار نویسوں نے ان کی مہارت و مشق کے بارے میں سوال کیا تو ان کے اس جواب سے سارے سامعین انگشت بدنداں رہ گئے کہ ان کے صدر کم ال سنگ نے ان کو یہی سکھایا ہے کہ گولی ایسی مارو کہ سیدھی دشمن کے قلب کو چیر دے!

نشانہ بازی کا سارا ریکارڈ شمالی کوریا کے اس نشانہ باز نے توڑ دیا تھا۔

اس واقعہ کو جنوبی کوریا میں خاصی مسرت کے ساتھ یہ کہہ کے بیان کیا جاتا ہے کہ ۱۹۸۸ء کے اولمپک کھیل ان کے ملک میں سیول کے شہر میں ہوں گے اور یہ واقعہ شمالی کوریا کی سفارتی و سیاسی

تدبو کے قلب پر ضرب لگانے کے مرادف ہے ۔ جنوبی کوریا والوں کا خیال ہے کہ اس عالمی اجتماع کے باعث نہ صرف ان کا عالمی وقار بڑھے گا بلکہ ان کی معاشی ترقی کو بھی فروغ ملے گا ، باشندوں میں اپج بڑھے گی اور وہ اپنے ترقی یافتہ ہمسایوں سے آنکھ ملا کر بات کر سکیں گے ۔

مبصرین کا خیال ہے کہ جنوبی کوریا کا یہ اندازہ مبالغے پر مبنی ہے ۔ جنوبی کوریا ہی کے دفتر خارجہ کے ایک متوازن مزاج افسر نے یہ تجزیہ کیا ہے :

" تدبر و سیاست کے میدان میں آزادی کے بعد سے یہ ہماری سب سے بڑی کامیابی ہے ۔ اس واقعہ (اولمپک کھیلوں) کی بدولت ہم تیسری دنیا کے ان ترقی پذیر اور ازاد خیال ملکوں سے روابط بڑھا سکیں گے جن کے روابط شمالی کوریا سے گہرے تھے، گویا ایک غیر سیاسی طریقے سے ہم سیاسی فائدہ حاصل کرسکیں گے۔ معاشی طور پر ہمیں کوئی فائدہ ہونے کی امید نہیں ، تاہم نقصان بھی نہ ہوگا کیونکہ ہماری کھیلوں سے متعلق مصنوعات کی بکوی اور سیاحوں کی بدولت آمدنی بھی خاصی ہو جائے گی ــــــ عام طور سے کوریا (جنوبی) کے باشندے خیال کرتے تھے کہ وہ ایک پسماندہ ملک سے تعلق رکھتے ہیں ، ان کو یہ بھی شبہ تھا کہ ان کی ثقافت میں کوئی بات شاید ہی قابل فخر ہو ، گویا وہ ایک طرح سے احساسِ کمتری کا شکار تھے ، لیکن اب یہ احساسِ کمتری ختم ہو سکتا ہے اور عام طور سے یہی خیال قائم رہے گا کہ ملک کی معاشی حالت قابل اطمینان ہے ، ورنہ اولمپک کمیٹی ، کھیلوں کے لیے جنوبی کوریا کی دعوت کیوں قبول کرتی ؟"

اولمپک کھیلوں پر جنوبی کوریا کا زیادہ سرمایہ صرف نہ ہوگا ، عوام میں جھنڈے لے کر قطار اندر قطار چلنے کا رواج پہلے سے ہی بہت رہا ہے ۔ جاپان اور شمالی کوریا کی طرف سے کھیلوں کے جنوبی کوریا کے شہر سیول میں منعقد کرنے کی مخالفت کی گئی تھی مگر اولمپک کمیٹی کا فیصلہ تمام مخالفین کے منہ پر طمانچے کا کام کر رہا

ہے - سیول شہر ، اس کے ہوٹل ، شاہراہیں ، پہاڑیاں، خندقیں اور سرنگیں اور بیچ شہر سے بہتا ہوا دریائے ہان ، کھیلوں اور متعلقہ کاموں کے لیے کافی سہولتیں فراہم کرتا ہے - حکومت کی طرف سے مزید سڑکوں کی تعمیر ، ۴۵ ملیوں نئے درخت لگانے کی مہم اور ۱۹۸۶ء میں ایشیائی کھیلوں کے موقع پر سارے انتظامات کا اچھا تجربہ اور معائنہ ہو جائے گا -

شمالی کوریا کے ردعمل کی بڑی فکر ہے - ابھی تک تو یہی معلوم ہو سکا ہے کہ اس کے کھلاڑی شرکت نہیں کریں گے - چین اور روس سے بھی یہی توقع ہے، اس لیے کہ یہ ممالک بھی جنوبی کوریا کو تسلیم نہیں کرتے - بعض مبصرین کا خیال ہے کہ اگر ۱۹۸۲ء تک شمالی کوریا کے کھلاڑیوں نے نمایاں کامیابیاں حاصل کر لیں تو شاید ۱۹۸۸ء میں وہ جنوبی کوریا کے مقابلے میں زیادہ تمغے حاصل کرنے کی کوشش میں سیول کے مقابلوں میں شریک ہو جائیں مگر مجھے اس رائے سے اتفاق نہیں ہے - اگر صدر کم ال سنگ اس وقت تک برسراقتدار رہے تو میری رائے یہ ہے کہ شمالی کوریا اور جنوبی کوریا کے انضمام کا مرحلہ طے ہو جائے گا خواہ اس کی کوئی صورت ہو - دو بڑی طاقتیں ، یعنی چین اور روس جنوبی کوریا میں امریکی طاقت کے وجود کو طبعاً ناپسند کرتے ہیں - اگر چین اور روس میں سیاسی مفاہمت ہو گئی تو امریکی افواج جنوبی کوریا میں کبھی مقیم نہیں رہ سکیں گی، اور کم ال سنگ دونوں کوریا کے انضمام میں کامیاب ہو جائیں گے مگر اس عمل میں خود کم ال سنگ صاحب کو جس توازن کی ضرورت ہے کیا وہ برقرار رہ سکے گا ؟ اس وقت بھی ان کے اقدامات قابل توجہ بنے ہوئے ہیں اور چین سے ان کی مفاہمت میں نمایاں طور پر کمی محسوس ہوئی ہے - اس کے علی الرغم ان کے صاحبزادے کی جانشینی کا مسئلہ ان کی کمزوری بن چکا ہے اور یہ کم خطرناک مرحلہ نہیں ہوگا -

جانشینیٔ فرزندِ دل بند

درحقیقت صدر ، کم ال سنگ ایک ایسی تجویز روبہ عمل لانے کی کوشش کر رہے ہیں جس کی کوئی مثال کمیونسٹ ملکوں کے مضبوط

و مستحکم لیڈروں کے طرزِ عمل میں نہیں ملتی - وہ بشدت چاہتے ہیں کہ ان کا چالیس سالہ بیٹا ، کم جونگ -ال ان کے بعد ملک کا "عظیم قائد" بن کر ان کا جانشین ہو- کم ال سنگ کی اس خواہش کے لیے،جو خاندانی وراثت کا پہلو لیے ہوئے ہے ، بیرونِ ملک تو بڑی سرد مہری پہلے ہی دکھائی گئی اور اب اندرون ملک بھی کوئی دلچسپی نہیں نظر آتی -میں نے محسوس کیا ہے کہ شمالی کوریا کے فوجی عہدہ دار (لیڈر) اپنے صدر کے اس خاندان پرستانہ طرز عمل سے بہت مضطرب ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی صدائے احتجاج ، صدر کم ال سنگ کو کافی ناگوار گزری- اگرچہ جاپان اور جنوبی کوریا میں ان خبروں کو غلط بتایا جاتا ہے لیکن شمالی کوریا کے دو بہت قریبی دوستوں میں سے ایک دوست ملک جمہوریۂ چین میں ایسی خبریں عام ہیں کہ کم ال سنگ نے کئی بہت اعلا فوجی افسروں کی ملازمت ماہ اپریل اور مئی میں ختم کر دی تھی-اس رائے کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ ۷۰ویں یوم ولادت پر صدر کم ال سنگ نے جو تقریر کی اس کے اسٹیج پر میں نے کم از کم دو نشستیں خالی پائیں -یہ خلا یقینی طور پر اس فوجی کنٹرمیونٹ کا نتیجہ ہو سکتا ہے - یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تقریباً ایک درجن فوجی جونلوں کو ان کے گھروں میں نظر بند کر کے رکھا گیا ہے یا کم تر ملازمت پر ان کا تنزل کر دیا گیا ہے - میں نے دیکھا ہے کہ پیونگ یانگ میں واقع بیرونی ممالک کے سفارتخانوں کے باہر زبردست پہرہ چوکی کا انتظام کر دیا گیا ہے-

مسائل : حد درجہ زود حس ، جذباتی اور کسی حد تک غصے میں بے قابو ہو جانے کی عادت سے مجبور ، جونیر کم (کم جونگ -ال) کو اپنی گزشتہ دس سال کی سیاسی زندگی میں بارہا متعدد مسائل و مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑا ہے -سیاسی میدان میں اگرچہ کم جونیر (کم جونگ -ال) اپنے والد کی حکمران پارٹی میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں ، یعنی سکریٹریٹ میں ان کو اپنے والد کے بعد دوسرے ہی درجے میں شمار کرایا جاتا ہے ، اور فوجی معاملات سے متعلق کمیٹی میں وہ تیسرے نمبر پر فائز ہیں اور پالٹ بیورو کی مجلس قائمہ میں وہ چوتھے نمبر پر ہیں- بہ ایں ہمہ ابھی تک انہیں

کسی سرکاری عہدے پر مامور نہیں کیا گیا ہے۔ اس سال اپریل میں منعقد ہونے والی پارٹی کنگرس میں توقع تھی کہ تین نائب صدروں میں سے ایک انہیں بھی بنا دیا جائے گا لیکن اس عنوان دعوت نامے جاری کیے جانے کے باوجود شاید فوج کے شعبے سے مخالفت کی بنا پر ایسا نہ ہوسکا۔

ماسکو اور پیکنگ (بے جنگ) میں کم ال سنگ کے دوستوں کے حلقے میں بھی کم جونگ۔ال کو مقبولیت حاصل نہیں۔ ابھی جب صدر کم ال سنگ نے اپنی سترویں سالگرہ کی تقریب منانے کے سلسلے میں دنیا بھر کے لیڈروں کو مدعو کیا ـــــ جس کا من جملہ مقاصد دیگر ایک مقصد اپنے بیٹے کو بھی روشنی میں لانا تھا ـــــ تو سویٹ روس اور جمہوریہ چین نے اپنے وفود میں ایسے لوگ شامل کیے جو اہم حیثیت کے نہ تھے اور ان کا کوئی ذکر بھی نہیں ہوا۔ پیکنگ میں تو ایک مغربی ملک کے سیاسی مدبّر نے یہ کہا ہے کہ " ماؤ زی تنگ کے انتقال کے بعد سے چینیوں نے شخصیت پرستی کا رجحان ختم کر دیا ہے "۔ اسی طرح ماسکو سے بھی یہ اطلاع ملی ہے کہ " نظریاتی طور پر روسی لوگوں کو اس بات سے نفرت ہے کہ کسی کمیونسٹ ملک میں کوئی ایسی تجویز زیر غور ہو جس میں بادشاہت کی ذرا بھی بو باس ہو "۔ جاپان میں مقیم ایک سیاسی تجزیہ نگار کا کہنا ہے کہ "روسیوں نے کبھی کسی سیاسی تقریب میں کم جونگ۔ال کے لیے جام صحت تجویز نہیں کیا "۔

مجھے خیال ہوتا ہے کہ چونکہ جمہوریۂ چین کی طرف سے اب روز افزوں ہمت افزائی و ہمدردی کا اظہار ہو رہا ہے لہذا شمالی کوریا کے صدر کم ال سنگ کوشش کر رہے ہیں کہ اس سال وہ پیکنگ کا ایک دورہ کریں تاکہ وہاں زیادہ امداد اور بہتر اسلحہ کی فراہمی کے لیے اصرار کیا جا سکے ـــــ اور لگے ہاتھوں کم جونگ۔ال کی ولیعہدی کی سرکاری طور پر جمہوریہ چین سے توثیق بھی کرا لی جائے۔ خیر سگالی کے طور پر حال ہی میں شمالی کوریا کی حکومت نے جمہوریۂ چین کو ایک ایسی بندرگاہ میں آنے جانے کی زیادہ سہولت دینے کی پیش کش بھی کی ہے جو جمہوریۂ روس کی سرحد کے قریب واقع ہے اور برآمدات باہر بھیجنے کے لیے مفید جگہ کہی

جاتی ہے۔ یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ صدر کم ال سنگ کو جمہوریۂ چین کے وزیر دفاع جینگ بیاؤ کی اس بات سے بڑی تقویت پہنچی ہوگی جو انھوں نے اپنے دورۂ پیونگ یانگ کے موقع پر کہی تھی کہ جمہوریۂ چین " ہمیشہ کی طرح کوریا کے عوام اور فوج کے ساتھ ہم خیال و متحد ہے اور دونوں ایک ہی کشتی میں سوار، زندگی اور موت دونوں صورتوں میں ایک دوسرے کے ساتھی ہیں "۔ کم ال سنگ کے فرزند کے معاملے میں جمہوریۂ چین نے بہت محتاط طرز عمل اختیار کر رکھا ہے، تاہم یقین ہے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ صدر کم ال سنگ کی اس خواہش پر چین کا رد عمل کیا ہوگا۔ لیکن چین کو جن سہولتوں اور اس کے معاوضے اور رعایتوں کی ضرورت ہے کیا ان کے لیے چین ولی عہدی کو قبول کر لے گا؟

دل بدست آور۔۔۔۔

شمالی کوریا کے دارالحکومت پیونگ یانگ میں میرے قیام کے دس[۱۰] دن نتیجہ خیز رہے۔ اپنے مطالعے کے دوران میں نے ایک وہ فلم دیکھی کہ جو پیونگ یانگ کی تباہئ کامل کا نقشہ کھینچ دیتی ہے۔ جاپان کے پے بہ پے حملوں کے بعد تباہی میں جو کسر رہ گئی تھی وہ امریکی بم باری سے پوری ہوگئی۔ جذبات سے مغلوب ہو کر ایک اخبار نویس مجھے بتا رہا تھا کہ امریکی بموں کی تعداد اتنی ہی تھی کہ جتنی اس وقت پیونگ یانگ کی آبادی تھی۔ ہزارہا بم تو ایسے تھے کہ پھٹے نہیں۔ اندھا دھند بم باری میں ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ میں ہمہ وقت اس پر غور کرتا رہا کہ جس ملک اور جس شہر پر تباہ کاریوں کا یہ انداز ہو کہ واقعتہً اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی اس کی از سرِ نو تعمیر کے لیے جذبۂ صادق و کامل کیا شان رکھتا ہوگا، اور اس قیادت کا کیا مقام ہوگا کہ جس نے ایک تباہ حال قوم کو آمادۂ تعمیر کر دیا۔ دو بڑی طاقتوں کی شدید غلامی سے رہائی اور اس رہائی کے بعد ملک و ملت کی تعمیر نو ناقابلِ شکست عزم کی مظہر ہے۔ گریٹ لیڈر مارشل کم ال سنگ کے اندازِ فکر کا مجھے صحیح اندازہ نہ صرف ان کی تحریرات کے مطالعہ سے ہوا، بلکہ میں نے جب خود ان کو

سامنے بیٹھ کر سنا تو ان کے فکر کی گہرائیوں تک جانے کا مجھے موقع ملا۔ ان سے " شیک ہینڈ " میں بھی میں نے ان کے عزمِ جواں کی گرمی اور ان کی قوتِ عمل کی برقی رو محسوس کی۔ ایسی برقی رو کہ جو صرف دیانت دار و جری انسان کے جسم سے خارج ہو سکتی ہے اور بے ایمان، منافق، اور لالچی انسان اس سے قطعی محروم ہوا کرتے ہیں۔ کم ال سنگ اور ان کی قوم جنوبی کوریا اور شمالی کوریا کے ادغام اور انضمام پر شد ومد کے ساتھ مُصر ہے۔ اس ادغام اور انضمام کے لیے ایک شدید جنگ شاید ناگزیر ہے اور اس جنگ میں مدِ مقابل امریکا ہوگا کہ جس کے زیرنگیں جنوبی کوریا ہے۔ یہ جنگ پھر ایک تباہی کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے اور پیونگ یانگ ایک بار پھر تباہ ہو سکتا ہے۔ امریکی ایٹمی تنصیبات پیونگ یانگ کی زندگی کو خاموش کر سکتی ہیں۔ بہ ایں ہمہ سلسلۂ تعمیر جاری ہے اور عظمتِ قوم اور رفعتِ وطن کا سامان سرعت و شدت کے ساتھ جاری ہے۔

"ـــــ یہ جاننے کے باوجود کہ ممکنہ جنگ تباہی لا سکتی ہے ہر شعبۂ زندگی میں رفتارِ پیش رفت میں کوئی تعطل نہیں ہے، آخر اس کا خوف دلوں میں آپ کے کیوں نہیں ہے؟ ـــــ" میں نے یہ سُوال کئی جگہ کیا اور جان بوجھ کر بار بار اسے دہرایا۔ مگر مجھے جواب ہر جگہ اور ہر سطح پر ایک ہی ملا: "ـــــ ہماری لغت میں خوف کا کوئی لفظ موجود نہیں ہے۔ ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ہم کوریا کو عظیم بنائیں گے اور کوریا کے لوگوں کو ہر عظمت دیں گے۔ ہم یقین رکھتے ہیں کہ گریٹ لیڈر ہماری رہنمائی میں غلطی نہیں کرے گا اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ دیانت دار ہے اور وہ مخلص ہے۔ ہم اس کے ساتھ تعمیر میں مصروف ہیں اور اس مصروفیت کو فرض جانتے ہیں کہ ہمارے بعد آنے والی نسل آزاد ہو اور ہم سے عظیم تر ہو ـــــ" ان جذباتِ عالیہ سے میں نے کوریا کے ہر انسان کو سرشار پایا جس سے میں ملا۔ انقلاب کے بعد گریٹ لیڈر نے اولین توجہ انقلابِ تعلیمی پر صَرف کی اور اپنے نظریۂ حیاتِ ملی کی روشنی میں تعلیم کے نظام کو صورتِ نو دے دی اور تعلیم کو لازمی قرار دے دیا۔ اس تعلیمی انقلاب کا ہی یہ ثمر و مظہر ہے کہ آج شمالی کوریا میں ہر جوان عزمِ جواں کا حامل ہے اور فکر و عمل کی یکسانیت و تسلسل

نے اس ملک و ملّت کو زندہ کر دیا ہے ۔ یہ کم ال سنگ بیان باز نہیں ہے، وہ عمل مجسم ہے ۔ وہ نظریۂ حیات کا سوداگر نہیں ہے، بلکہ نظریۂ حیات پر یقینِ کامل رکھتا ہے اور اپنے ساتھ ہر روح کو اس نظریے سے سرشار کر دینا چاہتا ہے ۔ اس کے منصوبے اس لیے بنتے ہیں کہ ان پر عمل کیا جائے ۔ داخلِ دفتر کیے جانے کا وہاں کوئی تصور موجود نہیں ہے ۔ کم ال سنگ کی زندگی خودی سے عبارت ہے ۔ اس خودی کو اس نے جُوچے کا لفظ دیا ہے اور اس جوچے سے قوم کے ہر فرد کو اس نے آگاہ و سرشار کر دیا ہے ۔ اس خودی نے خوداعتمادی سے اس قوم کو رنگ دیا ہے اور قوم نے خود کفالتی کا مفہوم سمجھ لیا ہے ۔ اس فہم و ادراک نے شمالی کوریا کے ہاتھ سے کاسۂ گدائی لے کر پھینک دیا ہے اور شمالی کوریا کی تعمیرِ نو اس کے اپنے ذرائع اور ذخائر سے ہوئی ہے ۔

شمالی کوریا کے عوام جانتے ہیں کہ ان کا گریٹ لیڈر دیانت دار ہے اس لیے ناقابلِ شکست ہے ۔ شمالی کوریا کی تعمیرِ نو میں کم ال سنگ نے کس طرح حصہ لیا ہے اس کو دیکھنے اور سمجھنے کے لیے چند لوگوں کے تاثرات بڑی اہمیت رکھتے ہیں ۔ میں نے ان تاثرات کو اہمیت کے ساتھ نوٹ کیا ہے، اور میں ان تاثرات کو یہاں لکھتا ہوں ۔

کارکنان کی صحّت

کم ہنگ ال

میں ۳ ؍ دسمبر ۱۹۴۷ء کے یادگار دن کو کبھی نہیں بھولوں گا ۔ اس دن کامریڈ کم ال سنگ نے ہوانگ ہائے آئرن ورکس کا دورہ کیا تھا ۔ ہُوا یہ تھا کہ جنگ کے دوران جاپانیوں نے ہماری صنعت کی شہ رگ کاٹ ڈالنے کے لیے ہوانگ ہائے اور کم چائیک آئرن ورکس کو تباہ و برباد کر دیا ۔ ان کا خیال تھا کہ کم از کم دس برس تک یہ کارخانے بحال نہ ہو سکیں گے، لیکن ہم نے دو ہی برس میں ان کو دوبارہ تعمیر کر دیا ۔ چنانچہ ۳ ؍ دسمبر اس آئرن ورکس کی رسم افتتاح کا دن تھا ۔ ہزاروں کارکن کامریڈ کم ال سنگ کو خوش آمدید کہنے کے لیے جمع ہوئے تھے ۔

اس دن میں دوسرے کارکنوں کے ساتھ ان کا استقبال نہیں کر سکتا تھا کیوں کہ مجھے ہی بھٹی میں لوہا پگھلانے اور اس کی ڈھلائی کا مظاہرہ کرنا تھا۔ کامریڈ کم ال سنگ آئے، لوگوں نے ان کا پرتپاک استقبال کیا۔ وہ مظاہرے کے مقام کے قریب ریتلی زمین پر کھڑے ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں میں نے بھٹی سے پگھلے ہوئے لوہے کو انڈیلا۔ ہمارے لیڈر نے مسکراتے ہوئے تالی بجائی اور لوگوں کے نعروں سے ساری فضا گونج اٹھی۔ کامریڈ میرے آدمیوں کے کام کو بغور دیکھتے رہے۔ پھر ہم نے بھٹی بند کی۔ پگھلے ہوئے لوہے کے شعلے سود پڑنے لگے۔ بھٹی کو ہم مٹی سے بند کرتے تھے۔ اس لیے ہمارے ہاتھ مٹی سے لت پت ہو گئے۔

میرا خیال تھا کہ کامریڈ کم ال سنگ سے بالمشافہ ملاقات نہ ہو سکے گی لیکن ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہمارے پاس آگئے۔ ہمارے ہاتھ مٹی سے لتھڑے تھے، لیکن انھوں نے ہم سے ہاتھ ملائے، شاباش دی اور کہا: تم اس بھٹی کے بھی مالک ہو اور اس ملک کے بھی مالک ہو۔ ہمارے ہاں کُل پانچ بھٹیاں ہیں۔ مجھے امید ہے کہ باقی چار کو بھی تم جلد ہی بحال کر دو گے، کیوں کہ تمھیں اب خاصا تجربہ حاصل ہو چکا ہے۔

چند ماہ پہلے انھوں نے ہمیں صاف کیا ہوا چاول بھجوایا تھا۔ انھوں نے ہم میں سے ہر ایک سے ہماری غذا اور چاول کے بارے میں کئی سوالات کیے۔ اگرچہ ہم ہچکچا رہے تھے لیکن انھوں نے حوصلہ افزائی کر کے ہمارے حالات سے پوری واقفیت حاصل کی اور اس واقعے کے بعد بہتر تغذیے کے لیے زائد راشن بھجوایا۔ کامریڈ کم ال سنگ نے پوچھا کیا بھٹی کے کام میں مٹی کا استعمال ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے؟ ہم نے جواب دیا کہ ہاں۔

انھوں نے پھر مجھے پاس بلایا۔ میرے ہاتھ دیکھے تو جگہ جگہ سے جلے ہوئے تھے۔ پھر انھوں نے میری پیٹھ دیکھی۔ میری گردن پر انھیں ایک بڑا داغ نظر آیا۔ اس وقت مجھے جاپانیوں کی قید میں گزارے ہوئے وہ دن یاد آئے جب وہ مجھے مار مار کر ادھ مؤا کر دیتے تھے۔ بھٹی پر زبردستی کام کراتے، جانوروں کا سا سلوک

کرتے تھے۔

میں ایک غریب کارکن کا لڑکا ہوں ۔ سولہ برس کی عمر سے بھٹی کا کام کر رہا ہوں ۔برسوں ایک سرد کوٹھڑی میں ٹھٹھر ٹھٹھر کر زندگی بسر کرتا رہا۔ کامریڈ کم ال سنگ نے جب کہا کہ تم بہادر آہنی ہو تو میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں ۔ انھوں نے کہا کہ اب ہم بھٹی کے کام کو مشینی بنائیں گے۔

جنگ کے بعد میں کم چائیک آئرن ورکس کی دوبارہ تعمیر میں مصروف ہو گیا۔ ۱۹۵۹ء کے موسم بہار میں کامریڈ کم ال سنگ پھر ہمارے ہاں آئے۔انھوں نے مجھے اپنے پاس بیٹھنے کا اعزاز بخشا اور مجھ سے میرے بال بچوں کے بارے میں کئی باتیں پوچھیں۔ میں نے ساری باتیں بے کم و کاست اس طرح کہہ سنائیں جیسے کوئی اپنے والدین سے بیان کرتا ہے۔انھوں نے میرے بچوں کی پڑھائی کے بارے میں استفسار کیا اور کہا مجھے امید ہے کہ تم خود بچوں کو ایک اعلا شاگرد ہونے کا نمونہ دو گے۔ باتوں باتوں میں وہ کہنے لگے کہ تم کمزور نظر آ رہے ہو۔ میں نے ٹالنا چاہا لیکن انھوں نے کہا کہ تمہاری صورت صاف بتا رہی ہے کہ تھکن کی شکایت ہے ۔ چنانچہ انھوں نے میرے آرام کے لیے چو اول سنٹر میں بندوبست کر دیا۔

ایک بار ۱۹۵۸ء میں سالِ نو کی تقریب میں بھی انھوں نے مجھے شرفِ ملاقات بخشا اور اپنے ہاتھوں سے میرے گلاس میں مشروب ڈال کر میری عزت افزائی کی ۔ غالباً کامریڈ کم ال سنگ کی یہی وہ صفات ہیں جن کی وجہ سے ہم انھیں اپنے شفیق باپ کے برابر سمجھتے ہیں ۔

پَو پھٹتے ہی وہ بندرگاہ میں موجود تھے!

چوگن ھو

۱۱ر جون ۱۹۵۷ء کی ایک سرد فجر کو کہ جب اندھیرا چھایا تھا، بحری مرغابیاں اپنے گھونسلوں سے نہیں نکلی تھیں،ہر طرف خاموشی طاری تھی ، اگرچہ جون کا مہینہ تھا لیکن سخت سردی تھی ، اس وقت میں اٹھا اور کام میں لگ گیا۔ ہمارا کام ماہی گیری تھا۔ کچھ

لوگ گزشتہ روز کی پکڑی ہوئی مچھلیوں کو کشتی سے اُتار رہے تھے، کچھ جالوں کی مرمت کی تیاری کر رہے تھے۔ کہر چھائی ہوئی تھی اور چیزیں صاف صاف نظر نہیں آ رہی تھیں۔

اتنے میں مجھے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ قدم میری طرف بڑھ رہے تھے۔ لیکن اتنے سویرے آخر کون شخص یہاں آئے گا؟ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ آواز آئی: یہ کشتی کس کی ہے؟ میں ایک اکھڑ سا ملاح تھا۔ میرے دل میں خیال آیا کہ یہ کون ہے جو بے جا مداخلت کر رہا ہے۔ اس نے پھر پوچھا: یہ کشتی کس کی ہے؟ میں نے بے پروائی سے جواب دیا: ماہی گیری کے اسٹیشن کی ہے۔ کیا خاصی مچھلیاں ہاتھ آئیں؟ میں نے کہا: ماہی گیر کی خواہش تو یہی ہوتی ہے کہ بہت زیادہ شکار کرے، لیکن ہمارے کام میں فی الحال ربط ضبط نہیں۔ اس شخص نے کہا: کیا وجہ ہے؟ میں نے کہا: کام میں سلیقہ نہیں۔ اگرچہ ہم اپنے لیڈر کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے زیادہ مچھلیاں پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن اس کا فائدہ کیا؟ یہاں کشتی خالی کرنے کا بندوبست تک نہیں۔ اس نے کہا: مچھلیاں کون اتارتا ہے؟ میں نے جواب دیا کہ اتارتے تو ہمارے ساتھی ہیں لیکن سُستی ہو ہی جاتی ہے۔ اس نے پوچھا، تم کون کون سی مچھلیاں پکڑتے ہو؟ میں نے بتایا کہ ہم رونکا دور اور جھینگے پکڑتے ہیں۔

جب تک یہ گفتگو ہوتی رہی مجھے کوئی علم نہیں تھا کہ یہ شخص کون ہے۔ اب جو وہ قریب آیا تو میرے ایک ساتھی نے مجھے کہنی ماری کہ ہوشیار ہو جاؤ۔ میں نے دیکھا تو وہ ہمارا لیڈر کم ال سنگ تھا۔ میرے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ آ سکتی تھی کہ اتنے تڑکے اس بندرگاہ میں کامریڈ کم ال سنگ کبھی آئے گا۔ میں ہکا بکا رہ گیا! گویا منھ میں زبان نہیں۔ اپنے اکھڑپن پر پشیمان ہوتا رہا۔ انھوں نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ میرے مشقت والے کام کی تعریف کی اور میری یہ حالت تھی کہ آنکھوں سے آنسو اب ٹپکے کہ جب ٹپکے۔

میں تیرہ برس کی عمر سے اس کام میں لگا ہوا ہوں لیکن تیس سال کی اس محنت مشقت میں مجھے کبھی اس قدر شفقت نہیں ملی

جیسی کہ اس دن ملی تھی۔ پھر مجھے جاپانیوں کی قید کا زمانہ یاد آیا۔ ایک بحری جہاز کا جاپانی مالک چپت مار مار کر میرا منھ لال کر دیتا تھا، مجھے ٹھوکریں مارتا اور میرے کندھوں پر اتنا بوجھ اٹھواتا کہ میں سہار نہیں سکتا تھا۔

اس کے بعد کامریڈ کم ال سنگ کو میں نے اپنے کام کی تفصیلات بتائیں۔ انھوں نے میرے گھر، میرے بیوی بچوں، ان کی تعلیم کے بارے میں سوالات کیے۔ میرے ماہی گیری کے کپڑے دیکھے۔ میرا اوور کوٹ مچھلیوں کی غلاظت اور فلوس سے اٹا ہوا اور نہایت بدبودار تھا۔ انھوں نے وہ پہن کر دیکھا کہ کس طرح اس کو مزید بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ پھر وہ میرے کمرے میں گئے۔ جس گدے پر میں سوتا تھا وہ دیکھا اور کہا اس میں بھرائی کم ہے۔ انھوں نے مچھلیاں منگوا کر دیکھیں۔ میں نے انھیں بتایا کہ یہاں نمک کی کمی کی وجہ سے مچھلیاں خراب ہو جاتی ہیں تو انھوں نے میری بات کو غور سے سنا۔

میری تنخواہ کی بابت پوچھا۔ میں نے بتایا کہ ابھی تک تنخواہ نہیں ملی کیونکہ پورے اسٹیشن نے اپنے کام کا کوٹا مکمل نہیں کیا۔ انھوں نے کہا: یہ بڑی غلط بات ہے۔ میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو کوسا کہ ایسی بات منھ سے نہیں نکلنی چاہیے تھی۔ میرے بال بڑھے ہوئے تھے۔ کپڑے گندے تھے۔ میں نے پہلے ہی سے خود بخود معذرت کی کہ دو ماہ سمندر میں رہ کر آیا ہوں۔ آئندہ خیال رکھوں گا۔ انھوں نے جیکٹ دیکھا اور کہا کہ ٹھیک سے نہیں بنا ہے۔ اب وہ ہمارے باورچی خانے کی طرف متوجہ ہوئے۔ ناشتہ تیار ہو رہا تھا۔ انھوں نے آگ پر دھری ہوئیں دیگچیوں کو ایک ایک کر کے دیکھا۔ غرض ہمارے کام، ہماری سکونت، ہماری غذا، ہماری صحت سب مسائل سے واقفیت پا کر ہم سے ہاتھ ملا کر وہ ہم سے جدا ہوئے اور بعد میں ان تمام کوتاہیوں کی اصلاح کی تدابیر کیں۔

اب وہی ماہی گیری کا کام ہے لیکن اس میں ایک عظیم انقلاب آ چکا ہے۔ جب ایک لیڈر ہماری اتنی خبرگیری کرتا ہے تو ہماری بڑی حوصلہ افزائی ہوئی۔ ہم اور محنت کرنے لگے۔ پیداوار دگنی ہوگئی۔

میں نے شراب چھوڑ دی ۔ایک بار اکتوبر ۱۹۶۰ء میں وہ پھر اس بندرگاہ میں آئے۔میں مچھلی کے شکار کو گیا ہوا تھا۔انہوں نے خاص طور پر میرا احوال پوچھا اور ان لوگوں سے کہہ گئے کہ وہ ان کا سلام مجھ تک پہنچا دیں۔یہ بات سن کر میری آنکھوں میں فرط مسرت سے آنسو آ گئے ۔

میں نے جس عظیم انقلاب کا ذکر کیا ہے سو وہ انقلاب یہ ہے کہ اب ہماری کشتیوں میں موٹر لگے ہوئے ہیں۔اب بوجھ لادنے اور اتارنے کا کام مشینوں کی مدد سے ہوتا ہے۔ماہی گیری بیڑے کے ساتھ ایک کشتی خدمات فراہم کرنے کی ہوتی ہے۔ہم بال کٹواتے ہیں۔فلمیں دیکھتے ہیں۔ریڈیو سے موسم کی رپورٹیں سنتے ہیں۔عورتوں کا الگ ایک جہاز ہے جو ہمارے بیڑے کے ساتھ رہتا ہے۔وہ بھی اپنا کام کرتی ہیں ۔ماہی گیروں کا سماجی درجہ بلند ہو گیا ہے اور اب وہ خوشی خوشی کام کرتے ہیں۔ہماری صحت کا ہر طرح سے خیال رکھا جاتا ہے۔

ہم اپنے لیڈر کے ان احسانات کے بدلے ہمیشہ زیادہ سے زیادہ مچھلیاں پکڑ کر قومی پیداوار میں اضافہ کریں گے۔پانچ سالہ منصوبے کے آخر میں ہمارا سالانہ شکار چھے لاکھ ٹن کے برابر ہوگا ،جس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہر شہری کو سال میں ۶۰ کیلو گرام مچھلی فراہم ہوگی۔

جیسے مجھے باپ نے اپنے سینے سے چمٹا لیا ہو

ہونام انگ

یہ ۱۹۵۵ء کا واقعہ ہے۔میں یاکسو مڈل اسکول چانگ سونگ کاؤنٹی کی پرائمری کلاسوں میں پڑھ رہا تھا۔گرمیوں کے دن تھے۔ ایک دن اسکول سے چھٹی ہوئی تو ہم گانا گاتے واپس اپنے گھر کو رواں تھے۔ پہاڑ کا ایک موڑ کاٹا ہی تھا کہ پُل کے دوسری طرف ایک شخص خاکستری رنگ کا سُوٹ پہنے لوگوں سے باتیں کرتا نظر آیا۔ ہم نے یہ پہچان لیا کہ ہو نہ ہو یہی مارشل کم ال سنگ ہے،کیوں کہ وہ اکثر اسکول میں آیا کرتے تھے۔ہم کو دیکھ کر انہوں نے ہمیں اشارے سے بلایا۔ہم بھاگ کر وہاں پہنچے اور لڑکوں کی کور کے

سیلوٹ کے مانند سیلوٹ کر کے کھڑے ہو گئے۔

"اچھا تو تم اسکول سے واپس آ رہے ہو۔ تمھیں اتنی دور اسکول آنے جانے میں بڑی تکلیف ہوتی ہوگی۔ کیا تم نے دوپہر کا کھانا کھایا ہے؟" انھوں نے ہم سے پوچھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے یہ بھی پوچھا کہ کیا کوئی اور لڑکے تم سے بھی زیادہ دور جاتے ہیں؟ کیا کوئی بچّے بیمار ہیں؟ پھر انھوں نے مجھے آگے بلایا۔ مجھے دیکھ کر ان کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ میں ننگے پاؤں تھا کیوں کہ میرے پاس جوتے نہیں تھے۔ مجھے اس بات پر سخت شرم آ رہی تھی۔ انھوں نے پوچھا: تمھارے خاندان میں کون کون لوگ ہیں؟ میں نے بتایا کہ میری دادی، میری ماں اور چھوٹے بھائی ہیں۔ انھوں نے پوچھا: اور تمھارا باپ؟ میں خاموش ہو رہا۔ انھوں نے پھر اصرار کیا تو میں نے بتایا کہ وہ جنگ میں مارا گیا تھا۔ میری آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے اور میں سر نیچے کیے کھڑا رہا۔

مارشل نے مجھے اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ میرے سر کو آہستہ آہستہ تھپتھپایا اور کچھ دیر تک انھوں نے کوئی بات نہ کی۔ پھر میرے آنسو پونچھے اور اپنے آدمیوں سے کہا: میں نے تو اسے اب تک جوتے نہیں دیے لیکن یہ بچہ اب بھی کتنی عزت سے سیلوٹ کرتا ہے۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ مارشل آسمان کی طرف کیوں دیکھتا رہا۔ پھر اس نے دوسرے بچوں سے باتیں کیں اور ان کا حال پوچھا۔

پھر دوبارہ مجھ سے پیار کر کے کہا کہ میں نے تمھارے گھر بکریاں بھجوائی تھیں۔ میں نے بتایا کہ وہ ٹھیک ہیں۔ میں ہی انھیں گھاس پھوس کھلاتا ہوں۔ اس نے کہا یہ بڑی اچھی بات ہے کہ تم دادی اور اماں کی مدد کرتے ہو۔ بکریاں تمھیں دودھ دیں گی۔ ان کا خیال رکھو۔ اچھا جاؤ۔ میں تھوڑی دیر میں تمھارے گھر آؤں گا۔

ہم ایک نعرہ لگا کر روانہ ہوئے۔ ابھی راستے ہی میں تھے کہ چند کاریں ہمارے پاس سے گزریں۔ ایک کالی کار میرے پاس آ کر رک گئی۔ اس میں مارشل کم ال سنگ تھے۔ انھوں نے مجھے سوار

ہونے کو کہا۔ میں ہچکچا رہا تھا کیوں کہ میں ننگے پیر تھا اور میرے پیر مٹی سے اٹے ہوئے تھے۔ انھوں نے مجھے کھینچ کر ساتھ بیٹھا لیا۔ ہمارے گھر کے سامنے پہنچ کر کار کھڑی کی۔ میری دادی اور امی بھوسے وغیرہ کے گٹھے باندھ رہی تھیں۔ وہ مارشل کو دیکھ کر حیران ہو گئیں۔ میری دادی انھیں گھر کے اندر لے گئیں۔ اور ہم بھی اندر جا کر مؤدّب بیٹھ گئے۔

انھوں نے میری دادی سے پوچھا کہ آپ لوگوں کو گھر میں کیا کیا تکلیفیں ہیں؟ میری دادی ہچکچا رہی تھیں لیکن انھوں نے اصرار کیا۔ ہماری غذا، چاول، صحت سب کے بارے میں سوال کیے۔ پھر اپنے آدمی سے کہا کہ وہ ہم تین بھائیوں کو بازار لے جا کر ابھی ان کے جوتے خرید لائے۔ چنانچہ وہ ہمیں ہماری امی کے ساتھ مارکٹ لے گیا اور ہم جوتے پہن کر آ گئے۔ راستے میں ہماری امی نے ہم سب بھائیوں سے پوچھا کہ تم مارشل کا شکریہ کیسے ادا کرو گے؟ اتنے میں ہم گھر پہنچ گئے۔ مارشل میری دادی کے ساتھ صحن میں کھڑے تھے۔ میں نے انھیں سیلوٹ کیا لیکن میری زبان سے کوئی لفظ نہ نکل سکا اور میں مارشل سے لپٹ کر سسکیاں بھرنے لگا۔ انھوں نے پھر میری پیٹھ تھپتھپائی اور پھر کار میں بیٹھ کر واپس چلے گئے۔ میری ماں بھی بہت دیر تک روتی رہی۔

رات کے کھانے پر دادی نے وہ تمام باتیں سنائیں جو انھوں نے مارشل کم ال سنگ سے کیں۔ انھوں نے ان کے اس احسان پر کئی بار خوشی اور شکرانے کے آنسو بہائے۔ ایک بار پھر بوندا باندی ہو رہی تھی کہ مارشل ہمارے گھر شام کے وقت آئے۔ مجھے بلا کر پیار کیا۔ مجھ سے کہا: تم خوب پڑھو لکھو، تم ہی اس گھر کے مالک بنو گے اور تمھیں یہ سب کاروبار چلانا ہوگا۔ انھوں نے اسکول کی پڑھائی کا رکارڈ دیکھا اور کہا: تم نے بہت اچھے نمبر لیے ہیں۔ میں تمھیں مانگ یونگ دائے انقلابی اسکول میں داخل کراؤں گا۔ یہ وہ مقام تھا جہاں مارشل خود پیدا ہوئے تھے اور جہاں انھوں نے اپنا بچپن گزارا تھا۔ چنانچہ ان کا ایک افسر آیا اور اس نے مجھے اسکول میں داخل کرا دیا۔ اس کے بعد بھی وہ ہمارے گھر جا کر میرا حال پوچھتے رہتے تھے۔

۱۹۵۷ء میں بھی مارشل ہمارے گھر گئے اور میرے بھائیوں کی تعلیمی ترقی کا رکارڈ دیکھا۔ یہ ان کا تیسرا دورہ تھا۔ اس کے بعد پھر چوتھی بار وہ گئے۔ اس دفعہ انھوں نے ہمارے باورچی خانے میں جا کر ایک ایک برتن میں رکھا ہوا کھانا چیک کیا۔ آخر ۱۲/دسمبر ۱۹۵۸ء کا دن آ پہنچا۔ اس دن ہمارے اسکول میں مارشل کا دورہ تھا۔ لڑکوں نے صاف ستھری وردیاں پہن رکھی تھیں۔ اور اسکول کے صحن میں جمع تھے۔ اس دن میری ڈیوٹی لگی ہوئی تھی۔ مارشل نے وہاں پہنچتے ہی میرے متعلق پوچھا اور ایک آدمی کو دوڑایا کہ اسے بلا لاؤ۔ میں ان کے پاس پہنچا، سیلوٹ کیا لیکن زبان شدتِ جذبات سے سوکھ گئی۔ انھوں نے کہا: نام انگ تم تو اتنے بڑے ہو گئے ہو کہ پہچانے بھی نہیں جاتے۔ تم ایک بہترین بٹالین کمانڈر بنو گے۔ پھر انھوں نے اپنے اسٹاف کو میرے باپ کے بارے میں بتایا کہ وہ وولبی سان پہاڑ کی لڑائی میں بہادری سے لڑ کر مارا گیا تھا۔ میرا باپ سارجنٹ میجر تھا۔

اس کے بعد بھی کئی بار وہ ہمارے اسکول آتے رہے۔ ہر بار ہماری کلاسوں، رہنے کے کمروں، باورچی خانوں کا اچھی طرح معائنہ کرتے تھے۔ ان کی پدرانہ شفقت ہی کی وجہ سے ہم انھیں اپنا باپ کہتے ہیں۔

باپ کی سی شفقت

سم یوں گم

۲۹/اگست ۱۹۶۰ء کو ہمارے محبوب رہنما کامریڈ کم ال سنگ نے جنگ کے بعد آٹھویں بار ہنگ نام فرٹلائزر فیکٹری کا معائنہ کیا۔ ورک شاپوں کے معائنے سے پہلے انھوں نے کارکنوں کی سکونت کے مکانات اور کھانے کا کمرہ دیکھا۔ میں باورچی خانے میں کام کرتی تھی اور دوڑ کر دروازے پر پہنچی۔ میں نے انھیں خوش آمدید کہا اور پھر کھانے کے کمرے میں ان کے ساتھ داخل ہوئی۔ یہاں ایک ہزار کارکن کھاتے تھے۔ نئے شادی شدہ ۳۵ جوڑے رہتے بھی یہیں تھے۔

اس کمرے میں دو نوجوان کھانا کھا رہے تھے۔ کامریڈ ان کے

پاس گئیے۔ وہ تعظیم کے لیے اٹھے لیکن کامریڈ نے انھیں کہا: آپ کھانا کھائیں، کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا۔ پھر انھوں نے ان سے کھانے کے بارے میں کئی سوالات پوچھے۔ اس سے پہلے بھی ۱۹۵۷ء میں وہ یہاں آ چکے تھے۔

انھوں نے پکے ہوئے کھانے کا بھی معائنہ کیا اور کہا کہ زیادہ سے زیادہ تنوع پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ انھوں نے چند نئے کھانے تجویز کیے اور سبزی کی ڈش دیکھ کر کہا کہ سبزی میں تیل کم معلوم ہوتا ہے۔ پھر انھوں نے باورچی خانے کے سازوسامان پر نظر ڈالی اور اس کے بارے میں کئی اصلاحات تجویز کیں۔

اس کے بعد میں نے سمجھا کہ اب وہ واپس چلے جائیں گے لیکن انھوں نے کہا کہ میں لوگوں کے رہنے کے کمرے اور ان کی سہولیات بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔ ایک کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا اور اجازت ملنے پر اندر گئیے۔ میاں بیوی اندر بیٹھے تھے۔ مارشل جوتے اتار کر اندر گئیے۔ ان کے سونے کے گدے دیکھے۔ جو کتاب وہ پڑھ رہے تھے اس کو دیکھا۔ کھانے کے بارے میں پھر سوال کیے۔ کپڑوں کی دھلائی کے بارے میں پوچھا اور انھیں مشورہ دیا کہ مزید تعلیم حاصل کرو، پیسے بچاؤ اور اپنی زندگی کو بہتر بناؤ۔

اس کے بعد انھیں یہ خیال آیا کہ مکان نیا بنا ہے۔ سردیوں میں سرد ہوگا۔ فیکٹری کے منیجر کو ہدایت کی کہ ابھی سے اسے گرم رکھنے کا انتظام کر دینا چاہیئے۔ جاتے وقت انھوں نے مجھ سے کہا: "مجھے توقع ہے تم لوگوں کی خوب خدمت کرو گی۔ کھانے کے کمرے کو صاف رکھو گی اور اچھا کھانا کھلاؤ گی۔"

جس فکرمندی سے اور جس شفقت سے انھوں نے ہمارے کام کو بہتر بنانے کو کہا اس سے ہماری بڑی حوصلہ افزائی ہوئی۔ پھر تو ہمارے کام کی حالت یہ تھی کہ ہم بیماروں کی تیمارداری کرنے لگے۔ جو کارکن دیر تک کام میں لگے رہتے ان کا کھانا ان کے کام کی جگہ تک پہنچایا جاتا۔ ہماری اس دیکھ بھال کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ ہمیں "ہماری مائیں" کہنے لگے۔

ہمیشہ روشن پہلو دیکھیے

کم یونگ چی

میں جب تک زندہ رہوں گا میرے لیے ۷ مئی ۱۹۵۸ء کا واقعہ ہمیشہ یاد گار رہے گا۔ بڑا پُر فضا دن تھا۔ میں گاؤں کے پیچھے ایک پہاڑی پر کھڑا بھیڑیں چرا رہا تھا۔ دل میں بڑا اضطراب تھا کیوں کہ اس دن ہم معذور سپاہیوں کے سنٹر میں مارشل کم ال سنگ کا دورہ تھا۔ مجھے اضطراب اس لیے تھا کہ میں تو انھیں ملنے جا نہ سکوں گا۔ کیوں کہ یہاں کام میں لگا ہوں، لہذا میں نے ایک ایسی جگہ چن لی جہاں سے ان کا دُور سے نظارہ کر سکوں۔ لیکن ایک آدمی آیا اور وہ مجھے بھی بلا کر لے گیا۔

معذور سپاہیوں میں اس دن بڑا جوش و خروش تھا۔ کئی بیساکھیوں کے سہارے گھروں کو جا رہے تھے کہ اچھے اچھے کپڑے پہن آئیں، بعض وہیں کھڑے تھے۔ اتنے میں دور سڑک پر ایک کار نظر آئی۔ ہمارا لیڈر باہر آیا۔ ہنستے مسکراتے چہرے سے وہ لوگوں کے خوش آمدید کا جواب دینے لگا۔ پہلی قطار والوں سے ہاتھ ملا رہا تھا۔ اب میری باری تھی۔ میں بڑا پریشان تھا کیوں کہ میرا ہاتھ مصنوعی تھا صرف ایک نہیں بلکہ دونوں ہاتھ۔ انھوں نے میری ہچکچاہٹ کو بھانپ لیا۔ میرے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر پوچھا: کس گاؤں کے ہو؟ میں نے بتایا۔ انھوں نے میری یونٹ اور اس جنگ کے بارے میں پوچھا جہاں میں زخمی ہوا تھا۔ میں نے تفصیل بتائی۔ انھوں نے پوچھا: کیا شادی کی ہے؟ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ پھر مجھ سے پوچھا کہ کھانا کیسے کھاتے ہو؟ کپڑے کیسے پہنتے ہو؟ میں نے انھیں بتایا کہ میری بیوی میری مدد کرتی ہے۔

جب انھوں نے کہا کہ کیا تم لکھ بھی لیتے ہو تو میں نے کہا: ہے تو مشکل لیکن میں لکھ سکتا ہوں۔ اس پر انھوں نے جھٹ اپنا فونٹین پن نکال کر میرے مصنوعی ہاتھوں میں تھما دیا۔ میں نے بہت کوشش کی لیکن پن کو نہ پکڑ سکا۔ جذبات کا طوفان امڈ آیا اور آنسو میرے رخساروں پر سے ڈھلکنے لگے۔

بات یہ تھی کہ میری بیوی کو بھی میری اس بے بسی کا خیال نہیں

آیا تھا جو روزانہ میرا منھ دھلاتی اور کپڑے پہناتی تھی۔ اب مارشل کی اس بات سے میں زار و قطار رونے لگ گیا۔ مارشل کم ال سنگ کے چہرے پر اداسی چھا گئی۔ ایسے لگتا تھا کہ وہ میرے والدین سے بھی زیادہ میری بے بسی کو محسوس کر رہے ہیں۔

اس وقت کچھ اور معذور ساتھی اپنے اپنے کام سے وہاں آئے لیکن جھجھک کے مارے دُور کھڑے ہو گئے۔ ہمارے لیڈر نے انہیں اپنے پاس بلایا اور پھر ہم سب کو ایک کھلے صحن میں لے گئے۔ کچھ لوگ اندر سے کرسیاں لائے لیکن مارشل کرسی پر نہیں بیٹھے اور ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔ پھر انھوں نے کہا: ایک فوٹو ہو جائے تو اچھا ہے۔ اس کے بعد مجھ سے پوچھا کیا تمہارے گھر والے اب آ چکے ہوں گے؟ میں نے بتایا کہ وہ آ چکے ہوں گے۔ ان کے اسٹاف میں ایک جرنیل بھی تھا جو خود معذور تھا۔ چنانچہ تمام معذور سپاہیوں کا فوٹو لیا گیا۔

پھر مارشل نے ہم سے ہماری تکالیف پوچھیں۔ ہم ہچکچاتے رہے۔ آخر باتوں باتوں میں لوگ مختلف تجاویز پیش کرنے لگے۔ کسی نے کہا یہاں پھلوں کے درخت لگانے چاہیئیں۔ مارشل نے تجویز مان لی۔ کسی نے کہا کہ کمرے گرم رکھنے کے لیے کوئلہ کم ملتا ہے۔ غرض کئی تجاویز پیش ہوئیں۔ لباس پر بھی غور ہوا۔

ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ مارشل کم ال سنگ نے کہا: دیکھیے آپ اتنا سخت کام نہ کیا کریں کہ تھک جائیں، یہ صحت کے لیے خراب ہے۔ صرف اتنا کام کرو کہ تمھیں بھوک لگ جائے۔ حکومت نے تم سے محنت نہیں کرانا چاہتی وہ تو تمھیں تمام آسائشیں مہیا کرے گی۔

یہ بات سُن کر میری آنکھوں میں پھر سے آنسو امڈ آئے۔ انھوں نے کہا کہ تمہاری بیویوں کو تمہاری مدد کرنی چاہیے تاکہ تمہارا معیارِ زندگی بلند ہو۔ انھوں نے مزید معذوروں کا حال احوال پوچھا۔ ایک شخص نے آرزو ظاہر کی کہ وہ سانگ ڈو کالج اوف پولیٹکل اکانومی میں پڑھنا چاہتا ہے۔ اس کے لیے مارشل نے انتظام کر دیا۔ پھر انھوں نے ہمیں نصیحت کی کہ تمھیں ہمیشہ زندگی کا روشن پہلو دیکھنا چاہیئے۔ کھیل اور تفریح میں حصہ لینا چاہیے۔ فلمیں دیکھنی

چاہئیں - ایک شخص نے بتایا کہ فلم دیکھنے کے لیے ہمارے آنے جانے کا بندوبست نہیں - انھوں نے اسی وقت حکم دیا کہ انھیں ایک نئی بس دی جائے - اس کے بعد انھوں نے وہاں ہمارے کلب کا معائنہ کیا اور اس کی توسیع اور نئی تفریحات کے انتظام کا حکم دیا۔

لیکن میں جو بات خاص طور پر بتانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ وہ پھر میرے گھر آئے - میری بیوی سے احوال پوچھا - وہ شرما اور جھجک رہی تھی - انھوں نے ہماری رضائیاں اور گدے دیکھے - کھانے کے بارے میں سوال کیے - ہماری مصروفیات کی تفصیلات پوچھیں - ہماری حوصلہ افزائی کرنے کے بعد وہ وہاں سے روانہ ہوئے۔

بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی - اس کے بعد انھوں نے پھر وہاں کی انتظامیہ سے پوچھا کہ وہ تمام انتظامات ہو رہے ہیں جن کے بارے میں وہ گزشتہ دنوں ہدایات دے گئے تھے۔

کچھ دن بعد جب وہ ریانگ گانگ صوبے کا معائنہ کر کے واپس جا رہے تھے تو دوسرے معذروں کے ساتھ میں بھی کلجو ریلوے اسٹیشن پر انھیں خدا حافظ کہنے گیا - ان کی اسپیشل ٹرین اسٹیشن پر آ کر رکی - اسٹیشن کھچا کھچ بھرا ہوا تھا - بڑا پر جوش خوش آمدید ہوا۔ انھوں نے پوچھا کہ معذوروں کے ادارے سے بھی یہاں کوئی ہے - انھیں بتایا گیا -

میں آگے بڑھا ، میں نے اپنے دو مصنوعی ہاتھوں سے قومی جھنڈا اٹھا رکھا تھا - انھوں نے میرے دونوں ہاتھوں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں دبا کر کہا : شاباش - اب آپ معذور بالکل نہیں لگتے - انھوں نے پوچھا کہ یہاں کیسے آئے ہو؟ میں نے بتایا کہ آپ نے جو بس عنایت کی تھی وہی ہمیں یہاں لائی ہے - وہ خوش ہوئے اور یہ تقریب ختم ہوئی - ان کی ٹرین اسٹیشن سے روانہ ہوئی۔

اس دن میں اور میری بیوی ساری رات شدت جذبات کی وجہ سے سو نہ سکے - تمام معذور ایک دوسرے کو اپنی اپنی باتیں سنانے لگے جو مارشل کم ال سنگ سے ہوئیں - مارشل کے حکم پر تمام بیویاں اپنے خاوندوں کے کام میں ان کی مدد کرنے لگیں - نتیجہ یہ نکلا کہ مقررہ

پید اوار سے زیادہ پید اوار ہوئی - دوسروں کی نظروں میں اور خود اپنی نظروں میں معذوروں کا وقار بلند ہوا -

ان کے ان دوروں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک نیا کلب بنایا گیا - نئے آرام دہ رہنے کے کمرے اور مکان تعمیر ہوئے - کامریڈ سونگ سک کو سونگ ڈو کالج اوف پولٹیکل اکانومی میں داخلہ مل گیا - ہماری روزمرہ زندگی میں مسرت کی بہار آئی - ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ کامریڈ کم ال سنگ کی محبت ، نگہداشت اور مسلسل دیکھ بھال کا نتیجہ ہے کہ آج ہم ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہے ہیں -

---

تاثرات

کوریائے شمالی کے بارے میں بات پوری نہ ہوگی اگر میں آخر میں بعض اہم امور پر تاثرات قلم بند نہ کروں کہ اس کے بغیر شمالی کوریا کو سمجھنا ممکن نہ ہوگا ، اور ایسا کیے بغیر دو نظریاتی مملکتوں (پاکستان اور شمالی کوریا) کا تقابلی مطالعہ مکمل نہیں ہو سکتا۔

نظریۂ تعلیم

۱۹۴۵ء میں آزادی کے وقت کوریا میں تناسبِ خواندگی کہا جاتا ہے کہ ۲۵ فیصد تھا۔ مجھے اس میں شبہ ہے، اس لیے کہ دورِ غلامی میں اور زمانۂ جنگ میں اور اس کے اثراتِ مابعد کی صورت میں خواندگی کا یہ تناسب صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن اس کی صحت میں مجھے کوئی شبہ نہیں ہے کہ اس وقت شمالی کوریا میں تناسب سو فیصد ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا اور قوم کو تاریکئ جہل میں رکھا جاتا تو شمالی کوریا میں وہ بیداری پیدا نہیں ہو سکتی تھی اور تعمیر کی ایسی شدید و سریع رفتار نہیں ہو سکتی تھی کہ جس کا ذکر اس کتاب میں ملتا ہے۔ ہم کو اس کا خیال کرنا چاہیے کہ تعلیم کا یہاں بنیادی مقصد نظریۂ حیات کا بدرجۂ کمال احیا و حفاظت اور بشدت و عزم اس کا نفاذ ہے۔ تمام کا تمام تعلیمی نظام نظریۂ حیاتِ ملّی کے گرد گھومتا ہے اور اس حد سے ذرا باہر نہیں جاتا۔ اور چوں کہ نظریۂ حیاتِ ملّی اور فلسفۂ حیات اور اندازِ فکر کا تعلق براہِ راست فکرِ ملّی سے ہے، مگر کسی درجے میں شخصیت سے بھی ہوتا ہے، اس لیے حادثے کے طور پر شخصیت کی پیروی اور پرستش اس کا لازمہ بن جایا کرتی ہے۔ جب نظریۂ حیات مذہبی حدود سے آزاد اور ایمانی قیود سے باہر اور وحدتِ الٰہی سے ماورا ہو تو قلب و ذہن کو ایک مرکز کی تلاش لازماً ہوتی ہے۔ غیر دینی اور غیر مذہبی نظامِ حیات میں یہ مرکز وہ شخصیت ہی ہو جاتی ہے جس کو قیادت کا موقع مل جاتا ہے۔ ایک بار قیادت میسر آ جائے تو پھر شخصیت اپنے مقام کو ہر شعبۂ زندگی میں مرکزی حیثیت دینے کے لیے خواہاں اور مجبور ہو

جاتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو مرکز کی تلاش میں قوم سرگرداں ہو جاتی ہے۔ کوریا میں یہ مرکزی شخصیت کم ال سنگ صاحب کی ہے اور ان کے بغیر نظامِ تعلیم مکمل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے نرسری، پرائمری، سکنڈری اور ہائر ایجوکیشن میں تعلیم کا مرکزی نقطہ شخصیتِ کم ال سنگ ہے اور اس کے بعد نظریۂ حیات ہے اور ان دو بنیادوں پر نرسری اور پرائمری وسکنڈری تعلیم گاہوں میں، میں نے جا کر دیکھا ہے کہ سب سے پہلا سبق کم ال سنگ پر ہوتا ہے اور بچے کم ال سنگ صاحب کے مجسموں یا تصویروں کے سامنے رکوع کرتے ہیں۔ یہ ان کی تعلیم کا آغاز ہے اور نصابِ تعلیم میں، اور کتبِ نصابی میں اولین اسباق شخصیت اور پارٹی پر ہوتے ہیں اور نظریۂ حیات کو اس سے منسلک رکھا جاتا ہے۔ کوریا میں نصابی تعلیم میں رقص و سرود کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ نرسری اور پرائمری میں اور شاید سکنڈری میں بھی رقص کی تربیت اور گانے کی تعلیم لازماً دی جاتی ہے اور تمام کے تمام گانے شخصیت، پارٹی اور نظریۂ حیات پر منحصر ہوتے ہیں۔ اگر نسیم سحر کا ذکر ہے اور باغ و بہار کا بیان ہے تو بھی اس کے خالق کم ال سنگ صاحب ہیں اور اگر زراعت اور صنعت و حرفت میں حیرت انگیز پیش رفت ہوئی ہے تو اس کا کریڈٹ بھی کم ال سنگ صاحب اور پارٹی کو جاتا ہے۔ روٹی، کپڑا، مکان سب کم ال سنگ صاحب نے دیا ہے اور پارٹی کے نظام نے یہ نعمتیں ان کو بخشی ہیں۔ غرض زندگی کا کوئی میدان ہو، کم ال سنگ صاحب اور پارٹی ہی اوّل و آخر ہے اور وہی ظاہر و باطن ہے۔

کوریا میں یہ نظام کوئی نیا تجربہ نہیں ہے۔ اس قسم کے نظام صفحۂ ارض پر گزشتہ صدی کے آخر اور صدیٔ رواں میں رائج ہوئے ہیں اور ظاہر و باطن پر حاکمیت کے باوجود ایسے نظام شدید انقلابات کی نذر بھی ہوئے ہیں۔ چین میں جناب ماؤزتنگ کا آج کوئی مقام نہیں ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ ایسا ان کے مرنے کے بعد ہوا ہے، مگر پھر ایسی شخصیات کی زندگیاں غیر محفوظ رہتی ہیں۔ روس کا صدر ایسی سخت حفاظتوں میں رہتا ہے کہ ان کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ کبھی وہ کسی گھر میں ہوتے ہیں اور کبھی دوسرے گھر میں پناہ گزیں ہوتے ہیں۔ کم ال سنگ کا حال بھی اس سے مختلف نہیں ہے۔

نظریۂ تعلیم کے بارے میں یہ توضیحات ضروری تھیں کہ ان کے بغیر تجربات کا سمجھنا ممکن نہیں۔ نہ اس کا موقع ہے کہ اس کا موازنہ دوسرے نظام ہائے تعلیم سے کیا جائے۔ بتانا صرف اس قدر ہے کہ آزادیٔ وطن کے بعد ۱۹۴۵ء میں کم ال سنگ صاحب نے، جن کی حیثیت جنگ کے ہیرو اور فاتح کی ہے، اور اس سے انکار ممکن نہیں، تعمیرِ وطن کے لیے سب سے پہلے جس راہ کو اختیار کیا وہ نظامِ تعلیم کی استواری تھی۔ ان کی توجّہ سب سے پہلے اس پر گئی کہ مکاتب و مدارس قائم کیے جائیں۔ انھوں نے نہ صرف ابتدائی تعلیم کو بدرجۂ کمال اہمیت دی بلکہ اعلا تعلیم کو بھی نظر انداز نہیں کیا اور باوجودیکہ وسائل محدود تھے اور ذرائع نہ ہونے کے برابر ۱۹۴۶ء میں انھوں نے پیونگ یانگ میں ایک یونیورسٹی کی بنیاد رکھ دی اور اس کی تعمیر پر اپنی جان صرف کر دی اور آج یہ جامعۂ کم ال سنگ کے نام سے دعوتِ فکر دے رہی ہے۔ نرسری، پرائمری، سکنڈری، ہائر ایجوکیشن، غرض ہر سطح پر تعلیم کے تقاضے پورے کر دیے اور جہالت کی تاریکیاں روشنیوں سے بدل ڈالیں۔ اب وہ اس پر بجا طور پر فخر کرتے ہیں کہ شمالی کوریا میں کوئی ایک فرد بھی جاہل نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کل یہ قوم اپنے کم ال سنگ صاحب کو مسترد کر دے مگر اس کی فکر بالغ ہے اور وہ علم و عمل کی روشنی میں دوسری راہ کا صحت کے ساتھ انتخاب کرنے کی اہل ہے۔ یہ تعلیم ہی کا معجزہ ہے کہ ایک فاقہ مست قوم آج بڑی حد تک نہ صرف خود کفیل ہے بلکہ وہ اپنے ذرائع و ذخائر کا بھرپور استعمال کرنے کے بعد دوسرے ممالک کی کفالت بھی کر رہی ہے۔ خود پاکستان کو اس نے سمنٹ دی ہے۔ زراعت و صنعت کے میدان میں وہ خود کفیل ہے۔ ان کے نظامِ زراعت کو پاکستان کے موجودہ وزیرِ زراعت جا کر دیکھ گئے ہیں اور جب انھوں نے پاکستان کے انداز میں کاشتکار سے پوچھا، "اس کھاد کی قیمت تم نے کیا ادا کی ہے؟" تو کاشتکار ان کے سوال پر حیرت میں رہ گیا۔ سوشلسٹ ملک میں کاشتکار بھی حکومت کا ہے، زمین بھی حکومت کی اور کھاد بھی حکومت کی ہے! شمالی کوریا کا کاشتکار زیورِ علم سے آراستہ ہے، وہ کاشتکاری بھی علم و صحت کے ساتھ کرتا ہے، وہ جانتا ہے کہ بنجر زمینوں کا سینہ چیر کر خوراک کیسے اور کیوں پیدا کی جاتی ہے۔ اس کے

برعکس پاکستان کا کاشت کار اس روشنی میں ہنوز نہیں لایا جا سکا ہے۔ ہم اس سے غفلت کے صریحاً مجرم ہیں۔

پاکستان میں ہم کروڑہا روپے منع حمل کی کوششوں پر فکرو نظر کے بغیر خرچ کرتے رہے ہیں، اور گزشتہ دنوں نیویارک کی ایک میٹنگ میں اس کی ناکامی پر مہرِ تصدیق ثبت کی جا چکی ہے، مگر ہم اس قدر غور نہیں کر سکتے کہ ہماری کروڑہا ایکڑ زمین غیر آباد پڑی ہے، ہم اس کو قابلِ کاشت بنا کر اپنے وطن کے بھوکوں کا پیٹ بھر سکتے ہیں۔ اس کی وجہ محض یہ نہیں کہ ہم اپنی خاکِ وطن سے محبت نہیں کرتے اور اپنے انسان سے ہمیں کوئی الفت نہیں ہے بلکہ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم تعلیم سے محروم ہیں اور اپنے مسائل کے فہم کی طاقت سے محروم ہیں اور عاری۔

نظریۂ تعلیم، نظامِ تعلیم اور نصابِ تعلیم ان تینوں کا ہم آہنگ ہونا ضروری ہے، اس کے بغیر تعلیم و تربیت کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ہم نے پاکستان میں اس نکتے کو آج تک نہیں سمجھا ہے حتّٰی کہ ہم اب بھی یہ غور و فیصلہ کرنے کی صلاحیت سے محروم ہیں کہ پاکستان میں انقلابِ اسلامی بدوں انقلابِ تعلیمی کے ہرگز ممکن نہیں ہے۔ کم ال سنگ صاحب نے ان تینوں اجزائے تعلیم کو ہم آہنگ کیا ہے اور بڑی احتیاط و شدت کے ساتھ اس ہم آہنگی کو قائم رکھا ہے۔ ان کا تعلیم کے لیے اندازِ فکر اس حد تک جامع ہے کہ وہ "ایجوکیشن تھرو ریکری ایشن" تک کو زبردست اہمیت دیتے ہیں۔ چلڈرن پیلیس اس کی ایک مثال ہے کہ اس عمارت کے پانچ سو کمروں میں روزانہ دس ہزار بچّے آتے ہیں اور اپنے مزاج و طبیعت کے مطابق شعبوں میں حصہ لینے کے لیے آزاد ہیں۔ اس چلڈرن پیلیس میں تفریح، کھیل کود، تعلیم و تربیت اور صنعت و حرفت کا کون سا شعبہ ہے کہ موجود نہ ہو۔ سارے انڈور گیمز یہاں موجود ہیں۔ سائنسی تجربات کے لیے ہمہ قسم کی لیبوریٹریاں قائم ہیں۔ برقیات کے لیے پورا نظام یہاں حاضر ہے۔ کشیدہ کاری، مصوری، سنگ تراشی وغیرہ کے انتظامات کیے گئے ہیں۔ حتّٰی کہ خراد مشینیں تک تو ہیں، موٹر کاروں کے انجن تک ہیں کہ ان کو سمجھا جائے۔ غرض زندگی کے جس شعبے کا تصور کیا جائے وہ یہاں چلڈرن پیلیس میں موجود ہے۔

جس قوم کو انسانوں سے محبت ہوتی ہے اور اپنے بچوں سے الفت، اور جس قوم کو بلندی کا احترام ہوتا ہے اور سرفرازی کو وہ منتہائے مقصود بناتی ہے وہ تعلیم و تربیت کے لیے ایسے ہی انتظام کرتی ہے۔ مجھے یاد آتا ہے پاکستان کے ایک وزیرِ مذہبی امورحیران تھے کہ افریقہ میں تبلیغِ اسلام کے لیے ان کو پاکستان میں ایک عالم نہیں ملتا کہ وہاں انگریزی زبان میں اسلام کا پیغام پہنچا سکے۔

ہمارے پاکستانی نظامِ تعلیم کی اس سے زیادہ بے بسی کا اور کیا نمونہ ہو سکتا ہے! ہمارا مذہبی طالبِ علم علوم جدیدہ سے بے بہرہ ہے اور علوم جدیدہ کا طالبِ علم دینی مسائل کی الف ب نہیں جانتا ۔ ہم نعرۂ اسلام بلند کرکے اب تک تعلیم کے اس سنگم تک بھی نہیں پہنچ سکے ہیں۔ ان لکھو کھا بچوں کا ذکر چھوڑیے کہ جو تعلیم سے دُور اور حالات حاضرہ سے چُور ہیں۔ اس کے برعکس نظریاتی کوریا میں دیکھیں کہ نظریۂ حیات یعنی سوشلزم کی اشاعت و تبلیغ کے لیے قوم کا ہر فرد تیار ہے! اس فرق پر غور کرنا چاہیے اور نظام ونصاب تعلیم کی ضرورت اور اہمیت کو سمجھنا چاہیے۔

خواتین میدانِ عمل میں

میں نے شمالی کوریا میں مختلف شعبہ ہائے زندگی کا ایک اچٹتا ہوا جائزہ لیا ہے اور میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہاں ملک کی آدھی آبادی ، یعنی عورتوں کو تعمیرِ وطن کی جد وجہد میں بھرپور شریک کیا گیا ہے ، حتیٰ کہ عورتوں کے لیے ملازمت کرنا لازمی قرار دیا گیا ہے تاکہ انقلاب اور تعمیر کی رفتار تیز ہو سکے۔ اس شرکت میں جائز و ناجائز کے تمام پہلو بھی سامنے آتے ہیں۔ احتیاط و نگہداشت کو میں نے نظر انداز پایا ہے۔ مجھے یہ بات پسند نہیں ہے کہ ایک عورت کو اس درجہ مصروف کر دیا جائے کہ وہ اپنی اولاد کو ویکلی نرسری میں پیر کی صبح سے جمعے کی رات تک چھوڑ دے اور اولاد سے دُور خدمات سر انجام دیتی رہے۔ مگر شمالی کوریا کی متعیّن پالیسیوں میں ایک یہ بھی ہے کہ عورتوں کو خانہ داری کے بوجھ اور بچے پالنے کے جھنجھٹ سے نجات دلائی جائے، اور سماجی اقدار اور رسم و رواج کو مدِنظر رکھتے ہوئے ان کے مقام کو بلند کیا جائے۔

مجھے یہ بھی اچھا نہیں لگا کہ عورتیں جھاڑو لیے سڑکوں کو صاف کر رہی ہیں اور اس میدان میں دیکھنے کو ایک مرد نہیں ہے۔ کھیتوں میں سب سے زیادہ عورتیں ہی کام کر رہی ہیں۔ نرسریوں اور کنڈرگارٹن کا تصور اور قیام کا عنوان یہی ہے کہ عورتیں بچوں کی پرورش سے نجات حاصل کر لیں۔ ہم نے دیکھا کہ چونگ سان (مشترکہ کھیت) میں بھی نرسریاں موجود ہیں۔ اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں تمام خدمات عورتیں انجام دے رہی ہیں۔ وہاں ایک مرد نہیں ہے۔

نرسری، پرائمری اور سکنڈری تعلیم تمام و کمال عورتوں کے ہاتھ میں ہے۔ اسی طرح اہم مقامات پر گائڈ عورتیں ہیں۔ ہوٹلوں میں ویٹر اکثر عورتیں ہیں۔ دکانوں پر سیلز گرلز ہیں۔ میرے ساتھ میری گائڈ مسز کوانسل کے دو بچے ہیں، ایک چھ دوسرا دس سال کا، میرے ساتھ یہ دس دن سے صبح و شام ہیں اور رات بھی ان کا قیام وہاں ہی رہتا ہے جہاں میں رہتا ہوں۔ ان کے بچوں کو کون دیکھ رہا ہے؟

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ آدھی قوم ـــ یعنی عورتوں کو بر سر عمل کر کے ملک کی تعمیر کا فریضہ سر انجام دے دیا گیا ہے اور شمالی کوریا میں ۲۷ سال کے مختصر عرصے میں تعمیر کی اس رفتار کو حیرت انگیز اور محیّرالعقول کہنے کے لیے وہاں عورت کے ایثار اور قربانی اور حرکت و عمل کو پورا کریڈٹ دینا چاہیئے۔ میں اس کا مخالف ہوں کہ عورت کو سوسائٹی میں عضوِ معطل کی حیثیت دے دی جائے مگر میں اس میں تحدید اور تربیت کی ضرورت و اہمیت کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ پاکستان میں میں اس کا حامی ہوں اور اس پر اصرار کرتا ہوں کہ یہاں پرائمری اور سکنڈری تعلیم تمام کی تمام خواتین کے حوالے کر دینی چاہیے اور اس میدان میں عورتوں کو کام کرنے کے پورے مواقع فراہم کر دیے جائیں۔ ہمارے ہاں تعلیم یافتہ عورتوں کی بے کاری اور بے روزگاری کا مسئلہ حل کرنے کے لیے اور نظامِ تعلیم کو موثر بنانے کے لیے اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں ہے۔ اسی طرح ملکی صنعتوں میں احتیاط و احترام کی فضا میں خواتین کو خدمات کے مواقع حاصل ہونے چاہییں۔ اس قسم کا اندازِ فکر اس صورت میں جامۂ عمل پہن سکتا ہے کہ جب ہم خود اس باب میں سنجیدہ

ہوں ۔اگر ہم نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ قوم کے لیے تعلیم غیرضروری ہے تو ہم اپنی خواتین کو کہاں برسر عمل کریں گے؟ بد قسمتی سے پاکستان میں بعض موقع شناس حضرات کو ان دنوں ایک ایسی شہرت حاصل ہے کہ جسے سزا کی تعریف میں لایا جا سکتا ہے ۔ٹیلی وژن پر ان کے خطابات کو ہم نے فکر و نظر کی جن کوتاہیوں کے ساتھ اہمیت دی ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ انھوں نے وہ باتیں بھی کہہ ڈالیں جن کا کہنا کسی طرح ضروری اور صحیح نہ تھا ۔ عدمِ توازن نے ان کو اس قسم کے اظہارِ خیال کا موقع دیا کہ وہ ہرعورت کو پوری سختی کے ساتھ گوشہ نشین اور خانہ نشین کر دینے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں ۔دل کہتا ہے کہ اس قسم کی اہم شخصیات کو توازن کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے ۔اس سے ملکی مسائل پیدا ہوتے ہیں ۔ ہمارا ایک سنگین مسئلہ یہ ہے کہ ہمارا نظامِ تعلیم آزادی کے باوجود ہمارے اختیار سے باہر ہے ۔اس میں طاغوتی طاقتوں کا دخل ہے کہ جو پاکستان کو صحت و تعلیم سے محروم رکھنے کے لیے سوچے سمجھے ہوئے منصوبوں اور نظاموں پر عمل کی راہیں ہموار کرتی ہیں ۔ ایک طرف حال یہ ہے اور دوسری طرف خود ہم اپنے دوست نہیں ہیں اور اپنی فکری ناہمواریوں سے اپنے مسائل کو الجھائے جا رہے ہیں ۔ میں یہ یقین کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ کم ال سنگ انسان نہیں ہیں اور یہ کہ وہ باپ ، بھائی ، شوہر نہیں ہیں ۔ وہ سب کچھ ہیں ، مگر ان کا منتہائے مقصود آزادئ وطن ہے ۔وہ جنوبی کوریا کو امریکی پنجۂ آہنی سے نکالنے کے درپے ہیں ۔ ان کی اس عظمتِ فکر کی داد دینی چاہیئے ۔ایسے دور میں کہ بعض اقوام و ملل اپنی آزادیاں کھونے پر مصر ہیں ، اپنے ذرائع و ذخائر کو لات مار کر غیر ملکی امدادوں اور قرضوں پر زندہ رہنے میں ذرا شرم و عار محسوس نہیں کرتیں ،اور اپنی فکری اور سیاسی آزادیاں اپنی عیش کوشیوں کے عوض غیروں کو پیش کرنے کی لعنت میں گرفتار ہیں ۔کم ال سنگ قابلِ قدر ہیں اور لائقِ تحریم و تکریم کہ وہ اپنے وطن کے ہر ذرّے کو آزاد دیکھنے کے آرزومند ہیں اور اس راہ میں وہ بہت کچھ قربان کر دینے کو تیار ہیں ۔

اس وقت شمالی کوریا میں لام بندی ہے۔ وہاں میں نے افواج میں بھرتی کے لیے اعلانات اور ترغیبی اشتہارات چھپتے نہیں دیکھے۔ کوریا میں ہر مرد و عورت خدمتِ وطن سے سرشار اس وقت افواجِ کوریا میں شرکت کر رہا ہے۔ جنوبی کوریا کو پنجۂ استبداد سے آزاد کرانے کے لیے ایک بھرپور جنگ سامنے ہے، اس لیے شمالی کوریا کے ہر مرد کو فوجی ہونا چاہیے۔ اور جو مقام مرد خالی کر دے اسے عورت کو پُر کر دینا چاہیے۔ کوریائے شمالی میں اس وقت یہ عمل شد و مد کے ساتھ جاری ہے۔ اس میدان میں وہاں غیر معمولی صلاحیتوں کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ پاکستان کے ائیر فورس کے وفود نے شمالی کوریا ائیر فورس کی عظمت دیکھ کر شاید سبق سیکھ لیا ہو۔ کس طرح انھوں نے پہاڑوں کی چیر پھاڑ کر کے زیرِ کوہ اپنی فضائیہ کو محفوظ کر دیا ہے۔ تاریخ شاید ہی ایسی کوئی مثال پیش کر سکے۔ شمالی کوریا کے بڑے بڑے پہاڑ افواج کے مراکز بن چکے ہیں۔ میں یقین سے کیسے کہہ سکتا ہوں کہ شمالی کوریا جنوبی کوریا کو آزاد کرانے کا قدم کب اٹھائے گا، مگر جنوبی کوریا میں امریکی پریشانیاں شمالی کوریا کی تیاریوں کی آئینہ دار ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ جنوبی کوریا میں امریکا نے ایٹمی حملے کے لیے پورے انتظامات کر لیے ہیں۔ یہ صورتِ حال خواہ مخواہ نہیں ہے۔ امریکا شمالی کوریا کے حالاتِ تیاریٔ جنگ سے ناواقف نہیں ہو سکتا۔

مارشل کم ال سنگ صاحب کے تدبّر و تعقّل کو سلام کرنا چاہیے کہ وہ شمالی کوریا کی تعمیر میں ذرا کوتاہی نہیں برت رہے ہیں۔ پیونگ یانگ کو دیکھیے تو ایک شہر ہے کہ ہر عظمت سے آراستہ، عمارات دیکھیے تو پُر شکوہ کی ہر تعریف ان پر صادق، تعلیمی مراکز کو دیکھیے تو یقین نہیں آتا کے یہ مدارس کا جال کیسے بچھ گیا۔ صحت کے مراکز کو دیکھیے تو نقشۂ کوریا پر ہر جگہ ان کا نشان موجود ہے۔ صنعت کے میدان میں لائٹ اور ہیوی انڈسٹری دونوں سے مالامال، زراعت میں حال یہ کہ خوراک میں خود کفیل۔ ایک طرف پورے شوق سے یہ تعمیری جدوجہد جاری ہے اور بیک آن لام بندی کا عمل بھی جاری ہے اور جنوبی کوریا کو امریکا کے قبضے سے نکالنے کا عزم پوری طرح جوان ہے۔

اس توازن کے حامل انسان دنیا میں کم پیدا ہوتے ہیں۔

طب مشرقی

طبِ مشرقی (ORIENTAL MEDICINE) کے باب میں حکومتِ کوریا کا ذہن بالکل صاف ہے اور وہاں کوئی اشکال نہیں پایا جاتا۔ صدر کم ال سنگ طب کے موضوع پر واضح ہدایات دیتے رہے ہیں اور گزشتہ ایک سال سے وہ اِس پر اصرار کر رہے ہیں کہ کوریا کی طبِ مشرقی کو سائنس و تحقیقات کے تمام مراحل سے گزار کر اس طب کو مقام بلند دیدیا جائے۔ ان کے زیر ہدایت اِس وقت تمام ہسپتالوں میں اور تمام کلینکوں میں دونوں طبّوں کا نظام ساتھ ساتھ کام کر رہا ہے اور قدیم و جدید میں کوئی اختلاف موجود نہیں ہے۔ پیونگ یانگ میں چار سو بستروں کا ایک بڑا ہسپتال زیر تعمیر ہے، جو کُلیۃً طبِ مشرقی کے لیے ہوگا اور اِس ہسپتال میں ریسرچ کے تمام انتظامات ہوں گے۔ اس وقت بھی ہسپتالوں میں شعبہ ہائے معالجات کے ریکرڈ رکھے جا رہے ہیں۔ میں نے کوریائے شمالی کے وزیرِ صحت سے بڑی تفصیل کے ساتھ طب کے موضوع پر بات کی ہے، ان کا ذہن بھی بالکل صاف ہے اور وہ بڑی شدت سے طبِ مشرقی کے حامی ہیں اور تعمیرِ ہسپتالِ طبِ مشرقی کے وہی نگرانِ اعلا ہیں۔ وزیرِ صحت کوریا خود کوریا کے مانے ہوئے سرجن ہیں۔ وہ وزارتی ذمّہ داریوں کے باوجود اپنے فن کی مہارت جاری رکھتے ہیں اور روزانہ اپریشن کرتے ہیں۔ میں نے ان کو مشورہ دیا ہے کہ جب طبِ مشرقی کا ہسپتال اور مرکزِ تحقیقاتِ طبیّہ مکمل ہو جائے تو اس کے افتتاح کے موقع پر ایک عالمی کانفرنس طبِ مشرقی کی بُلانی چاہیے اور اس میں عالمی ادارۂ صحت کو شریک کرنا چاہیے۔ میرے اس مشورے کو وزیر صحت نے قبول کر لیا ہے۔

میں نے وزیر صحت کوریا کو یہ بھی مشورہ دیا ہے کہ کوریا اور پاکستان کے مابین سائنس اور طبیّہ تحقیقات میں تعاون کرنا مناسب ہے۔ وہ اس کے لیے صدقِ دل سے تیار ہیں۔

میں نے کوریا میں طب کے لیے ذہن کے کسی گوشے میں اگر کوئی اشکال تھا بھی تو وہ صاف کر دیا اور عالمی ادارۂ صحت کی فکر

و پیش رفت کی روشنی میں مثبت اقدامات کے لیے راہیں ہموار کر دی ہیں ۔

میری نمائشی اور بے بس مشاورت اور وزارت کا پاکستان میں تو کوئی فائدہ نہیں ہو رہا ہے مگر اس وزارت کی وجہ سے طب کے لیے مجھے دنیا بھر میں کام کرنے کا جو موقع مل گیا ہے اس کے لیے میں صدر ضیاءالحق صاحب کا شکر گزار ہوں ۔ اگر وزارت کا یہ "تاج" سر پر نہ ہوتا تو کوریا میں پیش رفت ممکن نہ ہوتی ۔ پاکستان میں طبِ مشرق کا وزیر ہونا بجائے خود ایک اہم بات ہے کہ جو ساری دلیلوں پر حاوی ہے !

مگر پاکستان میں عسکری بقراطیت (آرمڈ بیوروکریسی) نے میرے عمل کی راہوں کو بشدت مسدود کر کے میدانِ طب میں ہر پیش رفت کو ناکام بنایا ہے اور صدرِ پاکستان کا یہ مشیر برائے طب بے بس رہا اور یہ بے بسی اہانت و تذلیل کی حدوں کو پار کر گئی، مگر صدرِ پاکستان پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا ۔ نعرۂ طب بلند کر کے ہم نے اپنی کوتاہیوں اور بے عملیوں سے نئے مسائل پیدا کر لیے ہیں اور ان مسائل میں طب میں غیر مستند ، دین میں غیر متوازن اور سوسائٹی میں نامقبول نئے مشیروں نے اضافات کر دیے ہیں ۔ طب کے باب میں اس کوتاہیٔ فکر و عمل کے نقصانات شدید ہوں گے ۔

نظامِ صحت

اس میدان میں میرا جائزہ پیونگ یانگ کی حد تک ہے اور میں یقین کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ یہاں عوام کو طبی سہولتیں بہم پہنچانے میں حکومت انتہائی فیاض و مستعد ہے ۔ پیونگ یانگ میں ہسپتال حسبِ ضرورت موجود ہیں ۔ حال ہی میں جو پیونگ یانگ میٹرنٹی ہسپتال قائم ہوا ہے وہ اس میدان میں حکومت کی فکرِ بلند کا ایک خوب صورت مظہر ہے ۔ پاکستان میں اس قسم کے کسی ہسپتال کا تصور آئندہ کئی سالوں تک نہیں کیا جا سکتا ہے ۔ میں نے کراس ہسپتال دیکھا ہے اور پیونگ یانگ جنرل ہسپتال بھی ۔ ہر جگہ انسانیت کی خدمت کے جذبات کے ساتھ خدمت کا سلسلہ جاری ہے ۔ پھر علاقائی کلینک آبادیوں کے اعتبار سے ہیں ۔ اس

پیونگ یانگ شہر میں کم از کم ایک سو " ری کلینک" موجود ہیں ۔ " عجائب گھر انقلاب" میں طب و صحت کا جو نقشہ دیکھا ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پورے شمالی کوریا میں طب و صحت کے لیے ایسا نظام قائم کر دیا گیا ہے کہ کوئی علاقہ طبی سہولت سے محروم نہیں ہے ۔ میں نے اس نقشے کو غور سے دیکھا ہے اور اپنے کیمرے سے اس کی تصویر بھی لے لی ہے ۔ میرا تاثر یہ ہے کہ صحت و طب کی سہولتیں بہم پہنچانے میں کوریا کو بڑی خصوصیت حاصل ہے ۔ میں نے بچوں کی ایک نرسری دیکھی ہے ۔ وہاں بھی ایک ۲۰ بستروں کا ہسپتال ملحق ہے ۔ میں نے پرائمری اسکول دیکھے ہیں ۔ ہر ایک میں طبی سہولت کے لیے ایک کمرہ لازماً موجود ہے ۔ یونیورسٹی میں طبی سہولت کے لیے بڑا جامع نظام موجود ہے ۔ ہوٹلوں میں بھی طبی خدمات کے لیے سہولتیں فراہم کی گئی ہیں ۔ صنعتی مراکز میں بھی کوئی شخص طبی سہولت سے محروم نہیں رہ سکتا ۔

حفاظتِ صحت بلاشبہ شخصی ذمہ داری ہے اور حکومت تعلیمِ صحت کے ذریعہ سے اس ذمہ داری کا احساس افرادِ قوم کو دلاتی ہے ۔ ہیلتھ لٹریچر کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے اور بالخصوص پوسٹروں سے حفظ صحت کی تعلیم کو اہمیت دی جاتی ہے ۔ کوریا ٹیلی وژن سسٹم بھی اس باب میں ذمہ داری محسوس کرتا ہے اور تعلیم صحت کے لیے اس نظام کو لازماً استعمال کیا جاتا ہے ۔ اسی طرح ریڈیو کا نظام بھی تعلیمِ صحت کا پابند ہے ۔

میرے تاثرات یہ ہیں کہ کوریا کی حکومت عوام کو طبی سہولتیں فراہم کرنے میں بدرجۂ کمال دیانت دار ہے اور چوں کہ عملۂ طب و صحت ایک ایسے نظامِ حکومت اور نظریۂ سیاسی کا تربیت یافتہ ہے کہ جو انسان کے شرف و عزّ کا حامل ہے اس لیے فرائضِ منصبی ادا کرنے اور خلوص و انس کا مظاہرہ کرنے میں ان کا کوئی جواب نہیں ہے ۔ اگر نظامِ تعلیم محبت اور شرف کی بنیادوں پر استوار نہ ہوتا تو صحت و طب کا نظام کیا، ہر نظام ناکام اور ناکارہ ہو جاتا، مگر جس قوم کی گھٹی میں محبتِ وطن اور الفتِ آدم ہے اس کے افراد کا انسانیت کی انتہاؤں پر ہونا لازمی ہے ۔

میں یہ غور کرتا رہا ہوں کہ کوریا کا سوشلسٹ نظام کام یاب ہے تو آخر اسلام کا نظام ہر جگہ کیوں ناکام ہے، جبکہ اسلام کسی درجے میں بھی سوشلسٹ نظام سے کم نہیں ، بلکہ یہ کہنا کسی طرح غلط نہ ہوگا کہ سوشلسٹ نظام نے اسلام سے خوشہ چینی کی ہے - اختصار کے ساتھ اگر بات کی جائے تو لازماً یہ کہنا ہوگا کہ وہ ممالک کہ جہاں مسلمان برسرِاقتدار ہیں اور جہاں اسلامیین کی حکومت ہے وہاں قیادت دیانت دار نہیں ہے - اول تو اکثر حالات میں قیادت کو اسلام اور اصول اسلام پر ایمان و یقین باقی نہیں رہا ہے اور ان کی فکر پریشان اور ان کے اعمال منتشر ہو چکے ہیں - اس بات کو اس انداز سے بھی کہا جا سکتا ہے کہ دنیائے اسلام میں تقریباً ہر جگہ قیادت خود حدودِ اسلام سے گریزاں ہے اور خود کو نظامِ اسلام کی قیود سے آزاد رکھنا چاہتی ہے اس لیے شعائرِ اسلامی زیرِ عمل نہیں آ رہے ہیں اور اس طرح نظامِ اسلام ناکام ہو رہا ہے - میں پاکستان کو بطور مثال پیش کروں گا ، کیونکہ یہ میرا وطن ہے اور میں یہاں کے بارے میں یقین کے ساتھ جانتا ہوں -

پاکستان میں از ابتدا جو بھی قیادت قائم ہوئی ہے اس نے نعرۂ اسلام لگایا ہے اور کہا ہے کہ پاکستان میں اصولِ زندگی اور طرزِ حیات اور اندازِ حکومت اسلام کے مطابق ہوگا ، مگر اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیے کہ کوئی واحد قیادت ایسی نہیں ہے کہ جو اس پر عامل رہی ہو - خود حکمرانوں کا حال پاکستان میں یہ رہا ہے کہ وہ نفاذِ شریعتِ اسلامی میں قطعی دیانت دار نہیں تھے اور دیانت دار اس لیے نہیں تھے کہ وہ خود اصول و ضوابطِ اسلامی کے پابند نہیں تھے اور نہ پابندی قبول کرنے کو تیار تھے - یہی وجہ ہے کہ کسی ایک حکومت نے پاکستان کے نظامِ تعلیم کو تقاضائے اسلامی سے ہم آہنگ کرنے کی کوئی دیانت دارانہ کوشش نہیں کی بلکہ ہمارا نظامِ تعلیم ابتر ہوتے ہوتے بالآخر اب نصابِ تعلیم تک محدود ہو گیا ہے اور یہ نصاب شعائرِ اسلامی کا کوئی تقاضا پورا نہیں کرتا -

پاکستان کی موجودہ ضیاء الحق قیادت پر یہ الزام عائد نہیں کیا جا سکتا کہ وہ نفاذِ شریعتِ اسلامی میں غیر مخلص ہے - مگر اس پر یقیناً کلام کیا جا سکتا ہے کہ ان کا طرزِ حکومت اور ان کا طرزِ عمل

ان کو منزلِ مقصود تک پہنچا سکے گا یا وہ غلط فیصلوں کی وجہ سے منزل سے ہمیشہ دور رہیں گے - میری رائے یہ ہے کہ اس میدان میں اس سے بڑی کوتاہی دوسری کوئی نہیں ہو سکتی کہ نفاذِ شریعتِ اسلامی کا دعوا کر کے اس کے مطالب کی فہمِ کامل کا انتظام نہ کیا جائے اور عمل کے لیے راہوں کا تعین کرنے میں کوتاہی کی جائے۔ پاکستان کی موجودہ قیادت اپنے خلوصِ عمل اور فکرِ صحیح کے باوجود صراطِ مستقیم کا تعین کرنے میں ناکام نظر آتی ہے - کوتاہیٔ فکر و عمل کی ایک مثال اس طرح دی جا سکتی ہے کہ تقریباً پانچ سال تک حکومت پر بلا شرکتِ غیرے پورا کنٹرول رکھنے کے باوجود موجودہ قیادتِ پاکستان نظام تعلیم کو اقتضائے شریعتِ اسلامی سے ہم آہنگ نہیں کر سکی ہے -بلکہ میں تو اس حد تک جانے کو تیار ہوں کہ قیادتِ موجودہ نے اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی ہے - ہئیتِ حاکمہ بذاتِ خود اس کی اہل نہیں ہے ، یعنی عسکری فکر کی جو معراج ہے نظامِ تعلیم کا مرتبہ اس سے بلند تر ہے ، بلکہ الزام اس طرح عائد کیا جائے گا کہ ہئیت حاکمہ کو پاکستان کے ہر شعبۂ زندگی پر اقتدار کامل حاصل ہے اور اس دائرۂ اقتدار میں یہ بھی ہے کہ وہ پاکستان کے صاحبانِ فکر و نظر کو نظامِ تعلیم کا مسئلہ سونپ دے اور اس کی رائے کو قابلِ عمل قرار دیدے -بلا شبہ اس انداز کی اب تک کوئی کوشش نہیں ہوئی ہے -وزارتِ تعلیم جن ہاتھوں میں ہے ان کی علمی دیانت اور خلوص شبہے سے بالاتر نہیں ہے -

نظامِ تعلیم کو اقتضائے شریعتِ اسلامی سے ہم آہنگ کرنا اور تقاضائے ملّی کی فہم و فراست پیدا کرنا قیادت اور ہئیت حاکمہ کی اولین ذمہ داری ہے اور یہ ذمہ داری اُس وقت شدید تر ہو جاتی ہے کہ جب ہئیتِ حاکمہ کا وجود ہی نفاذِ شریعتِ اسلامی سے عبارت ہے - اس حقیقت سے بھلا کیسے انکار کیا جا سکتا ہے کہ تعلیم ہی وہ بنیاد ہے کہ جس پر شریعتِ اسلامی کی عمارت تعمیر ہو سکتی ہے - اس بنیاد کے بغیر عمارت کیسے قائم رہ سکتی ہے ؟ تعلیم کی اصلاح کے بغیر پاکستان میں شریعتِ اسلامی کا نفاذ و عمل ناقابل تصور ہے - اگر اس حقیقت کو تسلیم کر لیا جائے ، اور تسلیم کیوں نہ کیا جائے ، تو بات یہاں آ کر ختم ہوگی کہ یا تو ہئیتِ حاکمہ فکرِ سلیم سے عاری ہے اور صحتِ عمل سے محروم ، یا یہ کہ وہ نفاذ شریعت اسلامی میں دیانت دار نہیں ہے -

کوریا میں صدر کم ال سنگ صاحب پر متعدد الزامات عائد کیے جا سکتے ہیں اور سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ وہ اللہ کی کرسی پر خود کو بٹھانے کے لیے کوشاں ہیں، مگر ان پر یہ الزام عائد نہیں کیا جا سکتا کہ وہ سوشلسٹ تعلیم کے کسی بھی مطالبے کے خود پابند نہیں ہیں۔ وہ کوریا کے آہنی مرد ہیں اور گریٹ لیڈر بھی، اور اس حیثیت سے ان پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں اور جو ذمہ داریاں ان پر لازم ہوتی ہیں ان پر کم ال سنگ پورے اترتے ہیں۔ وہ تمام فرائض ادا کر رہے ہیں اور ہر ذمہ داری پوری کر رہے ہیں۔

سوشلسٹ نظام پر ہم تنقید کر سکتے ہیں اور اگر مولویانہ انداز اختیار کیا جائے تو یہ نظام لاحول ولاقوۃ ہے، مگر ہمارے درد کی دوا فقط یہ نہیں ہے۔ میں یہ رائے رکھتا ہوں کہ اگر اسلام پر عمل کیا جاتا تو اس کے علاوہ دوسرا کوئی نظریہ عالم وجود میں آ ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ کمیونزم اور سوشلزم نظریات عالم وجود میں آئے ہی اس لیے ہیں کہ تمام زمانۂ ماضی میں دنیائے اسلام میں کوئی ایک حکومت دائرۂ اسلام میں نہیں رہی ہے۔ خود پاکستان کو دیکھنا چاہیے کہ اس کا کون سا عمل دائرۂ اسلام میں ہے؟ ہم نعرۂ اسلام بلند کرتے ہیں، مگر آج بھی ہمارے اکثر و بیشتر اعمال حدودِ شریعتِ اسلامی سے خارج ہیں۔ کوڑوں کی سزائیں، شرعی عدالتوں کا قیام، نظامِ زکواۃ کا نفاذ وغیرہ اقدامات بلاشبہ اس کا عنوان رکھتے ہیں، مگر کیا صرف اس سے یہ اطمینان کیا جا سکتا ہے کہ پاکستان میں واقعی شریعت اسلامی نافذ ہو گئی؟ اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو اس سے بڑا سراب دوسرا کوئی نہیں ہو سکتا۔

کوریا میں نظامِ طب و صحت سوشلسٹ نظام کے تحت جاری ہو رہے ہیں اور ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس نظام کے تحت کوریا کے ہر شخص کو بلا معاوضہ اور بلا تکلف اور بلا رکاوٹ طبی سہولت حاصل ہو رہی ہے۔ اس کے برعکس مثال کے طور پر پاکستان میں دیہات کے ۸۰ فیصد انسان ابتدائی طبی سہولت سے بھی یکسو محروم ہیں، کوریا میں طبِ مشرقی اور طبِ مغربی دونوں رائج ہیں اور سوشلسٹ حکومت پوری دیانت داری کے ساتھ ان دونوں طبوں سے استفادۂ کامل کر رہی ہے اور طب مشرقی کی ترقی کا وعدہ کر کے اسے پوری

اکملیت کے ساتھ پورا کر رہی ہے۔اس کے برعکس پاکستان میں طب اسلامی کا نعرہ تو بلند ہو گیا ، ایک وزیر بھی بنا دیا گیا ، مگر عمل کی حالت یہ ہے کہ اس طب کے لیے حکومت کے فنڈ میں ایک پیسہ بھی نہیں ہے اور "اسلامی حکومت" نے اپنا کوئی وعدہ پورا نہیں کیا ہے !

اب غور کرنے کا انداز یہ ہوگا کہ ان دونوں نظاموں میں کون سا نظام اپنے عمل میں دیانت دار ہے !

اخلاقیات

ایک سچّے سوشلسٹ نظامِ حکومت میں یہ تو ممکن نہیں ہے کہ کوئی ایک فرد بھی چوری کرے اوراس قسم کا کوئی کام کر سکے کہ جو معاشرے میں انتشار پیدا کرے۔چوری ، ڈاکے ، اغوا ، نظریۂ سوشلزم کے خلاف حرکات وغیرہ کے مجرم سوشلسٹ نظامِ حکومت میں زندہ نہیں رہ سکتے۔ان کی سزا صرف موت ہو سکتی ہے۔مجھے معلوم نہیں ہو سکا کہ زنا و اغلام وغیرہ جرائم کی کوریا میں کیا صورت ہے ، مگر میں یہ جانتا ہوں کہ ایسی حرکات کی سزا بھی سخت اور سزائے موت کے مترادف ہے۔ دی جاتی ہے یا نہیں ، میں اس کی تحقیق نہیں کر سکا ہوں ۔ مگر میں اس کی گواہی دے سکتا ہوں کہ میں نے کوریائے شمالی میں رہ کر جو طرزِ زندگی دیکھا ہے وہ اس قسم کے اخلاقی زوال سے مبرّا لگتا ہے ۔ یہاں جنسی ترغیبات اگر ہیں تو ان کا اظہار میں نے نہیں دیکھا ہے۔مرد اور عورت شانہ بہ شانہ کام کرتے ہیں۔انسان کی حیثیت سے ان کے جذباتِ برانگیختہ ایک ایسے نظام حکومت میں رہتے ہیں کہ ان کو خلاملا کے باوجود اظہارِ ترغیباتِ جنسی کی جرات نہیں ہو سکتی۔کیا کوئی طرزِ حکومت اس سے زیادہ اور کچھ کر سکتا ہے ! میں امریکا اور مغرب کے بارے میں جانتا ہوں کہ وہاں کے قوانین عورت مرد کے اختلاط اور جنسی ملاپ کو ان کا حق قرار دیتے ہیں اور حقوقِ انسانی کی تعریف ان پر صادق کر کے ان کو کھلی آزادی دیتے ہیں ۔ برطانیہ اس معاملے میں کئی قدم آگے ہے ۔وہاں اغلام جائز اور روا ہے۔قانون کی زد سے یہ بد اخلاقی باہر ہے۔

سوشلسٹ نظام اس قسم کی آوارگیٔ فکر و نظر کا قطعی حامی نہیں اور اسلام تو اس باب میں نہایت واضح احکامات رکھتا ہے اور جنسی جرائم کا ارتکاب شریعتِ اسلامی میں سخت ترین سزا کا مستوجب ہے - مگر ہم کو عمل کا حال دیکھنا ہوگا - کوریا میں میں نے یہ دیکھا ہے کہ جنسی جرائم بر سر عام کا کوئی تصور موجود نہیں ہے - جہاں تک قوانین کا تعلق ہے زنا و اغلام اس نظامِ حکومت میں نا روا ہیں اور وہاں ان کی سزائیں سخت ہیں اور بلا امتیاز دی جاتی ہوں گی اور یہ سزا موت تک ہوسکتی ہے - اس کے برعکس اسلام کی داعی حکومتوں میں کیا ہو رہا ہے اور وہاں کے افراد اپنے ممالک میں نیز دوسرے ممالک میں کیا کر رہے ہیں ؟ ہم پاکستان سے موازنہ کریں گے کہ نفاذِ شریعتِ اسلامی کا یہاں غلغلہ بلند ہے - میں کیا لکھوں ، ذرا اپنے اخبارات اٹھا کر دیکھ لیجیے - ہمارے اخبارات ہماری اخلاقیات کے آئینہ دار ہیں - ہماری درس گاہوں میں جنسی بداخلاقیوں کی داستانیں کسے معلوم نہیں ہیں ؟

ہماری عدالتوں کے مقدّمات اس کے شاہد ہیں کہ ہم ان جرائم میں بہ حیثیت قوم کس طرح ملوث ہیں - اس قسم کے موازنے کا منشا سوشلسٹ نظام کی خوبیاں بتانا نہیں ہے اور نہ یہ بتانا مقصود ہے کہ اسلام کا مقام کیا ہے - واضح یہ کرنا ہے کہ عمل اور بے عملی میں کیا فرق ہے - نظریہ کا قیام اپنی جگہ اہم مگر نظریہ پر عمل پیرا ہونا بالکل مختلف ہے - اسلام میں لاکھ اچھائیاں ، مگر ان اچھائیوں پر اگر عمل نہ ہوا تو اس کا مفاد آخر کیا ؟ سوشلسٹ نظام پر اور کمیونسٹ نظام پر سب سے بڑا اعتراض اہلِ اسلام کو یہی تو ہے نا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے وجود کا منکر ہے اور رسول اللہؐ کا انکار کرتا ہے - بلا شبہ یہ اعتراض وزنی ہے ، میں اس کو تسلیم کرتا ہوں اور میں اس اصول کو بھی دل و جان سے قبول کرتا ہوں کہ وہ معاشرہ اور وہ ملک ، کہ جہاں نظامِ اسلامی ہو وہاں سوشلزم یا کمیونزم کے پرچار پر قدغن ہونا چاہیے اور اسے آزادی حاصل نہیں ہونی چاہیے - میرے اس قبول میں میرے ذاتی رجحانات بھی اثر انداز ہیں مگر اس سے زیادہ اس میں علمائے حق کی آواز کا احترام بھی ہے ، ورنہ اصولی بات یہ ہے کہ اگر اسلام اس قدر قوی اور پختہ مذہب ہے تو اسے

کسی دوسرے نظرئیے سے خوف کی کیا وجہ ہے ؟ حقیقت الامر یہ ہے کہ علما خود جانتے ہیں کہ ہم اسلام پر عمل نہیں کر رہے ہیں اور اسلام سے ہمارا یہ فرار یقیناً دوسرے نظریات کے لیے گنجائش پیدا کرتا ہے۔اور ایسا ہی ہو رہا ہے۔وہ لوگ کہ دعوائے اسلام رکھتے ہیں ان کی بے عملیوں کا حال معلوم - پاکستان میں ہم علمائ حق کو شدومد کے ساتھ نظریاتِ غیر کے رد کے لیے متحرک دیکھتے ہیں مگر بالکل اسی شدت کے ساتھ وہ حقائقِ اسلامی کے احیا کے لیے متحد نہیں ہیں - خود ان کا منتشرالفکر ہونا ہی ضعفِ اسلام کا سبب ہے اور یہ وہی ضعف ہے کہ جس نے اسلامیئین کو دوسری طرف نگاہ کرنے کے لیے تیار کیا ہے اور آمادہ۔

کوریا کے بارے میں اخلاقیات پر اتنی بات کہنے کے بعد میں ذاتی اخلاق کی بات کرنی چاہتا ہوں - میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ دوسری بہت سی اقوام کے مقابلے میں جن میں کمیونسٹ اور سوشلسٹ ممالک بھی شریک ہیں ان کے مزاج میں نرمی و حلم زیادہ ہے۔ ان کا ذاتی برتاؤ اور سلوک مقابلۃً بہتر ہے - گفت گو میں نرمی ہے ، آواز میں بلندی نہیں ہے - میں نے دس گیارہ دن میں کسی ایک شخص کو اکڑ کر چلتے نہیں دیکھا - لڑائی دنگے کا کوئی منظر نہیں دیکھا - شہر کے در و دیوار صاف ستھرے ہیں - درس گاہوں میں دیواروں پر کوئلے سے کوئی لکھائی نہیں ہے - صفائی ان کا مزاج ہے - میں نے کوئی جگہ ایسی نہیں دیکھی کہ جہاں گندگی ہو حتیٰ کہ میں نے ہسپتالوں اور درس گاہوں میں بیت الخلاؤں کو بھی جا کر دیکھا ہے اور صاف پایا ہے ، ذاتی صفائی کا بھی خیال رکھا جاتا ہے - ہر چند کہ وہ اپنی غذا میں ہر چیز کھاجاتے ہیں ، کتّے ، بلیاں بھی کہ یہ ان کو مرغوب ہیں ، سور ان کی غذا میں شامل ہے ، شراب سے پرہیز نہیں کرتے بلکہ دھڑلے سے پیتے ہیں ، حرام و حلال کا کوئی تصور ان کے ہاں نہیں ہے - ان غلاظتوں اور آلودگیوں کے باوجود ان کا کردار ایک عام مسلمان سے بہر حال بہتر ہے ! لاحول ولا قوہ۔

وزیرِ صحت سے دوسری ملاقات

وزیرِ صحت شمالی کوریا سے دو ملاقاتیں ہوئیں: ایک " مرکزِ ثقافت برائے مہمانانِ غیر ملکی " میں کہ جب انھوں نے میرے لیے عشائیہ کا انتظام کیا تھا ، اور دوسری ملاقات پیونگ یانگ کے ہوائی میدان پر کہ جب وہ از راہِ کرم مجھے خدا حافظ کہنے کے لیے آئے تھے - میں ان سے دونوں بار تبادلِ خیال کا خلاصہ درج ذیل کرتا ہوں :

- یہ بہت اچھا ہوا کہ آپ کے کوریا آ جانے سے پاکستان اور کوریا کے مابین طبی تعلقات کی بنیاد پڑ گئی ہے - یقین ہے کہ اس میدان میں ہم ایک دوسرے سے تعاون کریں گے اور ایک دوسرے کی مدد کریں گے -

- یہ بات قابلِ اطمینان رہی کہ آپ نے پیونگ یانگ کے مراکزِ صحت دیکھ لیے اور آپ نے ہسپتال بھی دیکھ لیے کہ جہاں طبِ مشرقی اور طبِ مغربی دونوں پوری اہمیت کے ساتھ مصروفِ خدمت ہیں

- صدر کم ال سنگ کی نہایت بلیغ اور واضح ہدایت ہے کہ طبِ مشرقی کو سائنس کا عنوان دیا جائے اور اس کے لیے تمام جدید سہولتیں فراہم کی جائیں - آپ نے اس کا مظاہرہ خود ہسپتالوں میں دیکھا ہوگا - اب ہم چار سو بیڈ کا ایک ہسپتال صرف طبِ مشرقی کے لیے قائم کر رہے ہیں جہاں اس طب کے مسلّمات اور نظریات وغیرہ پر تحقیقاتی مراکز بھی ہوں گے - یہ ہسپتال ایک سال کے اندر اندر قائم ہو جائے گا -

- اس رائے پر اتفاق ہوا ہے کہ طبِ مشرقی کے معالجات اور طبِ مشرقی و طبِ مغربی کے مشترک معالجات پر جو ریکرڈ تیار ہوں اُن کو انگریزی زبان میں شائع کیا جائے گا تاکہ کوریا سے باہر استفادہ کی صورت پیدا ہو سکے -

- طبِ مشرقی کے ہسپتال کے افتتاح کے موقع پر طبِ مشرقی پر ایک عالمی کنگرس کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا ہے جس کے لیے عالمی ادارۂ صحت کا تعاون درکار ہوگا ، یعنی اس کی شرکت کو مناسب خیال کیا گیا ہے -

- پاکستان اور کوریا کے مابین طبی وفود کا تبادلہ نتیجہ خیز ہو سکتا ہے۔ اس پر توجہ کرنی چاہیئے۔
- وزیرِ صحت کوریا نے پاکستان آنے کی دعوت قبول کر لی ہے۔ سفیرِ پاکستان اس ذیل میں ضروری انتظامات کریں گے۔
- پیونگ یانگ جنرل ہسپتال میں دوائے یرقان (اکٹرین) پر تجربات کیے جائیں گے۔ دوا پاکستان سے بھجوائی جائے گی۔ نیز پاکستان میں طب مشرقی کی جو ادویہ تیار ہوتی ہیں ان کے نمونے بھجوائے جائیں گے۔

" سر زمینِ خدائے بزرگ و برتر، مملکت مردانِ حریّت پرور، و ملکِ زنانِ عظیم تر، و بچگان خوش تر، کم ال سنگ کا وطن نصف کہ جو جاپان کے زیرِ نگیں رہا اور امریکی بمباریوں کا ہدف بنا رہا اور تاراج ہوا مگر آج وہاں آزادی کا سورج طلوع ہو چکا ہے، اور ہر مرد و زن حریتِ کامل اور اتحادِ سر زمینِ کوریا کے لیے زمزمہ پیرا ہے۔

شمالی کوریا کہ جہاں استبداد و استعمار نے تباہی مچادی اور اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی، مارشل کم ال سنگ کی قیادتِ بےداغ نے آج اسے تعمیر و ترقی کا وہ رنگ روپ دیا ہے کہ عقل حیران ہوتی ہے اور انگشت بدنداں۔"

میں بالخصوص اس جذبۂ ایثار و ہمدردی اور وطن دوستی سے متاثر ہوا ہوں کہ جو یہاں کے لوگوں کی روح و تن میں جاری و ساری ملتا ہے۔ لگتا ہے دنیا بھر کے لوگوں کے لیے ان کے دلوں میں ایک روحانی سرمایہ موجزن ہے۔

میرا ذہن اسلام کے ماضی کی طرف چلا گیا کہ جب ملّت کی مائیں اولوالعزم تھیں بہادر بچے پیدا ہوتے رہے۔ ممالک میں فتح و نصرت کے جھنڈے انھوں نے گاڑ دیے۔ پھر اب ایک ایسا وقت آیا کہ ماؤں نے ایسے مجاہدین کے بجائے کہ جو داڑھیاں دانتوں تلے دبا کر اور اللہ اکبر کہہ کر دشمن کی صفوں میں گھس جایا کرتے تھے، اب ایسے آرام طلب نوجوانوں کو جنم دیا ہے کہ جنھیں

آسائشیں میدانِ محاربہ سے دل کش معلوم ہو رہی ہیں اور جو اپنی فکری اور سیاسی آزادیوں سے لاپروا ہو چکے ہیں۔ میرا اندازِ فکر یہ ہے کہ آزادی ایمان کی شرطِ اولین ہے۔

مجھے ننّھے بچوں سے الفت و انس ہے۔ کوریا میں میں نے دیکھا کہ بچے نہایت شائستہ اور خندہ رُو ہیں۔ ان بچوں کا نشوونما جس انداز سے ہو رہا ہے اور ان کی تعلیم و تربیت جس طور ہو رہی ہے کہا جا سکتا ہے کہ وہ تعمیرِ وطن کے جذبات سے سرشار ہو کر بڑے ہوں گے، پھر میں نے معاً اپنے وطن کے بچوں کے حالِ زار پر غور کرنا شروع کردیا کہ میرے عزیز وطن کے بچوں کی اکثریت تعلیم و تربیت سے محروم رکھی جا رہی ہے، اور حیرت ہے کہ ہم ایسے شدید حالات پر شاکر ہیں اور ذرا غور نہیں کرتے کہ یہ اصولِ ترقی کی راہ میں سدِّ سکندری اور اقوام و امم کے لیے سکرات موت کا حکم رکھتا ہے۔

شمالی کوریا کو ارض العلم کے طور پر بھی شہرت حاصل ہے۔ کیوں کہ یہاں کا ہر فرد پڑھتا اور بس پڑھتا ہے۔ تعلیم میں ابتدائی اہمیت اس انقلابی نظریہ کو حاصل ہے جس کا مرکز آدمی کی ذات ہے۔ ہم بھی ایک نظریۂ حیاتِ ملّی رکھتے ہیں مگر اس کی عملی دشواریوں کی سہار اور برداشت کی ہم میں اب ہمت نہیں رہی ہے۔ ہم درحقیقت ایسے حالات میں ہیں کہ جہاں لوگ وعظوں کے شیدائی ہیں جن میں جنت کے حسین نظاروں والی دنیا کی بادشاہت کا فقط ایک تسبیح سے حاصل ہو جانے کا یقین دلایا جاتا ہے۔ جہل ایسے صوفی موجود ہیں کہ جو رات کے ذکر کی قیمت ایسی عمر جاوداں بتاتے ہیں کہ جس میں ہر دن دیدارِ خدا ہوگا۔ ہم ایسے شدید حالات سے گزر رہے ہیں کہ جہاں ہم اس میں یقین کرنے لگے ہیں کہ فقط نعروں سے اسلام کا بول بالا ہو جائے گا۔ حالات کس قدر دل فگار ہیں کہ حفظِ آزادی اور خودی و عرفانِ ذات کے لیے ایک شعلہ بار زبان موجود نہیں ہے کہ جو قلوب میں آگ لگا دے! ہم نے اپنے نظریۂ حیاتِ ملّی کو اپنی بے عملیوں سے پارہ پارہ کیا ہے اور ایک دن غور نہیں کیا کہ لفظوں میں کوئی جاذبیت نہیں ہوتی اور عمل میں جادو ہوا کرتا ہے۔

عوامی جمہوریہ کوریا میں آزادی کے بعد ٹیکسوں کا نظام کالعدم کر دیا گیا تھا ، اب وہاں عوام کو کسی قسم کا کوئی بھی ٹیکس نہیں دینا پڑتا - اور نہ وہاں بے روزگاری ہے - طبی علاج مفت ہے ، تعلیم مفت ہے - روٹی ، کپڑا اور مکان کوئی مسئلہ نہیں ہے - ملک عوام کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کی فراہمی کو اولیت دیتا ہے - لہٰذا یہاں کے عوام مضبوط و تنومند اور فطری طور پر ہشاش بشاش رہتے ہیں - وہ فراوانی اور شائستگی کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں - ہر فرد کا ہفتے میں ایک دن مطالعہ ، ایک دن لیکچر ، ایک دن محنت کا مقرر ہے - جمعہ کے روز یہ لوگ جسمانی مشقت میں مصروف رہتے ہیں -

یہاں ذرائع ابلاغ زندگی آمیز کردار ادا کرتے ہیں - ان میں "روڈنگ سن من" ، "منجوچوسون" ، "پیونگ یانگ سن من" اور دیگر مرکزی اور مقامی روزنامے شامل ہیں - ان کے ساتھ ساتھ مخصوص اخبارات و ماہانہ رسائل مثلاً "کلّوجا" ، "روڈونگ جا" اور "من ہاک لیسول" بھی شائع ہوتے ہیں - ریڈیو اور ٹیلے وژن بھی ہیں - علاوہ ازیں تعلیم اور تفریح کی سہولتیں جیسے کہ لائبریریاں ، عجائب گھر ، تھیٹر ، سینما ، بازی گری کے تھیٹر اور ریسٹ ہوم وسیع پیمانے پر موجود ہیں -

سالانہ چودہ سے اٹھائیس یوم کی باتنخواہ رخصت یقینی طور پر ہر ایک کو ملتی ہے اور خاص خاص اضافی چھٹیاں بھی دی جاتی ہیں - کوئی بھی فرد جب دل چاہے اپنا چھٹی کا حق استعمال کر سکتا ہے - اور اگر اس چھٹی سے اس کے کام کا حرج نہ ہوتا ہو تو بلاتاخیر رخصت مل جاتی ہے - آدمی بیمار پڑ جائے تو مکمل طور پر صحت یاب ہونے تک چھٹی اور طبی علاج کا حق دیا جاتا ہے -

شمالی کوریا کا لیبر قانون اس کے نظریۂ حیات سے ہم آہنگ ہے اور اس کے برعکس پاکستان میں لیبر لاز کلیۃً روح اسلامی کے خلاف ہیں ، اور ہمارے "اسلامی اقدامات" کی ریل پیل میں ان کی اصلاح کی مہلت ہنوز ہمیں نہیں ملی ہے - ہم یہ جاننے کے باوجود کہ پاکستان میں ان غیر شرعی قوانین کی وجہ سے صریحاً انسانی مسائل درپیش ہیں اور معاشی و معاشرتی نیز اقتصادی و صنعتی عدم توازن

جاری و ساری ہے، اب تک اصلاح حال میں دیانت داری کا مظاہرہ کرنے کی جرأت سے محروم ہیں ۔

گلیاں روشن رہتی ہیں۔ گھریلو استعمال کا سامان ، لباس اور خوراک سادہ ہیں۔ غرض یہ کہ لوگ تعیش کی زندگی نہیں گزارتے اور کسی بات سے محروم بھی نہیں رہتے ۔ اہم مسائل پوری توجہ سے حل کیے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی عمریں لمبی ہوتی ہیں۔ ۱۹۷۶ء میں ان کی مجموعی اوسط عمر ۷۳ سال تک پہنچ چکی تھی۔

جمہوریہ میں توانا زندہ دلی سے چھلانگیں لگا کر ترقی کے مدارج طے کیے جا رہے ہیں۔ میں محنت کشوں کی اس جاں توڑ جہد مسلسل سے بے حد متاثر ہوا جو وہ دوسرے سات سالہ منصوبے کی تکمیل کو یقینی بنانے کے لیے کر رہے تھے۔ کام کی اس لگن اور دُھن میں یہ یقین و اعتماد شامل تھا کہ وہ یہ تعمیر اپنے ہی لیے کر رہے ہیں اور اس کا فائدہ وہ خود اٹھائیں گے ۔

لوگ جہاں بھی اور جو بھی کام کریں اس میں دیانت داری ، پُر اعتمادی اور خلوص کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ وہ کبھی مطمئن ہو کر قناعت نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ ہر وقت کھلے ذہن سے کچھ نہ کچھ سیکھنے کی دُھن میں لگے رہتے ہیں ۔

اخلاقیاتِ نبوی

مرتبہ: حکیم محمد سعید

۱۴۰۲ ہجری میں کراچی میں ہمدرد فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام سیرتِ نبوی پر ایک قومی کانفرنس (مذاکرۂ مِلّی اخلاقیاتِ نبوی) منعقد ہوئی تھی۔ اس کانفرنس میں پورے ملک سے شریک ہونے والے ممتاز علما، ماہرینِ قانون، ادبا اور اہلِ قلم نے اپنے مقالات میں تمدن و معاشرت، تعلیم و تربیت، اخلاقی اصلاح، عدل و انصاف، معاش و معاشی نظام، سرمایہ و محنت کے روابط، امن و جنگ اور زندگی کے مختلف میدانوں میں حضورؐ کی اخلاقی تعلیمات پر اپنے وسیع مطالعے کی روشنی میں موجودہ حالات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے بحث کی ہے ۔ ان جامع اور بیش بہا مقالات کو حکیم محمد سعید نے کتابی شکل میں مرتّب کر کے سیرت نبویؐ پر ایک نایاب و نادر مجموعے کی حیثیت دے دی ہے۔

۳۵۲ صفحات ——— قیمت -/۲۵ روپے

خُودی

مُرتّبہ: حکیم محمد سعید

ہمدرد فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والی دوسری قومی سیرت کانفرنس (مذاکرۂ مِلّی تعلیمات نبوی) منعقدہ لاہور میں خُودی کو موضوع فکر بنایا گیا۔ اس کانفرنس میں پاکستان کے اہلِ علم و دانش، ماہرینِ تعلیم، ماہرینِ قانون، علما اور ادبا نے عرفانِ نفس اور عرفانِ حق کے حوالے سے سیرتِ نبویؐ کی روشنی میں حالاتِ حاضرہ اور مسائلِ مِلّی کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ اس کتاب کے تمام مقالات ملک کے منتخب اور چیدہ اصحابِ علم و فکر کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں۔ یہ کتاب حکیم محمد سعید نے بڑے سلیقے سے مرتّب کی ہے۔

۲۵۲ صفحات ——— قیمت -/۲۰ روپے

ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، ہمدرد سنٹر، ناظم آباد۔ کراچی ۱۸

ہمدرد فاؤنڈیشن پریس